

بہنوں کا آئینہ نامہ

فروری 2019

شعاع

Core to Fun

<http://www.coretofun.net>



میری زندگی ہے تو، شاین بٹ 200



یار دل دار،
سینوں،
چپکے ہیلی،
دستک،
علم سے عمل تک،



غزل،
غزل،
نظم،
غزل،

پہلی شمع،
حمز،
نعت،
نئی کی باتیں،



بندھن،
دستک،
جب تجھ سے نہ آیا،
جب تجھ سے نہ آیا،
شعاع کے ساتھ،



شہرِ تنہا،
شہرِ زاد،



طوافِ عشق،
وہ اک شخص،

خط آپ کے،
مسکراہٹیں،
ایک نئے خانے میں،
بالوں سے خوشبو لوانے،
کھٹا کسی پیہ،

فروری 2019
جلد 33 نمبر 6
قیمت 70 روپے

قرآن مجید کی تفسیر
پاکستان (ملاحات) 700 روپے
انڈیا، افریقہ، یورپ 6000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا 7000 روپے
subscriptions@khawateendigest.com

انتباہ: ماہنامہ شعاع 15 نمبر کے جملہ حقوق محفوظ ہیں۔ دہائی شری غری اجازت کے بغیر اس رسالے کی کسی بھی کہانی،
ناول، یا سلسلہ کو کسی بھی انداز سے نہ شائع کیا جاسکتا ہے، نہ کسی بھی ذریعہ پر ڈراما، ڈرامائی تشکیل اور سلسلہ ارتقا کے
طور پر یا کسی بھی شکل میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ خلاف ورزی کرنے کی صورت میں قانونی کارروائی میں لائی جاسکتی ہے۔

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ شعاع، 37 - اردو بازار، کراچی۔
رصدیہ جیل فوٹو حسن پریشانگ پر سے کھینچ کر شائع کیا۔
Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 0092-21-32766872
Email: shuaa@khawateendigest.com website: www.khawateendigest.com

سمجھ میں نہیں آ رہا، کیا کہیں، وہ الفاظ کہاں سے ناول جو دکھ ادا کر کے اس کیفیت کو بیان کر سکیں جس سے اس وقت ہر احساس دل گز رہا ہے۔
ان معصوم بچوں کی تصویریں نظروں کے سامنے سے ہٹتی ہی نہیں۔ مسکتے کی حالت میں خاموشی بھی معصوم بچپن کی خوشی خوشی گہرے شادی میں جانے کے لیے نکلی تھی، ان کی آنکھوں کے سامنے ان کے والدین کو خون میں نہلا دیا گیا۔ جو شاید بھی بڑی طرح سے بھی نہیں سمجھ سکتیں کہ ان پر کیا قیامت گزر چکی ہے۔ ان کے سر سے ماں باپ کا سایہ چھین لیا گیا ہے۔ یہ بچے ابھی زندگی کا چہرہ بھی نہیں دیکھ پائے تھے کہ انہیں موت سے روٹنا س کر دیا گیا۔
ظلم و بربریت کا یہ مظاہرہ جو ان کی آنکھوں کے سامنے کیا گیا، وقت گزرتے پر جب وہ اسے سہو پائیں گے تو ان کی ذہنی کیفیت کیا ہوگی۔ ان کی یہ خاموشی بہت سے سوال گزری ہے۔ اس کا جواب کون دے گا؟
بنا کسی کرم کے، بنا کسی تقدیر کے بار ادا کر دیت کی بند سلا دیے گئے۔ اگر یہ قصہ ہمارے ہی ہے تو کیا اسی منزل کے متعلق ہے۔ پھر جو سال بڑی اور وہ ان کا کیا قصور تھا؟ کیا اس معاملے میں اور طریقے سے نہیں سنا یا سکتا تھا۔ ہم اپنے ہی ملک میں کس قدر غفلت اور بے امن ہیں، کیا باوجود اتنا ہی اذیت ہے کہ اپنے ہی ملک میں جیسے چاہے جھٹ کرے کا اختیار رکھ کر مار دیا جائے۔

دکھ سے زیادہ بے بسی کا احساس ہے جو دل کی دگوں کو کاٹ رہا ہے۔
ان بچوں پر جو گری ہے، وہ اسے زندگی بھر نہیں بھول پائیں گے۔ ہم ان کے والدین کو دلائیں نہیں لاسکتے لیکن انہیں وہ غفلت اور سادہ دماغی سے بچنے والی بچوں کے زخموں کا مرہم بن سکتے ہیں۔
ملوثی آڑھان کے جو منافع اب تک سامنے آئے ہیں، وہ ان کی بے بسی کے منظر ہیں، کیا ہماری ریاست ان بچوں کے لیے کچھ کر پائے گی؟

نغمہ ناز کا ناول - شہر تمنا

نغمہ ناز کا شمار ان مصنفین میں ہوتا ہے جو ہر اسے ارد گرد موجود زندگی کی کہانیاں کہتے ہیں۔ یہ ادب بات ہے کہ ان کی مادہ میں کہاں کہیں زندگی کا ہر گوشہ اور شعور نظر آتا ہے۔ کردار نگاری اور گہرا مشاہدہ ان کی تحریروں کی نمایاں خصوصیت ہے خصوصیت کردار نگاری میں انہیں کمال حاصل ہے۔ وہ گویا الفاظ میں تصویر کشی کر دکھ دیتی ہیں۔ اس پر باخدا وہ زبان، کوئی بھی موزن ہو، رواں ادب یا محاورہ زبان کا استعمال ان کی تحریروں کو دلچسپ اور غیر معمولی بنا دیتا ہے اور یہی ان کی انفرادیت ہے۔

اب تک انہوں نے جو کچھ لکھا ہے، جاری قارئین نے پسند کیا ہے۔ اس ماہ سے ان کا سلسلہ ناول "شہر تمنا" شروع کر رہے ہیں۔ ہمیں توقع ہے کہ ان کی دیگر تحریروں کی طرح یہ ناول بھی قارئین کو پسند آئے گا۔ ناول کی قطعہ بڑھ کر اس کے بارے میں اپنی رائے ضرور کہیں۔

اسٹس شمارے میں،

- چر میرا ایک کامل ناول - طواف عشق، مریم عزیز کا مکمل ناول - وہ اک شخص،
- چر مشائیں بٹ کا ناول - صادق اکرم نغمہ ناز کے ناول،
- چر افشین فطیم، حمیرا فطیم، منشا حسن علی، تمیزہ فرمان اور شازبہ الطاف کے افسانے،
- چر آپ کی لیلکہ، مسند قدس، بلال کا بندھن، معروف شخصیات سے گفتگو کا سلسلہ - دستک،
- چر جب تجھے نہانا چاہتا ہے - قارئین کے تجربات، چارے نئی نئی لکھی ہوئی چارے بائیں اور دیگر متنیں ملنے والی ہیں،
- شعاع کا یہ شمارہ آپ کو کیا لگا؟ ہمیں خط لکھنا، مجھے لگے گا۔

مقدود ہمیں کب تیرے وصفوں کے دم کا جہاں سے گنبد خضر ادکھائی دیتا ہے
حقا کہ خداوند ہے تو لوح و قلم کا وہاں سے آنکھ کو کیا کیا دکھائی دیتا ہے

اس مسد عزت پر کہ تو جلوہ نما ہے خدا بھی اس کا عجب اور انبیاء بھی تمام
کیا تاب گزر ہووے تعقل کے قدم کا وہ اک رسول جو یکتا دکھائی دیتا ہے

بستے ہیں ترے سایہ میں سب شیخ و برہمن ہے برقرار توازن جو دین و دنیا میں
آباد تجھی سے تو ہے گھر ویر و حرم کا یہ راستہ تو نبی کا دکھائی دیتا ہے

ہے خوف اگر جی میں تو ہے تیرے غضب کا نہ پوچھ خواہش دیدار مصطفیٰ کا صلہ
اور دل میں بھر دیا ہے تو ہے تیرے کرم کا ہر ایک سمت اقبال دکھائی دیتا ہے

مانند جناب آنکھ تو لے درد کھلی تھی نبی کا ذکر کرو دوست کو کہ مدت سے
کینچناتہ پراس بحر میں عرصہ کوئی دم کا جہان دل میں اندھیرا دکھائی دیتا ہے

رحمان خاور

میر درد



چالیس سال پہلے

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
حضرت آدم اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی آپس میں بحث ہو گئی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا۔
”اے آدم! آپ ہمارے والد ہیں، آپ نے ہمیں محرومی کا شکار کر دیا اور گناہ کا ارتکاب کر کے ہمیں جنت سے نکلوا دیا۔“

آدم علیہ السلام نے ان سے فرمایا۔ ”اے موسیٰ! اللہ نے آپ کو شرف ہم کلامی کے لیے منتخب فرمایا اور آپ کو اپنے ہاتھ سے لکھ کر تورات دی، کیا آپ مجھے اس بات پر ملامت کرتے ہیں جو اللہ نے مجھے پیدا کرنے سے چالیس سال پہلے میری قسمت میں لکھ دی تھی؟“

چنانچہ بحث میں آدم علیہ السلام موسیٰ علیہ السلام پر غالب آ گئے۔ ”آدم موسیٰ پر غالب آ گئے، آدم علیہ السلام موسیٰ علیہ السلام پر غالب آ گئے۔“ (تین مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔)

(بخاری)

فوائد و مسائل:

(1) حضرت آدم اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی یہ ملاقات، ممکن ہے جنت میں ہو، ممکن ہے عالم ارواح میں۔ واللہ اعلم۔

(2) حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مقصد حضرت آدم علیہ السلام کو یہ طعنہ دینا تھا کہ انہوں نے غلطی کیوں کی کیونکہ وہ غلطی تو اللہ تعالیٰ نے صحاف فرمادی

تھی۔ ارشاد باری ہے۔

”پھر انہیں ان کے رب نے نواز، ان کی توبہ قبول فرمائی اور ان کی رہنمائی کی۔“ ان کا مقصد یہ تھا کہ آپ کی وجہ سے تمام انسانوں کو دنیا کی مشکلات و مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ حضرت آدم علیہ السلام نے اس کے جواب میں وضاحت فرمادی کہ یہ مصائب تو پہلے ہی تقدیر میں لکھے جا چکے تھے اور ان کا فیصلہ بہت پہلے ہو چکا تھا۔

(3) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین بار فرمایا۔ ”آدم علیہ السلام غالب آ گئے۔“ یہ تکرار تاکید کے لیے تھی تاکہ بخوبی علم ہو جائے کہ آدم علیہ السلام سے جو کچھ ہوا، وہ تقدیر الہی اور مشیت الہی کا اجر تھا۔

تقدیر پر بحث کرنا

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا۔
”قریش کے مشرک تقدیر کے مسئلہ میں بحث کرنے کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے، تو یہ آیت نازل ہوئی۔“

ترجمہ:

”جس دن انہیں چہروں کے بل آگ میں گھسیٹا جائے گا (اور ان سے کہا جائے گا) تم دوزخ کی آگ لگنے کا حزا چکھو۔ بے شک ہم نے ہر چیز ایک انداز سے کے مطابق پیدا کی ہے۔ اقرر۔“

فوائد و مسائل:

(1) اس آیت اور حدیث سے بھی تقدیر کا ثبوت ملتا ہے۔
(2) کفار کے لیے جہنم کا سخت عذاب مقدر ہے۔
(3) واضح اور قطعی مسئلے میں اختلاف اور بحث کرنا اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں۔

تقدیر پر بحث

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا۔

ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم باہر صحابہ کے پاس تشریف لائے تو وہ تقدیر کے بارے میں بحث کر رہے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ مبارک غصے سے اس قدر سرخ ہو گیا، گویا اس پر انار کے دانے پھڑ دیے گئے ہیں۔ (جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”کیا تمہیں اس بات کا حکم دیا گیا ہے؟ یا کیا تمہیں اس کام کے لیے پیدا کیا گیا ہے؟ تم قرآن کی آیات کو ایک دوسرے سے ٹکرا رہے ہو۔ تم سے پہلی امتیں اسی وجہ سے تباہ ہوئی تھیں۔“ (مسند احمد)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔
”مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی مجلس سے غیر حاضر رہنے پر خوشی نہیں ہوئی جس طرح اس مجلس میں موجود نہ ہونے پر خوشی ہوئی۔“

فوائد و مسائل:

(1) تقدیر اسرار الہی میں سے ایک راز ہے، اس پر مجمل ایمان لانا کافی ہے، اسی طرح دوسرے غیبی امور کے بارے میں بھی جس قدر بتا دیا گیا، اسے مان لینا کافی ہے اور جس چیز کی وضاحت نہیں کی گئی، اس کی تفصیل معلوم کرنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔

(2) قرآن و حدیث کی تفصیل کی وضاحت اس انداز سے کرنی چاہیے کہ ان میں ٹکراؤ پیدا نہ ہو، ورنہ امت میں اختلاف و افتراق پیدا ہوتا ہے اور قرآن و حدیث پر ایمان میں فرق آنے کا اندیشہ ہے۔

(3) قرآن و حدیث کے مطالعہ کا اصل مقصد اخلاق و عمل کی اصلاح ہے۔ اگر کوئی شخص محض زور خطابت

کے اظہار کے لیے یا اپنے علم و فضل کا رعب بھانے کے لیے پیچیدہ مسائل میں مشغول ہوتا ہے، تو یہ اصل مقصد کے خلاف اور اللہ تعالیٰ کی ناراضی کا باعث ہے۔
(4) نصیحت کرتے ہوئے موقع محل کی مناسبت سے بعض اوقات غصے کا اظہار بھی کیا جاسکتا ہے، خصوصاً جب کہ نصیحت کرنے والا قابل احترام شخصیت کا حامل اور سامعین پر اس کے غصے کا منفی اثر پڑنے کا اندیشہ ہو۔

(5) حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ اس مجلس میں موجود نہیں تھے۔ کئی دوسرے صحابی نے انہیں یہ واقعہ بتایا، تاہم محدثین کے اصول کے مطابق یہ حدیث ”صحیح“ ہے کیونکہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیث براہ راست سننے والے صحابی کا نام نہ لیا جائے لیکن اس سے سن کر روایت کرنے والا بھی صحابی ہوا تو ایسی حدیث بالا اتفاق صحیح ہوتی ہے کیونکہ تمام صحابہ ”عادل“ (قابل قبول اور قابل اعتماد) ہیں۔

(6) صحابی کو اس مجلس سے غیر حاضری پر اس لیے خوش ہوئی کہ حاضرین پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے غلطی کا اظہار فرمایا تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ مومن کو اگر غلطی کی توفیق مل جائے یا وہ کسی گناہ سے بچ جائے تو اس پر خوشی کا اظہار کرنا فخر و دریا میں شامل نہیں بلکہ تنگی سے محبت اور گناہ سے نفرت کی علامت ہے جو ایمان کا ایک حصہ ہے۔

بدشگونگی

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
”بیماری ایک سے دوسرے کو نہیں لگتی، بدشگونگی کی کوئی حقیقت نہیں، نہ الو کوئی چیز ہے۔“

ایک اعرابی اٹھ کر آپ کے قریب آیا اور کہا۔
”اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! دیکھئے نا، ایک اونٹ کو خارش کی بیماری ہوئی ہے، وہ تمام اونٹوں کو خارش میں مبتلا کر دیتا ہے۔“

تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
”یہ تقدیر ہے، پہلے اونٹ کو خارش کس سے لگی؟“

نوائید مسائل :

(1) عام طور پر تصور کیا جاتا ہے کہ اگر کسی بیمار کے پاس کوئی تندرست آدمی اٹھتا بیٹھتا ہے یا اس کے ساتھ ٹکھاتا بیٹھا ہے یا اس کا لباس استعمال کرتا ہے تو اسے بھی وہی بیماری لگ جاتی ہے جو مریض کو تھی۔ عرف عام میں ایسی بیماریوں کو متعدی بیماریاں کہا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بیماری اس طرح ایک سے دوسرے کو نہیں لگتی، البتہ ایسا ہو سکتا ہے کہ جس وجہ سے پہلے آدمی کے جسم میں مرض پیدا ہوا ہے، وہی وجہ کسی اور شخص میں بھی پائی جائے اور وہ بھی بیمار ہو جائے۔ جدید طب میں جراثیم کا نظریہ بہت مقبول ہے لیکن یہ جراثیم بھی جراثیم الہی اثر انداز ہوتے ہیں، گویا دوسرے مریض کے بیمار ہونے کی اصل وجہ حکم باری تعالیٰ ہے نہ کہ مریض کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا۔ اس کے علاوہ ہومیوپیتھک نظریہ علاج جراثیم کو امراض کا سبب ہی تسلیم نہیں کرتا، اس لیے اس نظریے کے مطابق بھی مرض کا ایک شخص سے دوسرے کو منتقل ہونا ایک غلط تصور ہے۔

(2) عرب لوگ پرعدوں اور جنگلی جانوروں کے گزرنے سے شگون لیتے تھے۔ کوئی شخص کوئی کام کرنا چاہتا تو کسی پیٹھے ہوئے پرندے یا پران و غیرہ کو چھ پرانہ بھگتا، اگر وہ دائیں جانب جاتا تو سمجھا جاتا کہ کام سچ ہو جائے گا، اگر بائیں طرف جاتا تو سمجھا جاتا کہ کام بانی نہیں ہوگی۔ اس طرح کے کام محض توہم مرتی کا مظہر ہیں، جن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ آج کل بھی اس طرح کے توہمات پائے جاتے ہیں، مثلاً کسی لکڑے یا ایک چشم انسان سے ملاقات ہو جائے تو اسے خواست کا باعث قرار دینا۔ کالی ملی راستہ کاٹ جائے تو سمجھنا کہ کام نہیں ہوگا یا کسی خاص عدد (مثلاً حیرہ کا عدد) یا کسی خاص دن (مثلاً منگل) یا کسی خاص مہینہ (مثلاً ماہ صفر) کو نامبارک قرار دینا بھی اسی میں شامل ہے۔ کوئی شخص بنا کر اس کے خانوں میں انگلی رکھنا یا اس قسم کے فال ناموں سے قسمت معلوم کرنے کی کوشش کرنا سب ایمان کی کمزوری کی علامت ہے۔

(3) مشرکین عرب میں ایک غلط تصور یہ بھی پایا جاتا تھا کہ اگر مقتول کا بدلہ لیا جائے تو اس کی روح کوئی شکل اختیار کر کے مطلق اور جنتی پھرتی ہے اور انتقام کا مطالبہ کرتی ہے۔ اس غلط تصور کی وجہ سے ان لوگوں میں نسل در نسل انتقام اور قتل و غارت کا سلسلہ جاری رہتا تھا، حالانکہ اس کی کوئی حقیقت نہیں تھی، اسی طرح الو کو موش تصور کرنا غلط ہے۔ وہ بھی دوسری مخلوقات کی طرح اللہ کی ایک مخلوق ہے جس کا انسانوں کی قسمت سے کوئی تعلق نہیں۔

دل کی مثال

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”دل کی مثال ایک پر کی سی ہے جسے ہوا میں چھیل میدان میں الٹائی پلٹائی رہتی ہیں۔“

نوائید مسائل :

(1) پرندے کا اکھڑا ہوا ایک پر بہت ہلکی چیز ہوتا ہے جسے معمولی ہوا بھی سیدھے سے الٹا اور اٹلے سے سیدھا کر سکتی ہے۔ اگر وہ کسی کھلے میدان میں ہو تو ظاہر سے ہوا اس پر زیادہ اثر انداز ہوگی کیونکہ وہاں ہوا کے اثر کو کم کرنے والی کوئی رکاوٹ نہیں ہوگی۔ اور وہ بڑی تیزی سے الٹ پلٹ ہوتا ادھر سے ادھر اور یہاں سے وہاں اڑتا پھرے گا، انسان کے دل کی بھی یہی حالت ہے۔ اس پر مختلف جذبات و احساسات تیزی سے اثر انداز ہوتے ہیں جس کی وجہ سے وہ بھی تنگی کی طرف مائل ہوتا ہے بھی گناہ کی طرف، بھی اس میں محبت کے لطیف جذبات موجزن ہوتے ہیں، بھی نفرت کی آندھی چڑھ آتی ہے۔ دل کی اس کیفیت سے فائدہ اٹھا کر شیطان اسے گناہوں میں ملوث کر دیتا ہے، لہذا کسی کو تنگی کی راہ پر گامزن دیکھ کر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ ضرور جنت میں جائے گا اور نہ کسی کو گناہوں میں غرق دیکھ کر یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ لازماً جہنمی ہے، اس لیے تنگی کی توفیق ملے تو اللہ سے استقامت کی دعا کرنی چاہیے اور گناہ ہو جائے تو اشک عداوت کا نذرانہ لے کر اللہ تعالیٰ

کے سامنے حاضر ہو جانا چاہیے ایسا نہ ہو کہ گناہوں کی آندھی اسے رحمت سے بہت دور لے جائے۔

(2) چونکہ دل کی کیفیات کسی بھی لمحے تبدیل ہو سکتی ہیں، اس لیے انسان اپنے انجام کے بارے میں مطمئن نہیں ہو سکتا۔ ضروری ہے کہ ایمان پر وفات کی دعا کی جائے اور ہر قدم پر اللہ تعالیٰ سے ہدایت و رہنمائی کی درخواست کی جائے جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یوں دعا کرتے تھے۔

”اے دلوں کو پھیرنے والے! میرا دل اپنی اطاعت و فرماں برداری پر ثابت رکھ۔“

عمر میں اضافہ

حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”صرف تنگی ہی عمر میں اضافے کا باعث ہوتی ہے اور تقدیر کو محض دعا ہی ناسخ ہے، بلاشبہ انسان کو بعض اوقات ایک گناہ کے ارتکاب کی وجہ سے رزق سے محروم کر دیا جاتا ہے۔“

نوائید مسائل :

(1) یہ روایت بعض محققین کے نزدیک حسن درجے کی ہے جو البتہ اس حدیث کا آخری حصہ ”انسان اپنے برے عمل کی وجہ سے رزق سے محروم ہو جاتا ہے۔“ کسی معتبر سند سے ثابت نہیں بلکہ شیخ البانی رحمۃ اللہ اس کی بابت لکھتے ہیں کہ یہ موزوں ہے۔

(2) تنگی کا ثواب جس طرح آخرت میں بلندی و درجات اور ابدی نعمتوں کا باعث ہوتا ہے، اسی طرح تنگی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ دنیا میں بھی نعمت، عزت اور مزید تنگی کی توفیق سے نوازتا ہے، اسی طرح برے عمل کی سزا دینا اور آخرت دونوں میں ملتی ہے، الا یہ کہ اللہ تعالیٰ معاف فرماوے۔

(3) عمر میں اضافے کے مختلف مفہوم بیان کیے گئے

ہیں۔ (1) یعنی عمر میں برکت ہوتی ہے اور وہ اتنے کاموں میں صرف ہوتی اور ضائع ہونے سے بچ جاتی ہے۔ (ب) تنگیوں کی توفیق ملتی ہے جس کی وجہ سے مرنے کے بعد بھی ثواب پہنچتا رہتا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ ”باقی رہنے والی نیکیاں تیرے رب کے ہاں ثواب کے لحاظ سے بہتر ہیں اور امید کے اعتبار سے اچھی ہیں۔“

(ج) فرشتوں کو یا ملک الموت کو اس کی جو عمر معلوم تھی، اس میں اضافہ کر دیا جاتا ہے۔ یہ فرشتوں کے لحاظ سے اضافہ ہے، اللہ تعالیٰ کو پہلے سے علم تھا کہ یہ شخص فلاں تنگی کرے گا جس کے انجام کے طور پر اس کی عمر میں اس قدر اضافہ کر دیا جائے گا۔

تقدیر بدلنے کا مطلب یہ ہے کہ جس مصیبت سے انسان ڈرتا ہے، دعا کی برکت سے رک جاتی ہے اور آئی ہوئی مصیبت دفع ہو جاتی ہے۔ جس طرح حضرت یونس علیہ السلام کو دعا کی وجہ سے مچھلی کے پیٹ سے نجات مل گئی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

”اگر وہ (اللہ کی) پاکیزگی بیان کرنے والوں میں سے نہ ہو جاتے، تو لوگوں کے اٹھائے جانے کے دن تک اس (مچھلی) کے پیٹ ہی میں رہتے۔“

الفصل 143-144

(4) یہاں بھی یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ تبدیلی فرشتوں کے علم کے مطابق تبدیلی ہے، اللہ کے علم میں تبدیلی نہیں۔ اللہ تعالیٰ کو پہلے سے علم تھا کہ فلاں شخص دعا کرے گا، پھر اس کی مشکل حل ہو جائے گی۔

(5) اس میں دعا کی ترغیب پائی جاتی ہے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دعا بھی جائز اسباب میں سے ہے جسے اختیار کرنا توکل کے منافی نہیں بلکہ عین توکل ہے۔

عمل

حضرت سراقہ بن جشم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے فرمایا: میں نے عرض کیا۔

”اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! کیا عمل ان امور میں شامل ہے جنہیں لکھ کر قلم خشک ہو گیا اور اس کے بارے میں تقدیر کا فیصلہ ہو چکا یا اس کا مطلق

آئندہ (فیصلہ ہونے والے معاملات) سے ہے۔“
 آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
 ”بلکہ وہ ان امور میں شامل ہے جن کو کھڑے کر قلم
 خشک ہو گیا اور اس کا اندازہ ہو چکا اور ہر ایک کے لیے وہ
 کام آسان ہو جاتا ہے جس کے لیے وہ پیدا کیا گیا۔“
 فائدہ:

انسان کے نیک اور بد ہونے کا تعلق بھی
 تقدیر سے ہے لیکن بندے کو اس کا علم نہیں۔ وہ
 شریعت کے مطابق عمل کرنے کا مکلف ہے۔

مومن

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے،
 رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
 ”مومن ہمیشہ اپنے دین کے بارے میں
 کشادگی میں رہتا ہے جب تک وہ حرام خون (بہانے
 کا ارتکاب) نہ کرے۔“

(بخاری)

فائدہ:

اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ مومن جب تک کسی کا
 ناحق خون نہیں بہاتا، اسے دین پر عمل کرنے کی توفیق ملتی رہتی
 ہے اور دوسرا مفہوم ہے کہ اللہ کی رحمت اس کے لیے کشادہ رہتی
 ہے، آل (انجام) دونوں کا ایک ہی ہے کہ وہ اللہ کی رحمت کا
 زیادہ مستحق اور امیدوار ہوتا ہے اور جو اس کی وہ عمل ناحق کا
 ارتکاب کرتا ہے تو اللہ کی رحمت کی امید کا دروازہ اس پر بند ہو
 جاتا ہے اور وہ اناامیدوں میں سے ہو جاتا ہے۔

نا جائز لینا

حضرت خولہ بنت اخیاریہ رضی اللہ عنہا
 سے روایت ہے اور یہ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہما کی
 اہلیہ ہیں، وہ فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ
 علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا۔
 ”بلاشبہ کچھ لوگ اللہ کے مال (بیت المال)
 میں ناجائز تصرف کرتے ہیں۔ چنانچہ ایسے لوگوں کے

لیے قیامت والے دن جہنم کی آگ ہے۔“
 (بخاری)

فائدہ:

قوی خزانے میں ناجائز تصرف اور اسے مصارع
 عامہ کے بجائے مصارع خاصہ کے لیے استعمال کرنا
 کبیرہ گناہ ہے جس پر اسے جہنم کی سزا ہو سکتی ہے، اگر
 اس نے مرنے سے قبل خالص توبہ نہ کی۔

نہید کا غلبہ

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے،
 رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
 ”جب تم میں سے کوئی شخص رات کو (عبادت
 کے لیے) کھڑا ہو اور قرآن کا پڑھنا (غلبہ نہید کی وجہ
 سے) اس کی زبان پر مشکل ہو رہا ہو اور اس کو کوئی علم
 نہ ہو کہ وہ کیا کہہ رہا ہے تو اسے چاہیے کہ وہ لیٹ
 جائے (تھوڑی دیر سولے)۔“ (مسلم)
 فائدہ: نماز کے لیے چونکہ حضور قلب اور خشوع
 فصوص نہایت ضروری ہے، اس لیے نماز ایسی حالت
 میں پڑھنی چاہیے جب انسان تازہ دم ہو، اس کے
 اندر سستی اور تھکاوٹ نہ ہو۔ اسی لیے مذکورہ دونوں
 حدیثوں میں غلبہ نہید کے وقت نماز پڑھنے سے روک
 دیا گیا ہے کیونکہ ایسی حالت میں بارگاہ الہی میں
 عجز و نیاز کا صحیح اظہار نہیں ہو سکتا جو نماز کی اصل روح
 ہے۔

بنابر ایسی حالت میں انسان کو سو کر پہلے اپنی
 نہید پوری کر لینی چاہیے کیونکہ اس کے بعد ہی اسے
 قرآن پڑھنے، دعا و مناجات اور توبہ و استغفار کرنے
 اور نماز پڑھنے میں حرا آئے گا۔



بندہ

دشمن بکلال ہمارا بکلال اکبر

شاہین رشید

ہے؟“

یہ جو ہماری مصنفین ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں
 خصوصی صلاحیتوں سے نوازا ہے۔ انہیں اپنی تحریروں
 سے قارئین کے دلوں میں جگہ بنانا۔ ان کی اصلاح
 کرنا، مسائل کو خوبی سے حل کرنے کا طریقہ آتتا ہے۔
 درجن بھی ایک ایسی ہی نگہداری ہیں، جو ہم سب کی
 پسندیدہ ہیں۔ اپنی تحریروں سے تمام مسائل کو خوب
 صورتی کے ساتھ حل کرنے والی ہماری یہ راکشز اصل
 زندگی میں اپنے ”بندھن“ کیسے بھاتی ہیں۔ یہ جاننے
 کے لیے ہم ان کے انٹرویوز کرتے رہتے ہیں اس بار
 ہمارا انتخاب ”دشمن بکلال“ ہیں۔

”کیا حال ہیں؟ زندگی کیسی گزر رہی ہے؟“
 ”الحمد للہ..... بہترین گزر رہی ہے۔“

”چلو تو شروع کرتے ہیں باتیں..... پہلے اپنا
 فیملی بیک گراؤنڈ بتاؤ؟“

”میری امی کا تعلق راجپوت بھٹی فیملی سے ہے
 اور سوتلی کے شہر گجرات سے ان کا تعلق تھا۔ امی کے
 انتقال کو دس سال ہو گئے۔ ابو حیات ہیں، خدا انہیں
 لمبی عمر دے۔ (آمین) ابو کا تعلق سیالکوٹ سے
 ہے..... امی کے سارے میکے کے لوگ آرمی اور نیوی
 میں ہیں جیسے میجر عزیز بھٹی شہید، بشیر شہید اور راحیل
 شریف ہمارے قریبی بھائی رشتے دار ہیں۔ میرے
 والد بٹ کشمیری فیملی سے تعلق رکھتے ہیں۔ امی کی
 شادی برادری سے باہر ہوئی۔ میں 21 مئی کو سرگودھا
 میں پیدا ہوئی۔ ہم دو بھائی اور پانچ بھائی ہیں۔ میرا
 نمبر پانچواں ہے۔ چار بھائی شادی شدہ ہیں اور ملک
 سے باہر ہیں۔ ایک بھائی کی ابھی شادی نہیں ہوئی وہ
 سب سے چھوٹا ہے۔“

”آپ کی شادی کو کتنا عرصہ ہو گیا ہے اور

”میری شادی 12 دسمبر 2009ء میں اپنے
 کزن بلال پراچہ کے ساتھ ہوئی۔ یہ میرے پھوپھی
 کے بیٹے ہیں اور میری پھوپھی ہمارے خاندان کی وہ
 پہلی خاتون ہیں جن کی برادری سے باہر شادی ہوئی۔
 ہم کشمیری بٹ ہیں اور ہمارے یہاں خاندان سے
 باہر شادی کرنے کا رواج نہیں ہے۔ بلال بہت ہی
 اچھے اور سیکھے ہوئے انسان ہیں اور میں ان کی بہت
 عزت کرتی ہوں میں ان کی چٹنی بھی تعریف کر دوں کم
 ہے۔ بہت پڑھے لکھے اور باشعور انسان ہیں اور مجھے
 بہت عزت دیتے ہیں۔ میری بیٹی آٹھ سال کی ہے۔
 دوسری تین سال کی ہے۔ میرے میاں صاحب
 تقریباً پانچ چھ سال ملک سے باہر رہے اب یہاں
 پاکستان میں جا رہے ہیں۔“

”شادی دھوم دھام سے ہوئی تھی؟ تیاری خود
 کی؟“
 ”جی..... شادی بہت دھوم دھام سے ہوئی
 تھی۔ میری شادی سے پہلے میری امی کا انتقال ہو چکا
 تھا۔ مگر میرے بھائیوں نے میرے بہت خرچے
 اٹھائے اور بہت چاہت کے ساتھ میری شادی کی۔
 ان کی بچی خواہش تھی کہ ”شمن“ کی شادی میں کوئی کمی
 اور کسر نہ رہے۔ میری ساری تیاری میری بھابی نے
 کی۔ البتہ شادی کا جوڑا، دیگر کپڑے اور جوتے اپنی
 پسند سے خریدے تھے۔ سسرال والوں کے ساتھ مل کر
 شاپنگ نہیں کی۔ میری بھابی چونکہ میری پسند سے
 واقف تھیں لہذا کوئی مسئلہ نہیں ہوا۔“
 ”شوہر کے لیے جو تصور تھا آپ کا، پورا ہوا؟“
 ”شادی سے پہلے ہر لڑکی کا خواب ہوتا ہے کہ

سلطان محمد فاتح

ملت اسلامیہ کے لازوال کردار ”سلطان محمد فاتح“ کے کارہائے نمایاں کی سبق آموز داستان محترمہ شاہدہ لطیف کی سلسلہ وار کہانی تاریخ کے جہرہ کے۔

خونی ہاتھ

سیاست ایک جنگل کے دستور کا نام ہے جس میں ہر چیز بد وقت ضرورت کا زور ہوتی ہے

ایم الیاس کی سیاسی داؤد کی منہ بولتی تصویر

حرمائے الفت

انسان جو بدلتا ہے اسے ویسی ہی فصل کاٹی پڑتی ہے جاوید راہی کا صحت آموز انداز

تقدیر کا ستم

دام میں پھانسنے والوں کی بے دم سازشوں کا قصہ مسلمان راحت کا دلکش انداز بیان

ضمیر کی جنگ

ایک عورت کی سنگ دلی اور خود غرضی کا دلخراش واقعہ سیدہ عطیہ زاہرہ کے قلم سے

ایس کے مایہ نوس بدیس کی روایتیں، سنیسن اور تجسین سب پیرور 9 مشہور و معروف مسندین کی طبع دار و ترجمہ کھانیاں

فروری 2019 کا شمار آج ہی فروری

”عروسی جوڑا کتنا قیمتی تھا..... ہزاروں میں لایا یا لاکھوں میں لایا تھا؟“

”عروسی جوڑا کافی اچھا اور کاہنہ تھا تو سال پہلے کے حساب سے تھا، بھاری بھی تھا..... لاکھوں کا تو نہیں مگر ہزاروں میں ضرور تھا۔ نو سال قبل میں نے اپنا عروسی جوڑا چالیس ہزار میں خریدا تھا۔ بہت پیارا تھا اور سب نے بہت تعریف کی تھی۔“

”سنگھڑ بہو بن کے آئیں یا سب کچھ سرال میں ہی سیکھا؟“

”ای کی بیماری کی وجہ سے میں کافی کم عمری میں گھر کی امور میں ماہر ہو گئی تھی اور شکر الحمد للہ سنگھڑ بہو

کے روپ میں، میں سرال آئی تھی اور شادی سے پہلے ہی میرے ہاتھ کے پکے کھانوں کی خاندان بھر میں دھوم تھی اور شادی کے ایک ہفتے کے بعد ہی میں نے کوکب شروع کر دی تھی..... اور سب سے پہلے میں نے شاہی زردہ بنایا تھا جو سب کو بے حد پسند آیا تھا۔“

”میاں صاحب خوش خوراک ہیں، چوڑی ہیں یا جو پک گیا کھا لیا؟“

”بلال بہت کم کھاتے ہیں، مگر بہت اچھا کھانا کھانے کے بعد ہی میں اور شوشتین ہیں اور اب تو میرے ہاتھ کا کھانا جب سے کھانے لگے ہیں انہیں کسی اور کے ہاتھ کا کھانا پسند ہی نہیں آتا۔“

”کیا بیوی کو بھی کمانا چاہیے؟“

”دیکھیں اگر عورت یہ سمجھتی ہے کہ میرے جاب کرنے سے گھر، شوہر اور بچے نظر انداز نہیں ہوتے اور وہ سب ذمہ داریوں کو ساتھ لے کر چل سکتی ہے تو ضرور جاب کرے..... اور اپنے میاں کا ہاتھ بٹائے، کیونکہ اتنی مہنگائی ہو گئی ہے کہ اب گھر میں سب کو کمانا چاہیے تو اپنے میاں کو سپورٹ کرے۔“

”یہ سوال میں سب سے کرنی ہوں کہ لڑکی کو ہم دھوم دھام سے بیاہ کر لاتے ہیں مگر کچھ عرصے کے بعد لڑائی جھگڑے شروع ہو جاتے ہیں تو ایسا کیوں

شوہر بیرون ملک چلے گئے تھے۔ ان سے میری جدائی ہی میری بہت بڑی قربانی تھی۔ وہ تقریباً پچھ سال ملک سے باہر ہے۔“

”شادی کے بعد آپ کے مزاج میں کیا تبدیلی آئی؟“

”شادی کے بعد مزاج میں کچھ خاص فرق نہیں آیا۔ پہلے بھی کم بولتی تھی، اب بھی کم بولتی ہوں۔ ہاں یہ ضرور ہوا ہے کہ مزاج میں تھوڑی خجندی آ گئی ہے۔ اپنے کام سے کام رکھتی ہوں بلا وجہ کسی کے معاملات میں دخل نہیں دیتی۔ خوش مزاج پہلے بھی تھی اور اب بھی ہوں۔“

”تین سال متکلی رہی۔ کوئی خاص واقعہ پیش آیا..... اور کیا تمام رسمیں ہوئی تھیں؟“

”نہیں جی..... اللہ کا شکر ہے کہ کوئی واقعہ جو قابل ذکر ہو پیش نہیں آیا..... اور رسمیں بھی سب ہوئی تھیں اور دونوں گھروں نے بہت انجوائے کیا تھا۔“

”اگر شادی نہ ہوئی ہوتی یا پھر بلال آپ کی زندگی میں نہ آتے ہوتے تو زندگی کیسی گزر رہی ہوتی؟“

”اگر خدا غواستہ شادی نہ ہوئی ہوتی تو زندگی اور پوری ہوتی..... میری زندگی میں ایک بہت بڑا خلا رہتا اور پھر اگر بلال میری زندگی میں نہ ہوتے تب بھی زندگی نامکمل ہوتی، کیونکہ بلال فطرتاً رشتوں کے معاملے میں اور محبتوں کے معاملے میں بہت حساس اور کیرنگ ہیں۔ جتنی میں ان کے ساتھ اچھی اور آرام دہ زندگی گزار رہی ہوں۔ کسی اور کے ساتھ نہ گزار سکتی مای کی بیماری کے دوران میں نے جتنا ان کا خیال رکھا تو مجھے لگتا ہے کہ بلال میری والدہ کی دعاؤں کا صلہ ہیں۔ اللہ بلال کو ہمیشہ صحت کے ساتھ سلامت رکھے۔ (آمین)۔“

”رخصتی کے وقت اور نکاح کے وقت کیا کیفیت تھی؟“

”نکاح اور رخصتی کے وقت بہت روٹی تھی۔ امی بھی بہت یاد آ رہی تھیں اور رخصتی کے وقت میرے بھائی اور بہن بھی بہت روتے تھے۔“

آپ کا شوہر بہت کیرنگ ہو، لوگت ہو۔ آپ کے ساتھ ٹھکس ہو اور الحمد للہ بلال کو میں نے اپنے تصور سے بہت زیادہ ٹھکس، پیار کرنے والا پایا، بہت اچھے انسان ہیں۔ مجھے بہت عزت دیتے ہیں، محبت عزت کے ساتھ ہی اچھی لگتی ہے اور الحمد للہ میں اللہ کا جتنا شکر ادا کروں کم ہے۔ میری متکلی تین سال رہی تھی۔“

”شادی کے بعد گھر کے ماحول اور سرال کے ماحول میں کیا فرق پایا؟“

”چونکہ میں بیاہ کر اپنی پھوپھو کے گھر آئی تھی تو ماحول میں تو کوئی خاص فرق نہیں تھا البتہ سونے جاگنے اور کھانے پینے کے عائم میں فرق تھا۔ چونکہ امی کا تعلق آرمی کے خاندان سے تھا تو ہم نے بہت ڈپلن لائف گزار دی تھی، ہر کام کے لیے عائم مقرر تھا..... مثلاً میکے میں صبح آٹھ بجے ناشتہ کرتے تھے، سرال میں دس، گیارہ بج جاتے تھے۔ میکے میں صبح ایک بجے کر لیتے تھے جبکہ سرال میں تین چار بج جاتے تھے۔ رات کا کھانا میکے میں آٹھ بجے کھا لیتے تھے جبکہ سرال میں تقریباً دس بج جاتے تھے۔“

”جوائنٹ فیملی میں آئی تھیں آپ؟ بہتر کیا ہے جوائنٹ یا سنگل فیملی؟“

”جی..... میں جوائنٹ فیملی میں آئی تھی۔ بلال کی فیملی میں والدین کے علاوہ صرف تین بھائی ہیں۔ جوائنٹ فیملی کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ آپ اپنے بچوں کی تربیت اپنی مرضی سے نہیں کر سکتے۔“

”شادی کے دو تین سال لڑکی کے لیے مشکل ہوتے ہیں کہ نیا ماحول ہوتا ہے تو قربانی دینی پڑتی ہے لڑکی کو..... اور پھر گھر اپنا ہو جاتا ہے..... ایسا ہے؟“

”شادی کو نبھانے کے لیے عورت کو ہی قدم قدم پر اپنا آپ مارنا پڑتا ہے۔ اپنا گھربنانے کے لیے عورت کو ہی زیادہ قربانیاں دینی پڑتی ہیں تب کہیں جا کر شوہر اور گھر والوں کے دلوں میں مقام بنتا ہے..... شادی کے بعد میں نے جو سب سے بڑی قربانی دی تھی وہ کہ شادی کے دو سال بعد ہی میرے

دستک دستک

شاہین رشید



سونیا حسین

”کیا حال ہیں؟“

”اللہ کا شکر ہے..... آپ ٹھیک ہیں۔“

”الحمد للہ..... آنگن“ دیکھ رہے ہیں۔ ہمیشہ

کی طرح جان دار پر فارمنس؟“

”بہت شکریہ..... واقعی آنگن“ بہت زیادہ

پسند کیا جا رہا ہے۔

”مگر دار مشکل لگ رہا ہے؟“

”ارے نہیں..... اب تو ماشاء اللہ سے اتنا کام

کام کوئی کام مشکل نہیں لگتا..... اور اب تو

..... کوئی چیلنجنگ رول ملے تو کروں.....

..... کا گھر دار بھی کافی حد تک چیلنجنگ ہے۔“

بہت پیاری پر فارمر ہو۔ گزشتہ دنوں

IIPA ایوارڈ میں تم کو دیکھا..... ایوارڈ کی مبارک باد!

”جی..... بہت شکریہ ایوارڈ ملنے پر میں بہت

خوش ہوں اور یہ میرے لیے بڑے اعزاز کی بات

ہے کہ سینئرز کے ساتھ مجھے بھی ایوارڈ ملا۔“

آپ کا گھر ہوئی تھیں تو ایوارڈ ملنے کی امید

..... کوئی امید نہیں تھی یہ تو اللہ

کا حکم تھا..... کہ ایوارڈ مل گیا مجھے۔“

اور ایسے ہی مزید ایوارڈ لینے کے لیے اب

..... کوئی چیلنجنگ رول ملے تو کروں.....

..... کا گھر دار بھی کافی حد تک چیلنجنگ ہے۔“

بہت پیاری پر فارمر ہو۔ گزشتہ دنوں

IIPA ایوارڈ میں تم کو دیکھا..... ایوارڈ کی مبارک باد!

”جی..... بہت شکریہ ایوارڈ ملنے پر میں بہت

خوش ہوں اور یہ میرے لیے بڑے اعزاز کی بات

ہے کہ سینئرز کے ساتھ مجھے بھی ایوارڈ ملا۔“

”ان کے جانے کے بعد میں سسرال میں ہی

رہی..... امی کا بھی چونکہ انتقال ہو چکا تھا تو میں نے

مناسب نہیں سمجھا سیکے میں رہنا..... میاں صاحب

جب ملک سے باہر گئے تو میری بیٹی صرف ایک سال

کی تھی۔ تو میرا سارا وقت اسی کے ساتھ گزر جاتا تھا یا

چھوٹے موٹے کاموں میں گزار جاتا تھا۔“

”میاں صاحب گھر کے کاموں میں آپ کا

ہاتھ بٹاتے ہیں؟“

”میرے میاں صاحب جاب کرتے ہیں اور

جب ان کی چھٹی کا دن ہوتا ہے تو گھر کے کاموں میں

میری بہت مدد کرواتے ہیں اور انہوں نے کبھی بھی

کام کے حوالے سے مجھ پر بوجھ نہیں ڈالا، بلال ان

مردوں کی طرح نہیں ہیں جو بیویوں پر عجب چلاتے

ہیں یا عجب ڈالتے ہیں۔ میرا بہت ساتھ دیتے ہیں یہ

چھٹی کے دن۔“

”بچوں کی تربیت میں زیادہ ہاتھ کس کا ہے،

آپ کا یا بلال صاحب کا؟“

”دونوں بچیوں کی تربیت میں ظاہر ہے میرا

زیادہ ہاتھ ہے اور بلال بھی بچوں کی تربیت کی کافی

فکر کرتے ہیں اور میرا ساتھ دیتے ہیں اور بیٹیوں کو جو

بات سمجھانی ہوتی ہے بڑے طریقے سے سمجھاتے

ہیں..... اور ہم دونوں مل جل کر بیٹیوں کی تربیت پہ

توجہ دیتے ہیں۔“

”اور آخر میں..... جن کی شادیاں نہیں ہوئیں

ان کے لیے کچھ کہیں گی؟“

”شادی ضرور کرنی چاہیے، یہ حکم خداوندی ہے،

اللہ کا سب سے زیادہ پسندیدہ عمل ہے یہ..... نکاح

ضرور کریں، شادی ضرور کریں یہ ایک مشکل سفر تو ہے

لیکن عورت اپنے صبر سے، محبت اور ایثار و قربانی سے

اپنے اس سفر کو بہت زیادہ خوش گوار بنا سکتی ہے۔ میری

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ سب بیٹیوں کی قسمت اچھی کرے

اور وہ اپنے گھر میں خوش و خرم اور آباد رہیں۔

(آمین) اور اس کے ساتھ ہی ہم نے درشن سے

اجازت چاہی۔

”ہے؟“

”سسرال میں لڑائی جھگڑے اس وجہ سے

ہوتے ہیں۔ جب میاں بیوی کے جھگڑے یا آپس

کے معاملات بیدروم سے باہر آ جاتے ہیں۔ تو پھر

مسائل جنم لینا شروع ہو جاتے ہیں اور میرا خیال ہے

کہ ایک مخصوص مدت کے بعد جو انٹ فمیلی سے الگ

ہو جاتا ہے۔ اس طرح رشتوں میں محبت قائم رہتی

ہے۔ کم ملیں مگر اچھے طریقے سے ملیں۔ اس طرح

رشتوں کا بھرم قائم رہتا ہے۔ میرا نہیں خیال کہ کسی

کے قریب رہ کر آپ ان کے دل کے قریب بھی رہ

سکتے ہیں..... بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی کے

قریب رہ کر آپ ان کے لیے دل سے بہت دور

ہوتے ہیں جو انٹ فمیلی میں رشتوں کا بھرم ختم ہو جاتا

ہے۔“

”گھر کا بجٹ کون بناتا ہے اور کیا لگا بندھا ملتا

ہے یا میاں صاحب ساری کمائی آپ کے ہاتھ میں

رکھ دیتے ہیں؟“

”گھر کا بجٹ میں ہی بناتی ہوں اور بلال جو

کماتے ہیں میرے ہی ہاتھ میں لا کر رکھ دیتے

ہیں..... اور بقول بلال کے کہ تم بہت اچھے طریقے

سے گھر چلا سکتی ہو اور چلاتی ہو، جو کہ میرے بس کی

بات نہیں ہے۔“

”میاں صاحب کو آپ بھی بنی اچھی لگتی ہیں یا

سادگی میں؟“

”میں اپنے میاں کو ہر حال میں پسند ہوں اور

وہ مجھے اکثر کہتے ہیں کہ مجھے تمہاری شخصیت اچھی لگتی

ہے۔ حلیہ سے مجھے کوئی مطلب نہیں ہے..... میرے

میک اپ کا خرچہ تو بالکل بھی نہیں ہے کیونکہ گھر میں

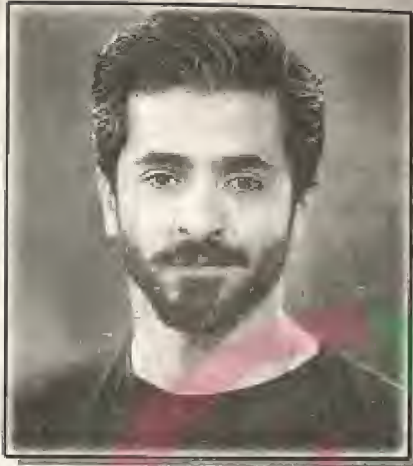
بالکل بھی میک اپ نہیں کرنی۔ میں میک اپ میں

”آئی لائٹر“ اور ”لپ اسٹک“ لگاتی ہوں اور کچھ نہیں

لگاتی۔“

”میاں صاحب ملک سے باہر رہے تو آپ

بھی ایک آدھ مرتبہ میاں سسرال میں ہی رہیں؟“



کی کمر میں سب کو اپنے خیالات بدلنے پڑے۔
 ”آپ کے والد ایئر فورس میں تھے آپ کا دل نہیں چاہا؟“
 ”بس کہتے ہیں نا کہ جہاں دھیان پڑ جائے۔
 اداکاری کا جنون تھا اور اس جنون کے آگے سب کچھ
 ثانوی تھا۔ جبکہ میرے والد کو تو تفریح امتیاز اور ستارہ
 امتیاز بھی مل چکا ہے۔“
 ”اور کیا مشاغل رہے آپ کے؟“
 ”بس تقریری مقابلوں میں بہت حصہ لیتا تھا
 اور ڈیوٹی ٹیم کا کپتان بھی رہ چکا ہوں۔ کرکٹ سے
 بھی لگاؤ رہا اور کھیل بھی چکا ہوں۔ بس باقی اپنی فیلڈ
 میں ہی دلچسپی رہی۔“



سورق کی شہیت

ماڈل انعم فیاض
 میک اپ روز بیوٹی پارلر
 فوٹو گرافی موسیٰ رضا

میں نے ”ایم بی اے“ کی ڈگری حاصل کی ہے۔“
 ”اچھا گڈ۔۔۔۔۔ استعمال میں نہیں لائیں،
 مطلب جاب نہیں کی؟“
 ”ابھی اس کی ضرورت نہیں پڑی۔ ابھی شو بز
 میں بہت سیٹ ہوں۔ خدا خواستہ کوئی مسئلہ ہوا تو پھر
 یہ ڈگری کام آئے گی۔“
 ”اپنے کیے گئے ڈراموں میں بہترین کے کہو
 گی؟“

☆☆☆

شہر یار منور

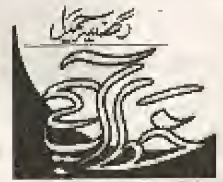
”کیا حال ہیں؟“
 ”جی اللہ کا شکر ہے۔“
 ”اسکرین پر نظر نہیں آ رہے آپ؟“
 ”میں کم کام کر کے معیاری کام کرنے کا قائل
 ہوں۔ اچھے کردار کے آگے کوئی جھوٹا نہیں۔۔۔۔۔ اور
 ویسے بھی میں کم اس لیے نظر آتا ہوں کہ جب بھی
 اسکرین پر آؤں دھماکہ خیز کردار میں نظر آؤں۔۔۔۔۔“
 ”تجس طرح“ آسانوں پر لکھا ہے“ میں آپ کا
 کردار لازوال تھا۔۔۔۔۔ کیا کہتے ہیں آپ؟“
 ”بالکل ٹھیک کہا کہ میرا رول لازوال تھا۔ بھل
 اور میری برقرار منس کو بہت پسند کیا گیا اور سیریل ہٹ
 گیا۔۔۔۔۔ تو جب آج تک لوگ اس رول کو یاد کرتے
 ہیں تو میری خواہش ہے کہ آئندہ بھی ایسا ہی اچھا رول
 کروں کہ ہمیشہ یاد رکھا جاؤں۔“
 ”آج کل کیا کر رہے ہیں؟“
 ”فلمیں بھی ہیں اور کچھ ڈرامے بھی۔۔۔۔۔ لیکن
 ابھی نہیں بتاؤں گا کہ پھر سسپنس ختم ہو جائے گا۔“
 ”آپ اتنے اچھے فنکار ہیں ہمارے کئی فنکار
 پڑوسی ملک آئی فلمیں کر بھی رہے ہیں اور کر کے بھی

”یہ تو بہت مشکل سوال ہے۔۔۔۔۔ تاہم کچھ نئی
 عرصہ قبل میں نے ایک سیریل کیا تھا۔“ کیسی ہے یہ
 تنہائی“ بہت ہٹ گیا تھا یہ ڈرامہ اور مجھے بھی بہت
 پسند ہے۔ بہت اچھا رول تھا میرا۔“
 ”اب فلموں میں بھی قدم جما چکی ہو“ ”مور“
 تمہاری پہلی فلم تھی۔ کیا کہو گی اپنی فلموں کے بارے
 میں۔ یعنی فلم انڈسٹری کے بارے میں؟“
 ”ہاں۔۔۔۔۔ یہ بہت خوشی کی بات ہے کہ ہماری
 فلم انڈسٹری بہت آگے بڑھ رہی ہے۔۔۔۔۔ گوکہ آہستہ
 آہستہ بڑھ رہی ہے مگر بڑھ تو رہی ہے نا۔“
 ”فلم کے لیے کردار کی کوئی خاص ترجیح ہو گی یا
 فلم تو ہے کردار مل رہا ہے تو قبول کر لو؟“
 ”نہیں نہیں۔۔۔۔۔ میں نے بھی ڈراموں کے
 لیے کیر و مائر نہیں کیا اور ہمیشہ معیار کو ترجیح دی تو بھلا
 بڑی اسکرین کے لیے کیسے کیر و مائر کر سکتی ہوں۔۔۔۔۔

میری ترجیح بہت ہی اچھا اور چیلنجنگ رول ہو گا۔۔۔۔۔
 میری خواہش ہے کہ میں ایسی فلموں میں کام کروں
 جس کی اسٹوری میرے ارد گرد گھومتی رہے، جس کی

سانحہ ارتحال

ہماری ساتھی ثوبیہ قطب کے والد قطب الدین رضائے الہی سے انتقال کر گئے۔
 ان اللہ وانا الیہ راجعون
 اور خواتین ڈائجسٹ، ثوبیہ اور ان کے گھر والوں کے غم میں برابر کا شریک ہے۔
 ہماری دعا ہے کہ اللہ مرحوم کے درجات بلند فرمائے اور لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے آمین۔



خط بھجوانے کے لیے پتا
ماہنامہ شعاع - 37 - اردو بازار، کراچی۔
Email: shuaa@khawateendige.com

پہلا خط لاہور سے شہناز تابدیک کا ہے، لکھتی ہیں
شعاع اور میر اساتھ تو تقریباً ایک ڈیڑھ سال پہلے
ہے لیکن خواتین تو میں بہت دیر سے پڑھ رہی ہوں جب
میں جوان تھی۔ بچے چھوٹے تھے وہ بچے۔ ایک بچی بہت
محسن حالہ تھی۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے انہوں
کے بچاؤں سے انہوں نے بچاؤ کیا۔ انہوں نے بچاؤ
کیا۔ ماشاء اللہ سب بچے بچے ہیں بڑا بچہ بھی
کالج میں ہے اور میں خود بڑھی ہوئی ہوں۔ تدریس
پیدائش چودہ اگست 1947ء کے عمر کا اب خرد حساب
لگائیں۔ جلد ہی پیر اور شوگر کی سرکس میں بھی اللہ اللہ
میں شکی نہیں ہوں۔ فجر کے بعد واک کرنے جاتی ہوں
بچر آ کے تھوڑی دیر سونا چمکا کر امی اور اپنا ناشتہ بناتی
ہوں۔ ناشتہ کر کے قرآن پاک پڑھتی ہوں دوسرے میں
پڑھتی ہوں۔ گودا خدہ ہوتی ہے۔

بھی میں دھوپ میں چھت پر بیٹھی آپ کو خط لکھ رہی ہوں
میری امی میرے پاس بیٹھی اخبار پڑھ رہی ہیں۔ ماشاء اللہ
میری امی بھی گھر میں چلتی پھرتی ہیں۔ میڑھیاں چڑھ گئی
ہیں۔ پانچ وقت کی نماز اور قرآن پاک پڑھتی ہیں۔
انہوں نے ہندوستان کے اسکول سے پانچ
براعتیں پڑھی ہوئی ہیں۔ ہم جالندھر کے آرائیں ہیں
پاکستان بننے کے بعد یہاں آئے تھے اب اگر میں آپ کو
یہ کہوں کہ ہمارے گھر میں ساس بھوکا کوئی مسئلہ نہیں ہے تو
شاید کوئی یقین نہ کرے میں نے بھی نہیں سوچا کہ اب
میری بہو بھی میرا ناشتہ بنائے گی جب بھی وہ جلدی اٹھ
جائے تو وہ بھی بنادیتی ہے اگر اسے بھی کہیں جانا پڑ
جائے۔ مثلاً بچوں کے اسکول یا کسی اور جگہ تو کھانا بھی بنائی
ہوں روٹی چاول سب کچھ بناتی ہوں۔ ہمارے گھر کا ماحول
بہت خوش گوار ہے۔ شکر ہے اللہ کا کہ سنے عزت کرتے ہیں۔
رات میں نے ذرا سکندر کا ساگ پڑھا تو میں نے
سوچا کہ میں بھی لکھوں کیونکہ مجھے تو خود ساگ بہت پسند
ہے۔ ہمارے ساتھ والا گھر میری ممانی کا ہے۔ وہ تو فوت
ہو چکی ہیں، آج سے دو ہفتے پہلے ممانی کی بیٹی نے ساگ
بھیجا، بہت خوش ہوئی اب شام کے وقت میں نے ساگ
کھا یا رات کو میرے پیٹ میں درد شروع ہو گیا۔ میرا بیٹا
کہنے لگا چائیں امی میں آپ کو ڈاکٹر کے پاس لے جاؤں،
ہمارے ابدالی چوک میں ڈاکٹر نعیم ہیں شکر ہے، وہ اس
وقت بیٹھے تھے پوچھنے لگے۔
”کیا کھایا تھا میں نے کہا ساگ“ اب بیٹا کہنے لگا
”ڈاکٹر صاحب بھلا ساگ بھی کوئی کھانے کی چیز ہے میں
سچ بتا رہا ہوں“ ڈاکٹر صاحب کہیں گے ساگ تو سردیوں کا
کھانا ہے، بخون پیدا کرتا ہے اور اس کے فوائد بتا دیا
میں نے کہیں وہ کہنے لگے کہ ساگ بھی کوئی کھانے کی چیز ہے۔
اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر وہ سب کچھ پیدا نہیں کیا کہ وہ
سب چیزیں والی چیز جسم کر سکے اگر اللہ تعالیٰ انسان کے اندر
وہ سب پیدا کرتا تو انسان نے وہ مشقوں کے سچے بھی
کھا جانے تھے (لیں بھلا کیا بات ہوئی) میری بہو بھی
ایسے ہی کرتی ہے ساگ پکا کر فریز کر لیتی ہے اور دوپہر اور
دشہرہ کال کر کھاتی ہے۔
میں نے پانچ دن والی کھائی اور چار

دشہرہ کے شکر ہے میں ٹھیک ہو گئی اب آپ یہ نہ سمجھیں کہ
میں نے ساگ کھانا چھوڑ دیا ہے جی نہیں میں نے دو دن پہلے
پکایا ہے ہماری کام والی کھتوں سے تو کوئی لائی بھی نہیں، اور گ
اور پیاز کا بھار، گرم ساگ اور اس کے اوپر مکھن اور
ساتھ لکڑی کی روٹی، اگر مزہ نہ آئے تو پیسے واپس.....
زندگی کی داستان تو بہت لمبی ہے لیکن اب سب کچھ
بھول چکی ہوں۔ اللہ کا شکر ہے اس نے بہت نوازا ہے۔
یہ نہیں کہ دولت بہت ہے بلکہ یہ کہ سکون ہے۔
راج: پیاری شہناز! آپ نے ساگ کی اتنی تعریف
کی ہے کہ ہمارا بھی ساگ کھانے کو دل چاہنے لگا ہے۔
چھوٹا سا افسانہ قاریوں کو اتنا متاثر کرے گا ہمیں اندازہ نہ
تھا۔ اس افسانہ کی وجہ سے ہی آپ نے ہمیں خط لکھا۔
بہت دلچسپ خط لکھا ہے آپ نے۔ آپ ہماری اتنی پرانی
قاری ہیں، ہمیں بے حد افسوس ہے کہ آپ نے ہمیں پہلے
خط کیوں نہیں لکھا۔ آپ کا خط پڑھ کر میں لگا جیسے سامنے
بیٹھی باتیں کر رہی ہوں۔ اب ہمیں خط بھی رہے گا۔ آپ کے
خط کے منتظر ہیں گے۔
درا نور نے لاڑکانہ سے لکھا ہے
”میں پانچ“ واہ بھی فرح آپی آپ نے تو ہمیں
جنگل گھاڑا الا اس کے لیے بہت شکر ہے اور بات ہو جائے
”خواب شے کا“ بس اس کے لیے اتنا کہوں کی ضرورت نہ
چھوٹ منڈی میں نے یہ کہانی دل سے پڑھی ہے، بہت
اچھی لگی۔ ”دل سے نکلی دعا“ کے بارے میں بتا دیجیے کہ
شاع ہونے کے لائق ہے یا نہیں۔
راج: پیاری رو! آپ کی کہانیاں اچھی پڑھی نہیں اس
لیے ان کے بارے میں کچھ بتانے سے قاصر ہیں لیکن
آپ کا خط پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ کئی احوال آپ کی کہانیاں
لکھنے کے بجائے کہانیاں پڑھنے پر توجہ دیں۔
رباب علی خاقان کوٹ پنڈی داس ضلع شیخوپورہ سے
شریک محفل ہیں
آپی میری امی ہمارے بچپن میں ہی انتقال کر گئی
تھیں تب سے آج تک شعاع، خواتین اور کرن گرام قلم
پایا۔ بہت دفعہ دل کی الجھنوں کو ان تحریروں نے کھلایا
ہے۔ آج صبح کی رات رات کی بات کروں تو ریا کو گودہ میں بند

کر نے والی بات ہے۔ میرا حمید اور مراد احمد کے لیے تو دل
سے دعا نکلتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ رضا، صائمہ اکرم
جو پدری، عیسہ احمد، مصباح نوشین، ام فیثور اور بہت سی
رائز جو اپنی تیار سے اصلاح کا کام کر رہی ہیں۔
راج: پیاری رباب! شعاع کی محفل میں خوش
آمدید۔ جب مجھ سے نانا جوڑا ہے کے سلسلے میں شرکت
کے لیے آپ سوالات بھی ساتھ لکھیں۔
افسانہ یا دولت آپ خط والے لفظانے میں بھی بھیج
سکتی ہیں۔ صفحات زیادہ ہوں تو سادہ خاک لفظانے میں ڈال
کر بھی بھجوا سکتی ہیں۔ لفظانے پر حق ایڈریس ضرور لکھیں۔
لائب طارق نے بامغان پورہ لاہور سے لکھا ہے
میرا نام لائب طارق ہے میں بچپن کلاس میں پڑھتی
ہوں۔ ابھی میں چھوٹی ہوں اس لیے ماما مجھے رسالے
پڑھنے نہیں دیتیں۔ جب میں بڑی ہوں گی تو سارے
رسالے پڑھوں گی۔ ابھی میں ماما کے لیے پاپا کے ساتھ چا
کر رسالے لاتی ہوں اور خط پوسٹ کرتے بھی جاتی
ہوں۔ ماما کہتی ہیں کہ تم اپنی پڑھائی پر توجہ دو پھر بڑی ہو کر
رسالے پڑھنا۔ ابھی ماما کو نہیں پتا کہ میں نے بھی خط لکھا
ہے۔ ماما کو تب پتا چلے گا جب یہ شاع ہوگا۔
راج: لائب! پیاری گڑیا، بہت سارا پیار۔ آپ نے
خط لکھا، ہمیں بہت اچھا لگا بچوں کلاس کی طالبہ ہیں اور
اتنا پیارا خط لکھا ہے۔ ہمیں لگتا ہے کہ بڑی ہو کر آپ
بہت کچھ لکھنے والی ہیں۔
فوزیہ شمر بٹ ہانیہ عمران، آمڑہ یکس گجرات
پیاری سی ماڈل کے ہاتھوں۔ میں۔ بے تاج
بادشاہ گلاب پسند آئے۔
حمودت پڑھنا اچھا لگتا ہے۔ اب تو ہانیہ عمران بھی
ان کو بہت شوق سے پڑھتی ہے پیاری باتیں۔ بے شک
ہمیں اسے دے دیں تو ان کا شک سے شکر کرنا نہیں آتا۔
میں نے اپنے دل دیکھ خدا کیا کرتا ہے کی بہرہ دکن کو
لائی۔ گودے سال کی بات ہے ہر کسی کی شہر گف ابھی
میں کوئی طالبہ نہیں رہیں۔ لگتا ہے کوئی جادو کی چراغ
ان کے پاس ہے آئے ڈیڑہوں ڈیڑہ کام کہے کر گئی ہیں۔
جہاں سب کے خوابات اچھے لگتے ہیں کم کوڑ کی باتیں ابھن

میں ڈال گئیں۔ تجھ سے تانا جوڑا کیا میں اپنی امی کی شادی کا احوال بھیج سکتی ہوں۔

صائمہ اکرم انف..... اتنی جلدی ناول کو سیٹ دیا ہے۔ اس کی جدائی برداشت نہیں ہو رہی۔

”شام کی حویلی“ میں بھی اب کچھ کچھ اچھا لگ رہا ہے، کشف تو ہاتھ دھو کے موند کے پیچھے پڑ گئی ہے۔ ”آس پاس“ دل میں لکھ کر کئی بارے کردار۔ ہمارے ارد گرد ہی نہیں رہ رہے ہیں۔ لیکن بھی بد ریت کا احساس نہیں ہوا۔

محبت مجزہ ہے۔ دل کو چھو گئی۔ منشا حسن علی کی تحریروں نے بھی مایوس نہیں کیا۔ ہمارا آشیانہ بھی بیٹ رہا۔ ایسے لگا اپنے محلے کی کوئی عورت اپنے محلے کی داستان سن رہی ہے۔

افسانے اچھے تھے۔ بار دل دار اس قسط کا موضوع اچھا لگا۔ تیسرا افسانہ ساگ لکھا ہے ذرقا سکندر نے وہ ساگ والے لطیفے سے انہار ہو کر افسانہ لکھ دیا۔ آئیڈیا پسند آیا ہے۔ غزلوں میں اظہر فراغ کی غزل کا یہ مصرع اچھا لگا۔ تیری شرطوں پہ ہی گرنا ہے اگر تجھ کو قبول۔ مسکرائیں وہ ابھی مسکراہٹ نہ لائیں۔

”مخط آپ کے“ ہر مہینہ یہ محفل خوب سہائی جاتی ہے۔ میں حیران ہوتی ہوں اس میں بھی بہت خوب سے تمام شعاع پڑھتی ہوں ہر تمام قارئین ہمیں اتنا اچھا لکھتی ہیں اور ایسے پوائنٹ نوٹ کر کے ان پہ تبصرہ کرتی ہیں کہ دل سے داو دیتی ہوں۔ شازیہ طارق کے متعلق جان دلی افسوس ہوا۔

دل سے دعا کی کہ اللہ پاک شازیہ کی کئی خدایاں دور فرمائے۔ (آمین)

آج کل مصروفیت بہت ہے امی جی کی ذمہ داری پھر گیس کی لوڈ شیڈنگ آدھے گھنٹے کا کام دو دو گھنٹے میں ہوتا ہے۔ ہمارے پنجاب میں سردی لٹکانے کے پڑ رہی ہے۔ ہمارے ملک کے معصوم وزیراعظم پناہیں کہاں اور کس کس کو ایک ایک ٹوکرا اور چار چار مرغیاں دے رہے ہیں۔ اگر آپ کی طرف آئیں تو ہمارا بھی ایڈریس ان کو دے دینا۔

ویسے بھی جو کچھ نہیں کرتے، وہ کمال کرتے ہیں اور

جو کمال کرتے ہیں، ان کو پتا ہے کمال کیسے دھماکے کرتا ہے۔

ج: پیاری فوزیہ! عوام لائے یا کوئی اور ”تبدیلی“ تو آچکی ہے۔ اب ہمیں میرے اسے برداشت کرنا ہے۔ گیس کی لوڈ شیڈنگ میں شاید کچھ کی وجہ ہو جائے کیونکہ شاہد خاقان عباسی نے این ایل جی کا جو معاہدہ کیا تھا، نئی حکومت نے پہلے اس کی پشت داپس کر دی تھی۔ اور کہا تھا کہ اس میں کرپشن ہوئی ہے اب حسب روایت ایک اچھا پوٹرن لے لیا ہے۔ این ایل جی اب اسی معاہدہ کے تحت منظر پر ہے ہیں۔ شاید عوام کی مشکلات میں کمی واقع ہو۔ تبصرہ تو آپ ہمیشہ ہی تفصیلی اور بہت اچھا کرتی ہیں۔ اس بار بھی بہت خوب ہے۔

فرحانہ مہنا نے گوجرہ سے شرکت کی ہے لکھتی ہیں سال تو کا پیار سا ناکل ہاتھ میں، خود محبت سے ساعت کو دل افروز سکون میسر ہوا۔ اس کے بعد بڑے شہزاد کی طرف کیونکہ اولاد از گولڈ۔ یہ کہانی آغاز سے ہی دلچسپ ہو گئی تھی۔

”گماں سے یقین تک“ پڑھنے میں مصروف تھی کہ لہجہ بنا لیا۔ مادودہ اہل رہا ہے تو بھائی بھائی کی طرف تین کلو میں سے ایک کلو بچا، کیم جنوری کی شہرٹی صبح بھی بھی دھونا پڑا تھا۔ کہانی پر مجزہ۔ ”محبت اک مجزہ“ بھی اچھی تھی۔ ”آس پاس“ تیسرا ناز کا اعزاز بیاں بھی آسے رزاقی جیسا ہے۔ گھر بلوی کہانی کو روانی دی۔ ویسے کہانی تھی دلچسپ۔ ہمارا آشیانہ بھی پسند آئی۔

افسوس میں بارود اور بیٹ تھا۔ اور آبی محذرت کے ساتھ ”ساگ“ افسانہ شعاع میں شائع ہو گیا۔ یہ شعاع کا معیار نہیں۔ پلیز مائنڈ نہ کیجیے گا۔ اس ماہ دستک دستک کچھ خاص نہیں لگا۔

ج: پیاری فرحانہ! ساگ افسانہ ہماری تقریباً سب قاریاں نے بے حد پسند کیا ہے آپ کو شعاع کے معیار سے کتر لگا۔ ہم آپ کی رائے کا احترام کرتے ہیں۔ اسے اندر خیال رکھیں گے۔ دودھ کے خیاں کا نہیں بھی انہوں نے۔ پھر جنوری کی شہرٹی صبح میں بچن دھونا بھی آسان نہیں، اب کیا کہیں، اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔ شوق کی کوئی نہ کوئی قیمت تو دینی ہی پڑتی ہے۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

کراچی سے تسنیم کوثر شریک محفل ہیں

ایسا لگتا ہے جیسے شعاع کمزور مطلب کچھ زیادہ ہی مسلم ہوتا جا رہا ہے اس کی قیمت بڑھادی جائے تاکہ کچھ تو فریہ ہو جائے۔ اس دفعہ شعاع میں سب سے بہترین ناول نغمہ ناز سلطان کا ”آس پاس“ لگا خوب صورت اور مزیدار کہانی نے دل خوش کر دیا۔ مصنفہ کو بہت بہت مبارک باد۔ اسی طرح ہمارا آشیانہ عزیزین دلی نے بھی بہت خوب لکھا۔ جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ اس کے علاوہ منشا حسن علی کا محبت مجزہ ہے بھی، بہتر، مگر خاصاً کرام کے شہزاد کی تو کیا بات ہے۔ رخسانہ گارعد بھی شام کی حویلی اچھے انداز سے لے کر کھل رہی ہیں۔ افسانوں میں ذرقا سکندر کے ساگ نے خوب مزادیا ہمارے ہاں بھی ساگ شوق سے کھا یا تو جاتا ہے مگر بچوں کا وہی انداز ہوتا ہے جو کہانی میں بیان کیا گیا اور جناب انجمن خیم کے بار دل دار کی بات ہی نرالی ہے ان کی انیسویں میں تو حنا میزا ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ حنا شہرٹی نے آئینہ دل وصل گیا، اچھا لکھا ہے۔ گزریے سال کی بات ”آس پاس“ پر مڑوے اچھا رہا مگر کافی کم بہتوں کے سروے تھے اور اس دفعہ تجھ سے تانا جوڑا میں اور چند شاپین کی دکھ بھری داستان پڑھ کر بہت افسوس ہوا اللہ تعالیٰ اس لڑکی کی پریشانیاں دور کرے۔

ج: پیاری تسنیم! آپ نے درست کہا، کاغذ کی قیمت میں اضافہ کا تقاضا یہی ہے کہ پرچے کی قیمت میں اضافہ کر دیا جائے لیکن قیمت میں اضافہ ہماری کچھ قارئین کے لیے گراں ثابت ہو گا۔ اس لیے جب تک ادارہ برداشت کر سکتا ہے۔ ہم قیمت برقرار رکھے ہوئے ہیں ورنہ کاغذ کی بڑھتی ہوئی قیمتیں اور ”تبدیلی“ کے خوفناک اثرات نے روپے کا جو حشر کیا ہے، اس کے بعد موجودہ قیمت برقرار رکھنا ہمارے لیے دشوار ہو جاتا جا رہا ہے۔

شعاع کی پسندیدگی کے لیے تھہر دل سے شکریہ۔ نغمہ ناز بہت اچھی مصنفہ ہیں۔ ہم ان تک آپ کی تعریف پہنچا رہے ہیں۔ ثانیہ صدیق نے ریٹالہ خوردہ اوکاڑہ سے لکھا ہے سب سے پہلے شہزاد پڑھا۔ ہادی اور دھوا راک ساتھ۔ نہ سچا ہے ہوئے بھی اچھا لگا۔ ارتضیٰ کے لیے برا لگا لیکن بھی کیا کر سکتے ہیں۔ ہم نے تو شروع سے ہی شہزاد کا رشتہ ہم زاد کے ساتھ لگا دیا ہوا ہے۔ پر اک بات پوچھنی تھی کہ جب لڑکی کا نکاح اس کے ولی کے بغیر نہیں ہو

سکتا تو کہانوں میں کیوں ہو جاتا ہے۔

مکمل ناگزردوں ہی زبردست تھے۔ ”آس پاس“ اچھی تحریر لیکن غصے والی دلوں کے بارے میں پڑھ کے مجھے ہمیشہ اپنی بے بے (دادی) یاد آتی ہیں میں ان کی محبت کو لکھوں میں بیان نہیں کر سکتی مگر اپنے سب پوتے پوتوں سے زیادہ انہوں نے مجھے اپنے پاس رکھا (گرمیوں کی چشموں میں) اور گاؤں میں گزریے میرے بچپن کے دن بس دادی ہو تو میری بے بے جیسی۔ اللہ انہیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام دے۔ آمین

”گماں سے یقین تک“ بھی اچھا ناول تھا پر کیا واقعی اس کے تھوڑا سا بھی آس پاس دیکھ لائف میں ہوتا ہے مطلب چلو چھوڑ دیجی۔

ناولٹ بھی دونوں اچھے تھے۔ ”محبت مجزہ“ اچھا تھا مگر ایک لائن اور والا ہی کھٹ۔ ”ہمارا آشیانہ“ زبردست۔ خاص کر یہ فقرہ پڑھ کے بہت حرا آیا ”پلیز ابھی اندر مت جائیں اندر میرے اور۔۔۔۔۔ اور“ میں آپ کو پسند کرنا ہوں۔۔۔۔۔

”بار دل دار“ پورے شعاع کی جان۔ دوتی زندہ باد۔ یار دل دار پڑھ کے تو میں آپ کی فین ہو گئی ہوں ”افشین“۔

”ساگ“ سعد کو تو پھر بھی بس ناشتے دو دو پھر کے کھانے اور رات کے کھانے میں ساگ نظر آتا ہو گا۔ ہمیں دیکھو کہ گھر سے نظر آتا بند ہوا نہیں تھا کہ شعاع میں بھی فہرست پر نظر دوڑانے پر ساگ انف۔۔۔۔۔ ساگ۔۔۔۔۔ میرا بس پہلے تو ایک دفعہ میں ہی دنیا کا سارا ساگ پکا کر ان سب کی دعوت کر ڈالوں جن کو ساگ پسند ہے تاکہ روز روز سے تو جان چھوٹے۔ (اف) تو یہ ساگ اور سردیاں ایسے جڑی ہیں جیسے ”تجھ سے تانا جوڑا ہے“ اور دکھ)

جب تجھ سے تانا جوڑا ہے اس دفعہ تو بڑھ کے دل کا پ کا پ گیا۔ اللہ نے ضرور آپ کے لیے کچھ بہترین رکھا ہو گا اس لیے تو ایسے لوگوں سے جان پھرانی۔

ج: ثانیہ! دادیاں واقعی بہت اچھی ہوتی ہیں۔ ہمیں بھی اپنی دادی بہت یاد آتی ہیں۔ آپ کے لافز پر بھی آپ کا نام پتا نہیں تھا۔ ہم نے دو تین بار لافز الٹ پلٹ کر دیکھا شاید کسی کو نے پر آپ کا نام لکھا نظر آ جائے لیکن آپ شاید لکھنا بھول گئیں۔ آپ کی کہانی ستر دہائی کے افسانوں کے

پہلے بھی ایک شادی تھی انہوں نے تو ہمارا ناک میں دم کر دیا
 گیارہ بجے شیطانی آواز گانے شروع ہوتے رات دو تین
 بجے تک نیند حرام۔ نماز پڑھنا عذاب۔ جنوری کا شمارہ ہیر و کن
 کا بس گلہ سستی دیکھا کیونکہ پھولوں سے ہمیں عشق ہے لیکن
 اکیسویں صدی اور میت کے دور نے پھولوں اور پودوں کی
 کاشت ہی مانو! ختم کر دی ہے۔ ہمارے جیسے خوابوں خیالوں
 میں پھول پودے دیکھ کر خوش ہوتے رہتے ہیں۔ شام کی حویلی
 رخسانہ لگا کر تاؤ نامی کاٹی ہے۔ ”شہر زاد“ مسنی خیز موڑ پر
 پہنچ چکا۔ ساگ پڑھ کے سردیوں کا مزہ آ گیا۔ ہمارے ایک
 بھائی کا بھی یہی حال ہے۔ ساگ دیکھ کے کہتا ہے یہ چارہ تم
 کسے کھاتے ہو۔ ساگ مجھے ہضم نہیں ہوتا لیکن کھانا نہیں
 چھوڑتی۔ سردیوں کا مزہ تو ساگ، سہاگنا، لالے، مونگ پھلی،
 گجر بلا، سوسن طاحہ میں ہے کھل، رضائی میں گھس کے مطالعہ
 کرنا اور ساتھ میں کشمیری چائے یا کافی واہ! کیا مزہ ہے۔
 راسخو دہبر کو اس قرار دیتی ہیں لیکن سمبر کا بھی اپنا مزہ ہے۔
 مجھے تو خزاں کا موسم بھی بہت اڑیکٹ کرتا ہے ٹھنڈ
 درخت، پیلے پتے دھند کا موسم۔ پاکستان کو اللہ تعالیٰ نے ہر
 موسم سے نوازا ہے۔ ہمارے ماسوں کراچی میں رہتے ہیں۔
 ان کے بیٹے کی شادی ہے اگر کراچی آنا ہوا تو آپ کے
 دولت خانے پر ضرور حاضری دیں گے۔
 راج: بنت مریم! آپ کے خط ہمیں موصول ہی نہیں
 ہوئے تو جواب کیسا؟ ہمیں انفسوس ہے کہ آپ کے خط ہم
 تک نہ پہنچ سکے اور آپ کو مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔
 سائرہ رضا: جب نے بہت قریب ہیں اور ان کی
 شخصیت اور تحریروں میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ صرف میوزک
 کے بارے میں ان کے خیالات جان روئے قائم نہ کریں۔
 کراچی میں تو موسم کے رنگ کم ہی نظر آتے ہیں
 لیکن ہمیں بھی سارے ہی موسم اچھے لگتے ہے۔
 آپ سردیوں سے لطف اندوز ہوں۔ کراچی میں تو
 سردی بس جھلک دکھا کر غائب ہو جاتی ہے۔
 کراچی آئیں تو ضرور تشریف لائیں۔ ہمیں آپ
 سے مل کر خوشی ہوگی۔
 شازیہ ہاشم سواتی کھڈیاں خاص قصور سے شریک محفل

ہیں، لکھا ہے

پہلی شماع کو پڑھا۔ آپ نے حقیقت بیان کر
 دی۔ لوزنہ بہنا، آپ کی محبت میں ڈوبے الفاظ والی حمد
 شائع ہوگئی۔ بہت پیاری، اب تو خوش ہو جاؤ! جو ماہر
 القادری کی یہ نعت لکھی گئی ہے کیا یہ۔ الطاف حسین
 حالی کی نہیں ہے؟ بہر حال نعت مبارکہ پڑھتے ہوئے
 پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری پیاری باتیں پڑھ کر
 رب تعالیٰ سے ہدایت کی دعا کرتے ہوئے فوراً
 چھلانگ لگائی شہر زاد کی طرف..... ہادی کے دل میں
 سوٹ کا رز پیدا ہوئی گیا درہم دار کے لیے..... ہادی کا
 تعلق کہیں خاکان ٹیلی سے تو نہیں؟ چلیے دیکھتے ہیں
 ”شام کی حویلی میں“ اچھا جا رہا ہے۔ کیا حیدر زہب سے
 محبت کرتا ہے اور کشف چٹائیں کیا گل کھلائے گی؟ ”محبت
 اک مجرہ ہے“ ڈیرو سب پارائیڈ بہت اچھا ہوا۔ فضا حسن
 علی کی ہر تحریر بہت اچھی ہوتی ہے اور بھلا کے کیا کہنے تھے۔
 ”آس پاس“ نعیدہ آئی! انٹر سٹارک اینڈ ونڈر فل۔ خاص
 طور پر رحمت اور بلال کی نوک جھونک اور ان کی دادی کا
 پیار، میری دادی اتنی اچھی تھیں کہ میں الفاظ میں ان کی
 تعریف نہیں کر سکتی۔ اللہ ان کی مغفرت فرمائے۔ خطا آپ
 کے بہت اچھا لگا، خاص طور پر اور جند کا۔
 راج: پیاری شازیہ! بہت خوشی ہوئی کہ شماع آپ کو
 پسند آیا۔ آپ کی تقریر ان سطور کے ذریعے متعلقہ
 مصنفین تک پہنچا رہے ہیں۔ جنوری کے شمارے میں نعت
 الطاف حسین حالی کی نہیں ماہر القادری کی ہی ہے۔
 شاعر ذوالفقار، نورے والی رحیم یار خان سے لکھتی ہیں
 ”ناکسلی پیارا تھا۔ ہاتھ میں پھول لیے ماؤں پیاری
 گل رہی تھی۔ حمد اور نعت پڑھنے کے بعد احادیث
 پڑھیں۔“ ”رسک“ میں فائزہ حسن کو پہلے پڑھا۔ ویسے
 انہیں کبھی بی وی میں نہیں دیکھا۔ یحییٰ جعفری سے ملاقات
 اچھی تھی لیکن بہت مختصر تھی۔
 ”مکڑے سال کی بات“ سروے میں سب کے
 جواب اچھے لگے، کوثر خالد نے آخر میں جو اشعار لکھے، وہ
 بہت پسند آئے۔ ”جب تجھ سے نا تا جوڑا“ اور جند کا نا تا
 پڑھ کر بہت انفسوس ہوا۔

فضا حسن علی کا کافی عرصے سے انتظار تھا سال کے
 شروع میں فضا حسن علی کی تحریر بھی آخر کار شائع ہوئی تھی۔
 فضا حسن پھولوں، خوشبوؤں کی رائٹر ہیں۔
 ”آس پاس“ بھی سادہ سی اچھی تحریر تھی۔ رحمت
 پکارتے کی شوقین نعت اور کھانے کا شوقین بلال ان کی
 جوڑی تو بنی ہوئی تھی۔ باقی جوڑیاں بھی اچھی تھیں۔
 ”گمان سے یقین تک“ صدف ربیان نے بہت
 اچھی لکھی۔ ”ساگ“ یہ تو ہمارے ہی گھر کی کہانی لگتی ہے۔
 ہمارے گھر بھی ہر دوسرے دن ساگ پکاتے ہیں جو میں
 بالکل بھی نہیں کھاتی لیکن باقی گھر والے جو کہ بہن امی اور
 ابو ہیں، وہ بہت شوق سے کھاتے ہیں اور ایک دوسرے
 کے گھر تو ساگ ایسے بھیجا جاتا ہے جیسے تورہ ہو۔
 ”آئینہ وصل گیا“ اور ”یار دل واڑ“ بھی اچھے
 افسانے تھے۔ ”شعاع کے ساتھ“ سلسلہ تھوڑے عرصے
 بعد کہاں غائب ہو جاتا ہے۔
 راج: پیاری شادی! ساگ مختصر سا افسانہ ہماری قارئین
 کو بہت اچھا لگا شاید اسی لیے کہ یہ ہر گھر کی کہانی ہے۔
 شعاع کی پسندیدگی کا جان کر خوشی ہوئی۔ آئندہ بھی خط لکھ
 کر اپنی رائے کا اظہار کیجیے گا۔
 رفعت امین: مظفر کا لونی، انگریزیاں نوالہ (جھنگ) سے
 مارینڈیر نے بھاگنا نوالہ سے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں
 ”ناگن بہت عمدہ تھا، ہاتھوں پر ہندی بہت اچھی لگ رہی تھی۔
 ”ہند“ اور نعت سے فیض یاب ہوئے۔ زہنب نور
 مہارک ہو چکی۔ آپ کی ”حمد“ دیکھ کر بھائی کو کتنے والٹ کا
 کرٹ لگا؟ بابا!۔
 ”پیادے نبی کی پیاری باتیں“ پسندیدہ سلسلہ
 ہے۔ ”رسک“ فائزہ اور یحییٰ سے مل کر اچھا لگا۔
 سروے میں سب بہنوں کے جوابات شان دار
 تھے۔ میں نے تو سروے بھیجا ہی نہیں مگر اک سوال کا
 جواب دے دیتی ہوں کہ پچھلے سال کی جو تحریر مجھے سب

سے زیادہ اچھی لگی دو تھی ”شب تاب“ میوش افشار
 سیف علی جنگ کی آنکھیں اور ”بن پانچھی“ بھی۔ ان
 دونوں راسخو کو میری طرف سے بہت بہت تعریف۔
 بات ہو جائے سلسلہ وار ناول کی تو ”شہر زاد“ بہت
 اچھا ناول ہے۔
 ”شام کی حویلی“ بہت مزے کا ناول ہے۔
 ”شہر زاد“ حق ہو رہا ہے تو پلیر فرزند کھل یا
 سمیرا حید سے ناول لکھوا لیں نا پلیر پلیر پلیر۔
 ”آئینہ وصل گیا“ دناشری اچھا لگا۔
 ”ساگ“ زور قاسم سکندر، بابا میری اماں جان کو بھی ساگ
 بہت پسند ہے۔ سعد تیرے غم میں، میں برابر کی شریک ہوں
 میرے بھائی، کیا کریں اب سردیوں کی سوغات جو ہوئی۔
 ”محبت ایک مجرہ ہے“ فضا علی حسن ناکس۔
 راج: پیاری ماری! آپ نے پورا اشعار پڑھ کر ہمیں
 تفصیلی خط لکھا، بہت خوشی ہوئی۔ آپ نے بہت اچھا خط لکھا
 ہے۔ انفسوس کہ صفحات کی کمی کے باعث شائع نہ کر سکے۔
 کرن میں ”مقابلے ہے آئینہ“ کے لیے آپ دوبارہ نہ
 بھجوائیں باری آئے پر آپ کا سلسلہ شامل ہو جائے گا۔
 فرح صبغت اللہ علوی اور سندس صبغت اللہ علوی نے چاہ
 حکیم ضلع پاک پتن
 2018ء میں مسلسل طبقات جینے کے بعد مسلسل ہی ناکا کی
 کا سامنا ہوا تو آپ کو ہماری کیفیت کا اندازہ ہو جانا چاہیے۔
 ہم نے سوچا کہ اگر ہم کراچی میں ہوتے تو سائرہ
 رضا کی طرح آپ کے آفس میں خود ہی آ جاتے۔ کیا
 ہماری کہانیاں موصول ہوئی ہیں؟
 راج: فرح اور سندس اشعار کی محفل میں خوش آمدید۔
 آپ کی کہانیاں موصول ہوگئی ہیں۔ ابھی پڑھی نہیں ہیں۔

ماہنامہ خاتون و اجنس اور ادارہ خاتون و اجنس کے تحت شائع ہونے والے سب سے پہلے شاعر اور ماہر شاعری کے ہونے والی ہر گھر کے
 حقوق ملیج و نکل سب کو ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی قسم کی اشاعت کے لیے ادارہ کو
 اور سلسلہ وار قسط کے کسی بھی طرح کے اشتغال سے پہلے پبلشر سے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ صورت دیگر ادارہ کو کوئی جملہ حق کا حق رکھتا ہے۔

جب تجھ سے لگا جوڑا ہے

عارف عثمان

(1) ”شادی کب ہوئی؟“

”میری شادی ستمبر 2013ء کو عید کے روز بعد ہوئی، پھر تو جیسے سادہ سی زندگی نے گویا بہاروں رنگ اڑھ لیے۔“

(2) ”شادی سے پہلے مشاغل و دلچسپیاں؟“

”میری شادی، تیس برس کی عمر میں ہوئی تو تب تعلیم کے علاوہ سارے مشاغل و دلچسپیاں بچکانہ ہی ہوا کرتی تھیں۔ میں بہنوں میں سب سے چھوٹی اور لاڈلی ہوا کرتی، تو کسی قسم کی روک ٹوک یا پابندی نہ تھی، بس بے لگاری تھی، ہاں جانوروں سے لگاؤ کے سبب شادی سے پہلے چکور پالنا پسند یہ ترین مشغلہ تھا، تاہم شادی کے بعد مصروفیات بڑھنے کے باوجود مور اور دوسرے پرندے پال کر اپنا یہ شوق پورا کرتی ہوں۔“

(3) ”رشتے میں مرضی شامل تھی یا بیڑوں کے فیصلے پر سر جھکا دیا؟“

”خیر مرضی کے بغیر تو یہ ممکن نہ تھا ہاں درحقیقت یہ بیڑوں کا فیصلہ تھا جس پر ہم نے خاموشی سے سر جھکا کر رضا مندی دے دی۔ جوڑ کی اپنی پسند کا ایک عدد جوڑا، اپنے کلاس کے سبکیٹ تک بیڑوں کی رائے کے بغیر نہ دیا۔ والدین کی کا اقتدار ہم فیصلے کرنے سے کہیں زیادہ تھا۔“

(4) ”پہلے سے جوڑا کا فیصلہ کیا تھا؟“

”ہاں! پہلے سے جوڑا کا فیصلہ کیا تھا۔ والدین نے ہمیں یہ بات بتائی تھی کہ تم دو بہنوں میں سے کسی سے شادی ہوگی۔“

(5) ”جوڑا کی عمر کتنی تھی؟“

”اس وقت وہ 22 سال کا تھا۔ والدین نے ہمیں یہ بات بتائی تھی کہ تم دو بہنوں میں سے کسی سے شادی ہوگی۔“

(6) ”جوڑا کی تعلیم کیا تھی؟“

”اس وقت وہ 22 سال کا تھا۔ والدین نے ہمیں یہ بات بتائی تھی کہ تم دو بہنوں میں سے کسی سے شادی ہوگی۔“

بدلتے پر ملک و قوم پر رونما ہوتی ہیں۔ وہی شادی کے بعد پھر چاہے لڑکی ایک کمرے سے اٹھ کر دوسرے میں ہی یاہ گھر چلی جائے بہر حال تبدیلی تو آ ہی جاتی ہے۔ تو مصروفیات (جو کہ پہلے بھی شخصیت کا خاصا

تھی) اب ایک ٹھنڈا، مزاج میں فرق کے باوجود ایک فیملی اور ان کی دلچسپیوں کا کسب کسب کرنا، اپنے مزاج اور سوچ کی تبدیلی سے لے کر ماں بننے کے بعد، بھی تبدیلیاں ہی تبدیلیاں، تبدیلی تو انسانی فطرت ہے۔ ورنہ ساکن تو جمیل بھی جو ہر بن جاتی ہے۔“

(11) ”شادی کے کتنے عرصے بعد کام سنبھلا؟“

”کچھ پکانی کے رسم کے فوراً بعد ہی، فیملی کی بڑی بہو ہونے کے ناتے فوراً ہی بڑے داری مجھے سونپ دی گئی اور پھر مہما کی تربیت اور سسرال والوں کے تعاون کے سبب تمام مراحل خوش اسلوبی سے ہو گئے۔“

(12) ”میکے اور سسرال کے کھانے پکانے کے انداز اور ذائقے مختلف محسوس ہوئے؟“

”کھانے پکانے کے انداز، ذائقے سب ہی تقریباً مختلف تھے، ہم مری ہیں اور مری بنیادی طور پر بکریوں کے شوقین ہوا کرتے ہیں۔ جبکہ میرے میکے (میرے میکے سسرال دونوں مری ہیں) میں یہ اہمیت و اہمیت کو حاصل ہے۔ تو بھی بہت فرق ہے وہ سادہ کھانے پکانے اور کھانے کے جلدی اور ہم ایسا کسی کے شوقین، تو اس حساب سے کافی مختلف پایا۔“

(13) ”سسرال سے وابستہ توقعات؟“

”ناہایا تا سسرال سے کوئی توقعات وابستہ نہیں کیں اور نہ ہی کرنا چاہئیں بلکہ کسی بھی انسان کو کسی دوسرے سے توقعات نہ رکھنی ہی نہیں چاہئیں بس اللہ جے توکل رکھنا چاہیے۔ وہی بہترین کار ساز ہے۔“

(14) ”بچوں کی پیدائش؟“

”شادی کے ایک سال بعد مقہوم کی پیدائش،

گو یا قدرت کا بہترین تقدس۔ تخلیق کا عمل اور بچوں کی پیدائش ایک مکھن مرحلہ ہے اور اس مرحلے سے گزر کر ہی تو عورت اس اعلیٰ مقام پر پہنچ جاتی ہے۔“

(15) ”جوائنٹ فیملی سسٹم یا علیحدہ رہنا؟“

”جوائنٹ فیملی سسٹم، اور شروع سے ہی ہر لڑکی کی طرح میری بھی یہی خواہش تھی کہ بھرپور اسرال اور بے تماشاجیت کرنے والے رشتے میں۔ تاہم وقت کے ساتھ انسان کی ترجیحات بدل جاتی ہیں۔ اپنے بچوں کی تربیت اور انہیں ایک ان ڈیپنڈنٹ زندگی گزارنے کے لیے بھیجی، جسی انسان کو بے شمار قربانیاں دینی پڑتی ہیں، ایک ایسا ماحول جہاں وہ اپنی غلطیوں سے سیکھے، اپنے حوصلے اور لگن سے ہر رکاوٹ عبور کر کے اپنی منزل پالے۔“

تو یہ کہنا کہ وقت کے ساتھ انسان بدل جاتا ہے یا اس کی ترجیحات تو بے جا نہ ہوگا۔

(16) ”سسرال کے ماحول کو تبدیل کرنے کی کوشش کی؟“

”تبدیلی وقت کا خاصا ہے تو جی مجھے ایسا کرنے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی اور آخر میں حالات سے انسان کو گھبراتا نہیں چاہیے، کیونکہ گپ اندھیرے کے بعد ہی سویرا ہوتا ہے۔ اور مشکلات کا کیا ہے یہ تو حالات سے نہیں بلکہ خیالات سے پیدا ہوتی ہیں تو مثبت سوچیں۔ کسی کی کا دل نہ دکھائیں اور ہمیشہ خوش رہیں۔“





مستریا

گہریمیا

تہ 400/- روپے

شمارہ نمبر

32735021 فون نمبر

سب سے پہلے تو میں گزارش کرتی ہوں کہ اس انٹرویو کو ضرور چھاپے گا اور جلد میری بیٹی انیلا طالب مجھ سے پوچھ پوچھ کر بڑے اصرار سے لکھ رہی ہے حالانکہ وہ بہت بیمار ہے۔ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ابھی رات کو اسے ڈرپ لگی تھی۔

میں نے اس سے کہا ”پتا نہیں شائع ہوگا یا نہیں؟“

پھر کیوں تم اتنی محنت کر رہی ہو؟“

اس نے بہت یقین اور اعتماد سے جواب دیا

ای جی، شعاع دوسروں سے بہت مختلف ہے وہ ضرور شائع کرے گا اور آپ دیکھ لیتا کیا پتا اگلے مہینے ہی آجائے۔“

اب دیکھیں شائع ہوتا ہے کہ نہیں۔

س: ”شادی کب ہوئی؟“

ج: ”23 مارچ 1997ء۔“

س: ”شادی سے پہلے کیا مشاغل تھے۔ شادی کے بعد کیا تبدیلی آئی؟“

ج: ”شادی سے پہلے میں فلمیں ڈرامے اور ڈائجسٹ کی بہت شوقین تھی، اخبار جہاں وغیرہ میں یا کہیں بھی چلی کہانیاں بہت شوق سے پڑھتی۔ والد کے ریڈیو پر سناتی دھرتی اور ترنجن پروگرام سننا بہن بھائیوں سے شرارتیں کرنا میرے مشاغل تھے۔ شادی کے بعد سب ہی تبدیل ہو گئے بلکہ رہے ہی نہ۔“

س: ”کیا شادی میں آپ کی مرضی شامل تھی؟“

ج: ”جی بالکل، میرے والد نے انتہائی مذہبی ہونے کے باوجود سب بچوں سے مرضی پوچھی پھر بیاہا۔“

..... اس لیے میری مرضی جان کے ہی شادی ہوئی۔“

س: ”جیون ساگی کے حوالے سے تصور؟“

ج: ”مجھ پوچھیں تو اتنی انجان عمر تھی تب ہی تو اثنا اندازہ نہیں تھا ویسے خواہش تھی کہ میرا جیون ساگی پینٹ کوٹ میں لمبوس ہاتھ میں بریف کیس تھا ہے

آفس جانے والا ہو، اچھا ہو، آفس جانے والا تو نہیں ملا لیکن اس سے بھی کہیں زیادہ عزت پاسے مل گیا جس کے لیے میں رب کی شکر گزار ہوں۔“

س: ”مکمل کتنا عرصہ رہی؟“

ج: ”تقریباً ایک برس۔“

س: ”شادی کے لیے کوئی قربانی دینا پڑی؟“

ج: ”نہیں جی بالکل تھی نہیں، بہت عمدگی اور عافیت سے انجام پائی۔“

س: ”شادی کی رسموں کے دوران لین دین کوئی جھگڑا؟“

ج: ”شکر الحمد للہ..... ایسا کچھ نہیں ہوا۔“

لڑائی جھگڑا نہیں ہوا۔“

س: ”شادی کے بعد شوہر نے پہلی بار دیکھا کیا کہا؟“

ج: ”میرے سرتاج اتنے سادہ ہیں کہ جن کے لیے یہی کہا جاسکتا ہے۔“

اس سادگی پر کون نہ مر جائے اسے خدا انہوں نے بھائیوں کے کاروبار کا پوچھا اور کہ پاپا کیا کرتے ہیں۔“

س: ”شادی کے بعد سسرال والوں کا رویہ کیا تھا؟“

ج: ”اچھا تھا مگر سسرال سسرال ہوتا ہے وہاں میکے والا رویہ تو نہیں ہوتا ناں..... پھر بھی محنت کی دل برداشتہ نہ ہوئی اور آہستہ آہستہ کچھ بہتر ہو گیا۔“

س: ”شادی کے کتنے عرصے بعد کا

سنبھالا؟“

ج: ”ڈیڑھ مہینے بعد میں نے کام سنبھالا۔“

کے معاملے میں میں اتنا ڈیڑھی گھر یعنی میکے بڑی باجی اور بھابھیاں تھیں۔ میں نے تو ایف اے

کتابیں ابھی لی ہی تھیں کہ شادی ہو گئی، کاموں کے

..... اس لیے میری مرضی جان کے ہی شادی ہوئی۔“

س: ”جیون ساگی کے حوالے سے تصور؟“

ج: ”مجھ پوچھیں تو اتنی انجان عمر تھی تب ہی تو

اثنا اندازہ نہیں تھا ویسے خواہش تھی کہ میرا جیون ساگی

پینٹ کوٹ میں لمبوس ہاتھ میں بریف کیس تھا ہے

..... اس لیے میری مرضی جان کے ہی شادی ہوئی۔“

س: ”جیون ساگی کے حوالے سے تصور؟“

ج: ”مجھ پوچھیں تو اتنی انجان عمر تھی تب ہی تو

اثنا اندازہ نہیں تھا ویسے خواہش تھی کہ میرا جیون ساگی

پینٹ کوٹ میں لمبوس ہاتھ میں بریف کیس تھا ہے

اب ہر دن خوبصورت

مکمل تحفظ مکمل تازگی



GIRL TALK

facebook.com/GirlTalkByButterfly

BREATHABLES



نعیمہ ناز

سچے سچے محبت کا

مخمل کے گاؤں سے ایک لگائے انہوں نے ابھی آنکھیں موندی ہی تھیں کہ ماریہ آ کر دم سے تخت پر بیٹھی۔ انہوں نے چونک کر ایک دم آنکھیں کھولیں۔
 ”کیا آفت ٹوٹ پڑی جو یوں بھانک بھاگ آ رہی ہیں شہزادی؟“ یہ ان کا مخصوص طنز یہ انداز تھا۔ جو فقط سب سے چھوٹی اور سب سے زیادہ لاڈلی پونی کے لیے مخصوص تھا۔
 ”وادی! شہزادی بہ برا وقت آنے والا ہے۔“ ماریہ بے چارگی کی جسم تصویر بن گئی۔
 ”کس کے دامن کے ہیرے موتی چرا لیے؟“ وادی سپردی ہوئیں۔
 ”اس سے بھی زیادہ جیتی۔“ وہ وادی کے نزدیک ہوئیں۔
 ”جتنے کی دال کا حلوہ تھانا، آخری دو تھیں بچے تھے، مانی بھائی کے لیے، ای نے رکھے تھے، وہ میں نے کھا لیے۔“ ماریہ کے آخری جملے میں پوری بات کا نچوڑ تھا۔

”آہا، گلے پر نہیں پڑتی تو بھی پڑ۔ موازبان کا بچہ راسی ختم نہیں ہوتا۔ ماں دو چار باتیں سنائے گی۔ اب بیٹھ کر سنا۔“ دادی نے تنبیہی لگا ہوں سے اسے دیکھا۔

”امی نے مانی بھائی کے لیے وہ حلوہ منگوایا ہے مجھ سے۔ ماریہ نے سچ لائن اب بیان کی تھی“

”ماں کو بتا دیجی کہ میں نے پیٹ میں ڈال لیا وہ حلوہ۔“

”بتانا آسان ہوتا تو کیا بات تھی۔ آپ کو معلوم تو ہے کہ وہ مانی بھائی کے معاملے میں کچھ زیادہ ہی ماں ہیں۔ ہر اچھی چیز میں سے ذیل حصہ ان کے لیے نکالتی ہیں۔“ اور اکثر اپنے منہ سے بھی انہیں ہی نکلا دیتی ہیں۔ اگلوٹا ہونے کا یہ مطلب تو نہیں کہ اولاد کے ناجائز لاڈ اٹھائے جائیں، کیوں دادی۔“ ماریہ نے ایک جذباتی مگر مختصر تقریر کی

”اللہ جانے بیٹا، یہ تمہاری ماں کے ہی چو نچلے ہیں، بیٹے کو اگلوٹا، اگلوٹا کر کے، جیٹلی کا چھالا بنایا ہوا ہے۔ ہمارا بھائی، سات، بہنوں کا ایک بھائی تھا۔ تمہارا باپ بھی تین بہنوں کا ایک بھائی، ہمارے والدین نے یا ہم نے تو بھی ایسے چو نچلے نہ کئے بیٹے کے۔ نہ ایسے اللہ آمین کر کے پالے۔“ دادی سیدھی ہونٹیں۔

”نانا نے اپنی بیٹی کو یہ نہیں سکھایا کہ ساری اولاد کے حقوق برابر ہوتے ہیں اور سب کو ایک ہی آنکھ سے دیکھنا چاہیے اور ایک ہی لاشی سے ہانکنا چاہیے، یہ تھوڑی کہ ایک کے لیے خنک کی چھڑی، دوسرے کے لیے نیم کی۔“

”تو بی بی اس میں تمہارے نانا بے چارے کا کیا قصور۔ اللہ بخشے وہ مرحوم تو تین میں نہ تیرہ میں، یہ تربیت کرنا تو ہماری جنت مکانی کا کام تھا۔“ دادی کو اپنے بھائی کی شان میں پوتی کا تھیرہ کچھنا گوار گزارا۔

”ماریہ، ماریہ۔“ ماریہ نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ امی کی آواز آئی جو اسے ہی پکار رہی تھیں۔ اس نے فوراً لب سمجھ لیے اور مدد طلب نظروں سے دادی کی طرف دیکھا۔

”مانی کے لیے جو حلوہ رکھا تھا، وہ کہاں ہے۔“ انہوں نے دادی کی تقریباً گود میں گھسی بیٹی کو گھورا، بیٹی کے چنور پن سے خوب واقف تھیں۔

”وہ مانی کے لیے رکھا تھا۔ مجھے کیا خبر تھی، میں نے کھالیا۔“ دادی بڑی مصوویت سے فوراً پوتی کی آڑ میں گھس گئیں جیسے کہ وہ ہمیشہ اسے بچاتی تھیں۔ آخر وہ اتنی امیدیں لے کر دادی کے پاس آئی تھی۔

”آپ کا بھی جواب نہیں ہے اماں! پرسوں ذرا سا کٹوا کھایا تھا تو پیٹ خراب ہو گیا اور اب پورے دو دن کھالے۔ طبیعت خراب ہوئی تو آپ کے بیٹے میری جان کھاتے ہیں کہ میں لاروائی دکھائی ہوں، آپ کو پرہیز نہیں کراتی، کھانے پینے کا دھیان نہیں رکھتی۔“ بہو صاحبہ جو خیر سے ان کی سچی سچی گھسی گھسی، جھجھلا گئیں۔

”اب مانی بیٹا انتظار کر رہا ہے۔ اس کا موڈ خراب ہوگا۔“ دادی، پوتی کی معنی خیز خاموشی پر وہ کچھ نگلی سے بڑبڑائیں۔

”تمہارے تو یا نہیں ہاتھ کا کھیل ہے یہ حلوے مانڈے بنانا، اور بنالینا، جس کے نصیب کا رزق تھا اس کے پیٹ میں گیا، بس ختم کرو معاملے کو۔“

”بھی تھا یا میں ہاتھ کا کھیل اماں، اب نہ وہ عمر ہی نہ صحت، اب کی بار حلوہ بنایا تو بھونٹتے بھونٹتے بازو اور کندھے سے شل ہو گئے، جنہ سے باقی کام کروایا ابھی تک درو گیا تھوڑی۔“ وہ بولتی ہوئی تھک پرک گئیں۔

”تو کچھ دوا دردتیں، تم تو شروع سے ہی لاپرواہ ہو اپنی صحت کے معاملے میں، جب کہ بزرگوں کا کہنا ہے کہ جان ہے تو جہاں ہے۔ صحت اچھی ہو تو سب کچھ اچھا لگتا ہے۔ انسان پوری دنیا کا بوجھ بھی اپنے کا نہ ہوں پہ

اٹھائے، ذرا سی کوئی تکلیف ہو تو اپنے آپ سے بھی سچے زاری ہونے لگتی ہے، تم ٹھیک ہو گی تو گھر اور گھر والوں کا دھیان رکھو گی نا۔ ساس کے لہجے میں اپنی عزیز از جان بیٹی، بہو کے لیے حد درجہ تشویش تھی جو وہ اکثر کھا کر کرتی تھیں۔

”تم ذرا جا کر مانی کو بتا دو کہ حلوہ ختم ہو گیا ہے، وہ وہاں بیٹھا انتظار میں سوکھ رہا ہے۔“ امی، ماریہ سے مخاطب ہوئیں

”میں نہیں جا رہی، وہ تو فوراً مجھے ہی بلیم کریں گے کہ تم نے ہی کھایا ہوگا۔“ ماریہ ہنوز دادی کے گھٹنے سے گلی بیٹھی تھی۔

”اگر وہ ایسا کچھ کہے گا تو غلط نہیں ہوگا، دونوں دادی پوتی کو اچھی طرح سمجھتی ہوں میں۔“ امی نے جتنا ہی ہوئی نظروں سے دونوں کو دیکھا، دادی کے چہرے پر بے ساختہ مسکراہٹ سی پھیل گئی، ماریہ کھانی ہو گئی۔

”بیٹھے، یہ یہاں ہیں، ہم وہاں دیدہ و زبان قریش راہ کیے بیٹھے ہیں اور آپ یہاں آ کر بیٹھ گئیں۔“ مانی انہیں ڈھونڈتا جھپٹے برآمدے میں ٹھیک جگہ آیا تھا۔

”دادی حضور، آپ کا تخت ہے یا کوہِ ندا، جو یہاں آتا ہے پھر واپس نہیں جاتا، یہیں کا ہو رہتا ہے۔“ مانی بڑے مزے سے بولتا ہوا خود بھی ان کے ساتھ لگ کر بیٹھ گیا۔

”ناشاء اللہ حیران ہوں سن کر، ہماری نئی تانخی (نسل) کوہِ ندا سے واقف ہے۔“ دادی مسکرائیں۔

”جس کی آپ جیسی دادی ہو، وہ ان سب سے واقف کیوں نہیں ہوگا، ہمارا تو بچپن ہی کہانیاں سننے گزارا ہے۔“ بیٹے کے سات دن، سات قسم کی کہانیاں، ایک دن اسلامی، ایک دن الف لیلا، ایک دن کلا سک، ایک دن جانوروں کی، ایک دن پرندوں کی۔

”ایک دن فلمیں بھی تو سنتے تھے۔“ ماریہ نے لقمہ دیا۔

”تم بہن بھائیوں کی شرافت بھی بیٹا جو آرام سے بیٹھ کر وہ سب سنتے تھے، اب تو ہم کسی بچے کو کہانی سنائیں تو اول تو نچلے بیٹھے ہی نہیں، بیٹھ بھی جائیں تو کہتے ہیں، موبائل پہ کہانیاں سنائیں، اس میں تصویر بھی آتی ہے، ہم تو بھی اب اپنا سامنے لے کر رہ جاتے ہیں۔“

”امی! میرا حلوہ۔“ مانی نے دہائی دی۔

”حلوہ ختم ہو گیا۔“ امی نے نرم لہجے میں مختصر آیت لائی۔

”ختم ہو گیا یا کر دیا، اس ملی نے کھایا ہوگا، میری جان کی دشمن، میری صحت کی دشمن۔“ مانی نے اس کی گھسی، چھوٹی سی پوتی نیل بیٹھی۔

”میں کیوں ہوئی، تمہاری جان کی دشمن، تم خود سب سے بڑے دشمن ہو اپنی صحت کے اور جان کے، نہ کھانے سے اتنے لوگ نہیں مرتے جتنے زیادہ کھانے سے مرتے ہیں، پیٹ، سدا کا بھوکا۔“ ماریہ نے ترنت حساب بے باقی کیا۔

”ہائیں ہائیں بیٹا! یہ کیا زبان استعمال کی، بھلا اس طرح بات کی جاتی ہے۔ مانی بیٹا، تم بھی ذرا شرافت کا دامن ہاتھ سے نہ ہی جانے دو تو بہتر ہے۔“ دادی نے دونوں کو تنبیہ کی۔

”اب تم دونوں یہاں سے اٹھو، مجھے اماں سے کچھ بات کرنی ہے۔“ امی نے دونوں کو وہاں سے بے دخل کا نوٹس جاری کیا۔ خلاف توقع بڑی شرافت سے اٹھ کر دونوں چل دیے۔

”ختمہ کے لیے جو رشہ ہم لوگ دیکھ کر آئے تھے، اسی کے بارے میں بات کرنی تھی۔“ وہ اپنی ساس سے

مخاطب ہوئیں۔

”اچھا ٹھیک ہے۔۔۔ میں آپ کے لیے کچھ بڑی بنا دوں گی۔“ عالیہ بیگم نرمی سے ہاں بھرتے ہوئے چل دیں۔

”کوئی میں آخری تین آٹھ بچے تھے۔ انہیں ہی ابائے کورکھ کر دہ بچن سے باہر آ گئیں۔

بچن بھی کیا تھا بس برآمدے کے ایک کونے میں ایک سلیب لگا کر چوہا فٹ کروا تھا اور دھیلیف جس میں سے پلاسٹک کے کچھ برتن، بھانڈے، کپ، پیالے اور المونیم کی دو چار پیلیاں تھیں۔ دل خوش کرنے یا بھلانے کو اس کونے کا نام بچن رکھ دیا گیا تھا۔

عائشہ کرسی پر پاؤں اوپر کر کے بیٹھ گئی۔ گھٹنوں پر سر رکھ کر کتنی دیر جگہ جگہ سے اکھڑے فرش کو دیکھنے کے بعد اس کی نظریں اپنے پیروں پر جا گئیں۔ چھٹی رنگت کے سحرے بے داغ پاؤں، اس کی سہیلیاں تو اس کے پیروں کے دیکھ کر ہی قدا ہوتی رہتی تھیں۔

”اللہ عائشہ تمہارے پیرکتے خوب صورت۔۔۔ ہیں۔ کیا مٹی کیوں، پیڑی کیوں کرواتی ہو۔“

”بچہ کیا، عائشہ تو خود ہی جسم خوب صورت ہے۔ چہرہ دیکھو، ہاتھ دیکھو۔“ دوسری بھرہ کرنی۔

”عائشہ کے تو سارے کزن اسی پر مرتے ہوں گے، کیوں عائشہ۔“ یہ سہرہ بھی جسے کزن فوہیا تھا۔

”سن۔۔۔ نہیں۔۔۔ پتا نہیں میرے کوئی کزن ہیں ہی نہیں۔“ عائشہ کچھ بولکھلا کر وضاحت دیتی۔

”کیا مطلب۔ تمہارے کوئی کزن ہی نہیں۔“ وہ سب حیرت سے چلا آئیں۔

”چچا، تاپا، خالہ، ماموں، چچو بھی، کیا سب بے اولاد ہیں خدا نخواستہ۔“

”میری صرف ایک ہی خالہ ہیں اور ان کے دو بچے، فہد بھائی کا صرف نام سنا ہے یا تصویریں دیکھی ہیں، وہ بہت چھوٹے تھے جب اپنے پاپا کے ساتھ امریکا چلے گئے تھے۔ ایک، دو بار شاید آئے تھے پاکستان، مگر ہمارے گھر بھی نہیں آئے اور عزیزہ ہے خالہ کی چھوٹی بیٹی، بس یہی دو کزن ہیں میرے۔“ کالج میں بننے والی اپنی اپنی سہیلیوں کے سامنے وہ دھیرے سے اپنی کتاب زندگی کا کوئی ورق پلٹ دیتی۔ سادہ مزاج، معصوم سی عائشہ، دھیمے سے بولتی تو اور بھی دل میں اترتی چلی جاتی۔

”تو تمہارے کوئی رشتے داری نہیں ہیں۔“ سمیرا کی آنکھیں حیرت سے بچھنے کے قریب ہو جاتیں۔ وہ خود جس تین منزلہ گھر میں رہتی تھی وہاں جوائنٹ میبل سسٹم تھا۔ کل ملا کر ماشاء اللہ پچیس افراد تھے گھر کے۔ وہ چھوٹی سی مٹی تو یہی تھی کہ ہر گھر کی آبادی اتنی ہی ہوتی ہے۔

ایک بار ایک رشتے دار کے گھر گئی، جہاں میاں، بیوی اور دو بچوں پر مشتمل خوش حال گھرانہ تھا تو کافی دیر ادھر ادھر دیکھنے کے بعد اس نے بڑی معصومیت سے سوال کیا کہ۔۔۔

”گھر کے باقی سب لوگ کہاں ہیں۔“ اب غیر سے محترمہ کالج میں پہنچ گئی تھیں مگر محفل اب تک وہیں کہیں بچپن کے کسی بھروسے میں ہی کھڑی ہوئی تھی۔

”اللہ عائشہ! تم کتنی لگی ہو۔ اکیلے گھر میں بڑے مزے سے رہتی ہوگی۔“

”مزے۔۔۔“ عائشہ نے بے جا رگی سے اسے دیکھا۔ یہ تو وہی جانتی تھی کہ وہ کتنے مزے میں تھی۔

”عائشہ! منزہ! مٹی کا سوٹ دے آئیں بیٹا، اور ان سے سلائی کے پیسے بھی لے آنا۔“ امی نے اس کا ارتکا زوڑا۔

”بھیا کو بیچ دیجیے گا امی! میں نہیں جا رہی ان کے گھر۔“ عائشہ نے بے زاری سے جواب دیا۔

”کیوں۔“ امی نے چونک کر اسے دیکھا۔

”ہاں، کیا ہوا؟ سوچا پھر۔“ دادی متوجہ ہوئیں۔

”دہلی سے بڑے بھائی صاحب کا فون آیا تھا، انہوں نے چھان بین کروائی تھی، پیچھے سے یہ لوگ تو دہلی کے ہی گمراہیے کوئی خاندانی بھی نہیں، جیسا کہ بیان کر رہے تھے۔ ضیاء الدین صاحب کی دادی کی بہن خیارن تھیں، نوکر اس پر اٹھائے گھر گھر چوڑیاں بچتی تھیں، پاکستان آ کر تعلیم اور روپے پیسے کا منہ دیکھا۔

”پھر کیا فیصلہ کیا تم نے؟“ دادی نے ایک گہری سانس لے کر یوں ہی پوچھ لیا، وگرنہ یہ بیگم کے مزاج سے تو خوب واقف تھیں کہ اب تو صاف انکار ہی ہوتا ہے۔

اس دور میں جب لوگوں کی اکثریت اولاد کے لیے بڑھ چڑھتے وقت دولت مندی اور صاحب حیثیت ہونے کو ترجیح دیتے تھے، عالیہ بیگم صرف اور صرف خاندانی ہونے کی شرط لگائے بیٹھی تھیں، ان کا کہنا تھا کہ آج کل دولت مند لوگ زیادہ ہیں اور خاندانی کم، پسہ آنے سے ذات نہیں بدل جاتی، وہ تو اپنے بزرگوں کے کہنے پر دل و جان سے یقین رکھتی تھیں کہ اصل سے خطا نہیں، کم اصل سے وفا نہیں۔

وہ بڑی بیٹی حنہ کے لیے رشتے دیکھ رہی تھیں، بے شک غریب ہوں مگر ہوں خاندانی، پسہ کیا کیا جاسکتا ہے، خاندان اور ذات نہیں، عالیہ بیگم مغرور نہیں تھیں، نہ ہی خاندانی برتری یا بڑائی کے زعم میں جھلا تھیں، بس ان کا مزاج اور سوچ کچھ اس قسم کی تھی کہ وہ سب سے پہلے خاندانی شرافت کو معیار بناتے ہوئے تھیں۔

”میرا تو دل نہیں ٹھکتا، سچی بات ہے۔ آپ کے بیٹے صاحب نے، آپ پہ اور مجھ پہ معاملہ چھوڑ دیا ہے۔“ عالیہ بیگم کہنے لگیں۔

”بھئی لیکن بیگم! تم تو اچھی طرح جانتی ہو کہ شروع سے ہی ہمارے کیا اصول رہے ہیں، جن پر ہم کار بند ہیں۔ اپنی اولاد کے ہر معاملے میں تم میاں بیوی خود مختار ہو، جو چاہے فیصلہ کرو، ہم تو بس ان کی اچھی تربیت میں تمہارے معاون و مددگار ہیں اور اگر کوئی مشورہ چاہیے تو حاضر ہیں۔ رشتوں ناتوں کے معاملے میں ہمارا مشورہ تو یہی ہے کہ دین داری اور شرافت کو ترجیح دو، باقی سب فروعات ہیں۔“

”اماں! ہم بھی یہی چاہتے ہیں، نجابت اور شرافت کے لیے ہی اچھے خاندانی گھرانوں کی تلاش میں ہیں جہاں تک دین داری کا معاملہ ہے، تو اللہ معاف کرے، بعض طبقوں نے دین، دین داری اور مٹی افراد کو اتنا متنازعہ اور بدنام کر دیا ہے کہ کچھ مجھ میں نہیں آتا، کون صحیح ہے، کون غلط، اسے فرتے، اسے مسلک، ہر ایک نے اپنی الگ ڈیڑھ ہائینٹ کی مسجد قائم کی ہوئی ہے اور پھر امر امر کہہ کر فقط ہم صحیح ہیں، دوسرے غلط ہیں، کس کی دین داری پہ شک کریں، کس کی دین داری پر یقین کریں ہم تو بری طرح کنفیوز ہیں۔“ عالیہ بیگم نے رخ نیچا کر بیان کی۔

”بیٹا، حالات جتنے بھی برے ہوں، انہیں نہ کہیں روشنی کی کرن ضرور موجود ہوتی ہے، اپنا دل صاف ہونا چاہیے۔ نیت صاف منزل آسان، اللہ شاء اللہ اللہ خیر کرے گا، جس رشتے پہ تمہارا دل ٹھکے، استعارہ کر کے فیصلہ کر لیتا۔“

”جی اماں! ایسا ہی کروں گی۔“ عالیہ بیگم ایک گہری سانس لے کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔ ”میں ذرا شام کے کھانے کا دیکھ لوں۔“

”بھئی جو بھی پکاؤ، ہمارے لیے تھوڑی سی سوگ کی دال کی کچھ بڑی بنا دینا، دو چہرہ مار یہی باتوں میں آ کر ایک پانی پوری کھالی، اوپر سے کھٹا پانی آبل مجھے مارا تو! جب سے ہی پیٹ میں آگ سی لگی ہوئی ہے، مرج مسالے والا کوئی سالن تو ہم سے ہرگز نہ کھانا جائے گا۔“

”بس بونہی، سلائی کے پیسوں پر اتنی بحث کرتی ہیں، اتنے لے لو، اتنے لے لو، جب ایک بار ریٹ بتا دیے ہیں تو پھر بار بار کم کروانے کی کیا تنگ ہے اتنی ڈیرا تنگ کروانی ہیں کپڑوں میں اور جتنا معاوضہ ہمیں تین سوٹوں کا دیتی ہیں، درزی تو اس رقم میں ان کا ایک ہی سوٹ سے گا۔“

”لوگ اس کو مارتے ہیں عاشر! جو پہلے سے ادھ موا ہو، بہت سے لوگوں کا یہی دتیرہ ہوتا ہے، دوسرے کی مجبور یوں سے فائدہ اٹھانا۔ ہماری محنت اور ایمان داری اللہ کو کھیر رہا ہے، رائیگاں نہیں جائے گی، اس قدر تو رات گئے گھر واپس آئے گا۔ اس وقت کسی کے گھر بھیجنا مناسب نہیں، تم ہی چلی جاؤ، کچھ رقم ہاتھ آ جائے تو احمد کے آنے پر سودا سلف متکوالوں، سارا راشن ختم ہے اور ہاتھ بالکل خالی۔“ امی نے آخری جملوں میں جیسے خود کھائی کی۔ ”اچھا، چلی جاتی ہوں۔“ عاشر ایک گہری سانس لے کر اٹھ کھڑی ہوئی، کالی چادر سر پہ اچھی طرح بھا کر خود کو لپیٹا اور دو گھر چھوڑ کر منزہ آنٹی کے گھر پر دستک دے کر کھڑی ہو گئی۔

”اللہ کرے، ان کا بیٹا گھر پر نہ ہو۔“ اس نے دل ہی دل میں دعا کی، مگر یہ وقت قبولیت نہیں تھا۔ دروازہ اسی ”اصل وجہ“ نے کھولا جس کی وجہ سے وہ یہاں آنے سے گریزاں تھی۔ منزہ آنٹی کا بیٹا ایاز، بظاہر وہ کہتا کچھ نہیں تھا مگر اس کی نظر میں۔ عاشر کو جیسے اندر تک دیکھ لینے کی خواہش مند تھیں۔

”آنٹی کو بلوادیں۔“ عاشر نے اپنا منہ نیچے کر لیا۔ ”اندر آ جائیں۔“ وہ دروازہ کھلا چھوڑ کر ایک طرف ہو گیا۔

”نہیں۔ آپ آنٹی کو بلوادیں۔“ عاشر ایک انچ آگے نہ بڑھی، وہیں ڈٹی رہی، امی کے پڑھائے ہوئے بہت سے اسباق میں سے ایک سبق یہ بھی تھا کہ جب تک خاتون خانہ کی گھر یہ موجودگی کا یکاظم نہ ہو، کسی کے گھر کے اندر داخل مت ہو، وہ اپنے بچپن سے محلے کے کئی گھروں میں کپڑے دینے آ رہی تھی اور اسی اصول پر کار بند تھی۔

”کیا بات ہے۔ کون ہے۔“ منزہ آنٹی خود ہی دروازے پر آ گئیں۔ ”السلام علیکم آنٹی، امی نے آپ کے کپڑے بھجوائے ہیں اور پیسے منگوائے ہیں۔“ عاشر شجیدگی سے ان سے مخاطب ہوئی۔

”اچھا!“ انہوں نے کپڑوں کا شاپر اس کے ہاتھ سے لیا۔ ”اندر آ جاؤ۔“

”نہیں آنٹی شکریہ۔ میں جلدی میں ہوں۔“

”اچھا، روکو، میں پیسے لاتی ہوں۔“ وہ شاپر لے کر مڑیں اور بیٹے سے ٹکرا گئیں جو کسی بت کی مانند ابھی تک وہیں ایستادہ تھا۔

”تم تو اندر جاؤ، یہاں کیوں کھڑے ہو گئے۔“ وہ بیٹے پہ جھنجھلائیں۔

وہ خفیف سا ہو کر اندر کی جانب بڑھا اور پیچھے پیچھے منزہ آنٹی، واپس آ کر پانچ سو کا نوٹ انہوں نے عاشر کے ہاتھ میں تھا۔

”امی سے کہنا، ابھی یہ رکھ لیں، باقی حساب بعد میں کر دوں گی۔“

کروٹے کی ٹوپی سر پر ٹھیک کرتے ہوئے وہ مسجد کے دروازے سے نکل رہے تھے۔ ساتھ ساتھ عالمگیر صاحب تھے۔

”سید صاحب! آپ نے کچھ خبر سنی کبھی والوں کی۔“ وہ مسجد کبھی کے بارے میں استفسار کر رہے تھے

”کیسی خبر۔“ ”بیچ گرتے ہوئے دانے ایک لمحے کو رک۔“

”اڑتی اڑتی سنی ہے کہ اس بار صدارت کا منصب آپ کو دینے کا سوچا جا رہا ہے۔“ انہوں نے خبر بریک کی۔

”میں؟ مسجد کبھی کا صدر۔ اللہ اکبر! بڑی بھاری ذمہ داری ہے۔“ سید صاحب نے عالمگیر صاحب کو دیکھا

”ہاں بھئی! ہے تو کائناتوں کا تاج مگر پھر بھی کوئی یہ تاج پہننے سے انکار نہیں کرتا۔“ وہ ہنس کر گویا ہوئے

سید صاحب نے کوئی جواب نہیں دیا، خاموشی سے بیچ پڑھتے رہے، یہاں تک کہ گھر آ گیا۔ کریم کلر کا عین بجاتے ہوئے ان کا ذہن مسجد کبھی اور صدارت کے منصب کے بارے میں ہی سوچا رہا۔

دروازہ نالکہ نے کھولا، وہ شادی شدہ تھی۔ شوہر سے لڑ چکے تھے کیسے آئی ہوئی تھی۔ اس نے کھانے کا پوچھا۔

”نہیں، ابھی نہیں۔ بعد میں کھاؤں گا۔“ انہوں نے اپنی بیٹی کی طرف دیکھے بغیر جواب دیا۔

وہ ہو بہو اپنی ماں کی تصویر تھی، وہی صاف ستھری رنگت، دلکش نقوش، دل آویز سراپا وہ جب بھی نالکہ کو دیکھتے جانے کیا کیا کچھ یاد آ کر رہ جاتا۔

”سرمد کا فون آیا؟“ انہوں نے نالکہ کے شوہر کی بابت پوچھا۔

”ہاں، آیا تھا فون، شام میں آنے کا کہہ رہا تھا میں نے سوچ کر دیا۔“

نالکہ کا حکمانہ انداز بھی انہیں اپنی بیوی کی یاد دلاتا تھا۔ وہ بھی اسی طرح بات کرتی تھی کہ بس میری بات ہی حرف آخر ہے۔ وہی عادت، مزاج نالکہ کے تھے۔

”کیوں سوچ کر دیا۔“ چشمہ اتار کر انہوں نے دونوں آنکھیں مسلیں۔

”کم سے کم آپ تو یہ سوال مت پوچھیں۔ اس شخص کے پاس ہے ہی کیا، نہ ذہن کا کھانا پینا ہے نہ پہننا اوڑھنا، اپنے جیسے مولوی سے بیاہ دیا۔ ہر وقت صبر اور قناعت کی چادر اوڑھے رہو۔“ وہ جھنجھلا کر باپ پر غی برس پڑی۔

”لڑکا بخنتی ہے، آج آمدنی کم ہے، کل زیادہ ہو جائے گی، کچھ عرصے برداشت کر لو اگر کوئی کمی بیشی ہے تو۔“ سید صاحب محل سے گویا ہوئے۔

”مجھ سے نہیں ہوتا برداشت و رداشت۔ اس سے کہہ دیں، جب آمدنی زیادہ ہو جائے تو آ کر لے جائے مجھے۔ موجودہ تنخواہ میں گزرا رہا نہیں ہے میرا آدمی سے زیادہ تنخواہ تو گھر کے کرائے اور بجلی، گیس کے بلوں میں چلی جاتی ہے، بچتا کیا ہے، خاک۔ اسی کو بچاؤ لو اسی کو بچاؤ لو، نالکہ تنہا ہی ہوئی اندر چلی گئی۔“

”غلطی شاید مجھ سے ہی ہوگی، لڑکے کی شرافت دیکھ کر رشہ کر دیا۔ بانی معاملات نظر انداز کر دیے۔“ انہوں نے تاسف سے سوچا۔

ادھر بیٹی تھی، اپنی خواہشات اور تمناؤں پر سمجھوتا نہ کرنے والی، شادی کو چھ ماہ بھی نہ گزرے تھے کہ لڑائی جھگڑے شروع ہو گئے، جس میں سرمد سے زیادہ ہاتھ نالکہ کا تھا۔

اس بار بھی اسے پورے دو دنے ہو گئے تھے گھر آئے ہوئے، سرمد لینے آتا، فون کرتا، مگر وہ کسی طور جانے پہ

راضی نہ تھی۔

”دنیا کما کھار ہی ہے، عیش کر رہی ہے، یہ بھی کوئی ڈھنگ کا کام نہیں ڈھونڈ سکتا جس میں چار پیسے زیادہ ملیں۔“ باپ کے سمجھانے پر اس نے ان سے سوال کیا۔

”نوکریاں اور وہ بھی اچھی تنخواہوں والی نوکریاں درختوں پر نہیں اگتیں، بڑے باپڑ بیٹے پڑتے ہیں اس کے لیے۔“ سید صاحب نے کچھ غصے اور کچھ طنز میں جواب دیا تھا۔

”تو میں نے کہا تھا ایسے فقیر سے رشتہ کرنے کے لیے، کوئی اور کمانے کھانے والا نہ ملا۔“ نائلہ بھی چیخ مچ کر خوب رو بہ وجواب دیتی۔

وہ بھی بھلا کیا کرتی آئینے کے سامنے کھڑی ہوتی تو وہ کہتا کہ اسے تو کسی ریاست کی راجکمار، کسی سلطنت کی ملکہ ہونا چاہیے تھا مگر وہ تو معاشی دیو کے شکبے میں آن پھنسی تھی۔ باپ تول کے گن گن کے خرچ کرنا اس کے شانہ مزاج کے لیے بہت سخت تازیانہ تھا۔ آئے دن میاں سے لڑ جھگڑ کر سیکے کارخ کر لیتی مگر مسئلہ بلکہ مسائل اپنی جگہ جوں کے توں تھے۔

اپنی مخصوص کرسی پر بیٹھ کر سید صاحب بیچ کے دانے گراتے ہوئے کسی گہری سوچ میں گم تھے۔ اپنی طرف سے تو بہت سنبھل سنبھل کر، احتیاط کے ساتھ دونوں بچوں کو پالا تھا۔ تربیت میں کوئی کسر نہ چھوڑی مگر نائلہ تو بچپن سے ہی جیسے چٹنا کھڑا تھی، جو بھی اچھے اخلاق و آداب وہ سکھانے کی کوشش کرتے، ہوند کی طرح اس کھڑے پر سے پھسل کر نیچے آن گرتے، جتنی بھی کر کے دیکھی اور زہی بھی مگر نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔

اس کے لیے، انہوں نے بہت سوچ سمجھ کر سر مد کا انتخاب کیا تھا۔ ان کے پردیسی عالمگیر صاحب کا دور پرے کا رشتے دار تھا۔ ماں باپ فوت ہو چکے تھے، بہن بھائی کوئی نہ تھیں، کچھ رشتے دار تھے جو سر مد کی کم مائیگی کی وجہ سے کنارہ کشی کیے بیٹھے تھے، اپنے بل بوتے پر جیسے تیسے اتر کر کے وہ کسی کمپنی میں ملازم تھا عالمگیر صاحب کے توسط سے یہ رشتہ طے ہوا تھا۔ سر مد واقعی ایک شریف انسان اور کسی حد تک سیدھا سادہ انسان تھا۔ سید صاحب کو اپنی مزاج دار بیٹی کے لیے اس سے اچھا شوہر ماننا مشکل تھا۔

نائلہ کے لیے رشتہ بہت آئے تھے مگر وہ کسی بھرے پرے خاندان میں اسے بیاہنا نہیں چاہتے تھے۔ مگر اب انہیں محسوس ہو رہا تھا کہ ان کی ساری کاوشیں بے کار ہیں، خواہشات کا منہ زور دیا تھا جو ان کی بیٹی کو بہائے لے جا رہا تھا، زندگی کے اس موڑ پر اس کے قدم ٹک کر رہی نہیں دے رہے تھے۔

”پتا نہیں، لڑکی کیا کرے گی۔“ انہوں نے بے بسی سے سامنے دیوار پر لگے طغروں پر نظریں جمائیں۔

”یا اللہ تیرا ہی آسرا ہے۔“ انہیں یکایک بہت خوف محسوس ہونے لگا تھا۔

جس ڈر کو وہ بہت پیچھے چھوڑ آئے تھے وہ جیسے اچانک ان کے سامنے آنے کی تیاری کر رہا تھا۔

☆☆☆

”لا تھو اور جھڑپوں بھرے چہرے والا وہ نحیف و نزار و جوہر بستر پر جیسے کسی لاش کی مانند پڑا ہوا تھا۔ جت حالت میں لیٹے ہوئے ان کی بڑی بڑی آنکھیں چھٹ تک رہی تھیں۔ ان آنکھوں میں ویرانی تھی تھی اور انتظار بھی، برسوں گزر گئے تھے مگر ان ویران آنکھوں کا انتظار ابھی تک ٹھہرا ہوا تھا۔

”اماں! کچھڑی کھائی نہیں تم نے، ٹھنڈی ہوگئی یہ تو۔“ مہک — کمرے میں آئی تو جھنجھلا گئی۔ ان کے لیے

کچھڑی کی پلیٹ جیسے رکھ رکھی تھی، وہ یسے ہی جوں کی توں رکھی تھی۔ ایک لقمہ بھی تو نہ لیا تھا انہوں نے۔

”میں تو آئی تھی دوانی دینے، مگر تم نے تو ابھی کھانا ہی نہیں کھایا، اللہ جانے یوں لپٹ لپٹی کیا سوچتی رہتی ہو۔“

چلو اٹھو، دو چار نوالے تو کھا لو۔“

”بھوک نہیں لگ رہی۔“ وہ کزوری آواز میں بولیں۔

”جہمیں تو کچھ بھی نہیں لگتا، نہ بھوک نہ پیاس، نہ سردی، نہ گرمی، مگر ہمیں تو اور بھی کئی کام ہوتے ہیں کیا تمہارے کھٹنے سے لگ کر بیٹھے رہیں ہر وقت۔“ مہک کی برہمی بتدریج بد مزاجی میں ڈھل رہی تھی۔

”جاؤ، دفع ہو جاؤ، نہیں کھائی، نہ کچھڑی نہ دوائی۔“ بوڑھی عورت نے سر ہانے رکھی تپائی پر غصے میں ایک ہاتھ مارا، کچھڑی کی پلیٹ الٹ کر نیچے جا گری۔

”اوئی ماں! پھر وہی حرکت، کچھ زیادہ ہی شصیا مٹی ہے بڑھیا، وہ کبیتہ، سالا خود تو دفع ہو گیا یہاں سے، اپنی مصیبت ہمارے سر ڈال گیا، بلائی ہوں خالہ کو دیکھی آ کر سنبھالیں گے تمہیں۔“ مہک غصے میں بڑبڑاتی ہوئی کمرے سے باہر نکل۔

”کیا ہوا باجی! اتنے غصے میں کیوں ہو۔“ تارا نے اچانک ہی اس کا راستہ روکا تھا۔ جدید فیشن کا لباس، میک اپ سے لپا پتا چہرہ، ٹھکری ہوئی زلفیں، اپنے پچیلے لیوں کو وہ اور بھی لچکا کر، مہک سے مخاطب تھا۔

”بڑے ہٹ مرن جوگا، جب دیکھو، راستہ روک کر کھڑا ہو جاتا ہے۔“ مہک جان نے ایک ہاتھ مار کر اسے ایک طرف کیا۔

”اللہ قسم باجی! پرس بالکل خالی پڑا ہے، ایک سو کا نوٹ دے دو، کل پرسوں واپس کر دوں گی۔“ وہ بڑی لجاجت سے مہک سے مخاطب ہوا۔

”تیری، نہ کل بھی آئی ہے، نہ پرسوں، جیسے میں جانتی نہیں ہوں تجھے۔“ مہک نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

”تمہاری جان کی قسم باجی! دو دن سے اس بڑھیا کے ہاتھ کے بنے بد ذائقہ کھانے کھا رہی ہوں، پتلے شوربے کھا کھا کر میری اپنی حالت پتلی ہوگئی ہے۔ وہ بتلے یا سودخور نہیں کا، اس نے بھی بریائی ادھار دینے سے منع کر دیا، کہنے لگا جب جیب میں پیسے ہوں تب ادھر کا رخ کرنا۔ ہاں۔“ تارا نے منہ بسور بسور کے داستان غم سنائی۔

”وہی تو ہے بڑا کبیز، جیب سے پیسے نکلا کر ہی دم لیتا ہے۔“ مہک جان کا ہاتھ اسے گریبان کی طرف بڑھا، ہاتھ واپس آیا تو اس میں سیاہ رنگ کا بوا تھا۔ وہ بوا کھول رہی تھی، بنار کی لچائی ہوئی نظریں بنوے پر تھیں اور زبان فراتے سے شروع ہوئی۔

”اللہ تجھے خوش رکھے۔ باجی، تیرے بچے جیتے رہیں، تیرا سہاگ سلامت رہے، تا قیامت رہے، اللہ تجھے۔“

”بکواس بند کرے گا یا نہیں۔“ سہاگ کے تا قیام سلامت رہنے کی دعا سن کر مہک جان کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔

”ہونہ، سہاگ، جوتے کھانے لائق سہاگ۔“ اس کے منہ میں جیسے کڑوا زہر گھل گیا۔

”اچھا، اچھا، معاف کر دے باجی! میری تو بس یہی دعا ہے کہ اللہ تیری ہر مراد پوری کرے۔“ تارا اس کے خراب موڈ سے ہم کزور لپا جت سے مخاطب ہوا۔

”اچھا بات سن! خالہ کے پاس جا، ان سے کہنا کہ بڑی بی بی کھانا نہیں کھایا۔ ذرا دیکھ لیں انہیں اور وہ جیٹا

کماری سے بول، بڑی بی کا کمرہ صاف کروے، میں ذرا بچوں کو دیکھ لوں۔“

مہک جان اسے ہدایات دے کر چلتی بنی۔

کارپڈور کے آخری سرے پر بڑا سا بال تھا، قل آواز میں میوزک سسٹم آن تھا، لڑکیاں ڈانس کی پریکٹس کر رہی تھیں، وہ اپنی مخصوص جگہ پر جا کر بیٹھی۔ کچھ دیر لڑکیوں کا جائزہ لیتی رہی، خاص طور پر سنی کا پھر بالا آخر اسے آواز دے ہی ڈالی۔

”ادھر آ سنی!“ اس کی آواز اتنی بلند اور پاٹ دار تھی کہ میوزک کے بے پناہ شور میں بھی سب تک بخوبی پہنچ گئی۔

”جی ہاں۔“ اس نے چہرہ سامنے کیا، وہ کچھ ہانپ رہی تھی، گوری رنگت، تھمتا چہرہ۔

”ہیو دن بدن سوختی کیوں جا رہی ہے۔“ ہانسی نے سر سے پاؤں تک اسے گھورا۔

”ٹھیک تو ہوں، کہاں سے سوکھ رہی ہوں۔“ سنی نے لاسر ڈالی سے کندھے اچکائے۔

”کیا خاک ٹھیک ہے۔ ایسا لگ رہا ہے جیسے کسی فیشن شو یا فیشن میگزین میں ماڈلنگ کرے گی ادھر سے ہڈیاں نکلی ہوئیں، ادھر سے ہڈیاں نکلی ہوئیں۔ موٹی عقل کی بانس، یہاں لوگ آتے ہیں نا، انہیں لڑکی چاہیے ہوتی ہے لکڑی نہیں۔ میں نے تجھ سے کہا تھا نا کہ روزانہ کیلے اور سیب کھا کر دودھ پیا کر۔“ مہک جان کڑے تیوروں کے ساتھ اس سے مخاطب تھی۔

”پھل تو کھا لیتی ہوں باجی! مگر دودھ نہیں پیا جاتا مجھ سے، اچھا نہیں لگتا الٹی آتی ہے۔“ سنی نے ٹھٹک کر کہا۔

”ابھی کرواؤں تجھ سے الٹیاں۔ بہت پر کل رہے ہیں تیرے۔“ مہک نے اسی طرح پاٹ دار آواز میں اسے گھر کا۔ قریب موجود رقص کرتی لڑکیاں بھی کھی کھی کرتے لگیں، سنی کھیانی ہو گئی۔

”ناک بند کر کے دودھ کا گلاس چڑھا جایا کر، ناغہ نہیں ہونا چاہیے، ورنہ پھر جانتی ہے تو مجھے۔“ مہک جان نے نرم لہجے میں بولتے ہوئے دھمکی بھی دے ڈالی۔

”چل جا، کام کر اپنا۔“ سنی واپس جا کر دوبارہ لڑکیوں کے ساتھ مصروف ہو گئی۔

”چنبیلی نظر نہیں آ رہی۔“ مہک جان نے ساری لڑکیوں کو باری باری غور سے دیکھا۔

”لو، وہ آگئی۔“ کسی کے جواب دینے سے پہلے ہی چنبیلی کمرے میں داخل ہوئی تھی۔

”تو کہاں تھی؟“

”بہری بوا کے ساتھ ایٹن بنوا رہی تھی اپنے لیے۔“ چنبیلی آ کر مہک جان کے پاس بیٹھ گئی۔ وہ اپنی اسکن کے معاملے میں بہت حساس تھی۔

”بہری بوا برسوں سے یہاں کی عورتوں، لڑکیوں کے لیے ایٹن بنا رہی تھیں، اب پچھلے چند سالوں سے یہ رواج کچھ کم ہوا تھا کہ کئی سلسلنت نی ایپورنٹز کریوں اور لوشنوں سے ہی اپنا کام چلا رہی تھی مگر چنبیلی اپنی اسکن کے معاملے میں کوئی سمجھتا نہیں کرتی تھی، اس نے خاص طور پر بہری بوا سے فرمائش کر کے ایٹن کا تہہ لکھوایا، تمام اشیاء منگوا کر اسے خود بیٹھ کر ان کے ساتھ بنوایا۔ تب ہی وہ آج اپنی ڈانس پریکٹس میں بھی لیٹ ہو گئی تھی۔

”ایٹن۔“ بیگم جان نے اپنے مخصوص انداز میں ابرو چڑھا کر اس نے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ ”کیا بارات چڑھ رہی ہے چنبیلی بیگم کی۔“

”دوہلا تو روز آتے ہیں یہاں، مگر بازار میں ہمارے نصیب میں کہاں۔“ چنبیلی کی ہنسی میں بڑا کرب چھپا

تھا۔ مہک جان کے کچھ کہنے سے پہلے ہی وہ ڈانس کے لیے کھڑی ہو گئی۔

ایسی جان بڑی بی کے کمرے میں موجود تھیں، مینا کماری نے نیچے گری ہوئی کچھڑی اٹھا کر فرش صاف کر دیا تھا، اب امی کے حکم کے مطابق دوبارہ کچھڑی گرم کر کے لائی گئی۔

”چلو آ پانٹھو شاہاش۔ دو چار نوالے تو کھاؤ، ایسے فائے کر کے کیا اپنی جان دوگی۔“ انہوں نے بڑی بی کو سہارا دے کر اٹھایا۔ اور نیچے پیچھے لگا کر آرام سے بٹھا دیا اور پھر ایک ایک کچھ کچھڑی اپنے ہاتھ سے انہیں کھلانے لگیں۔

”بھوک نہیں لگتی مجھے۔“ بڑی بی نے دو چار نوالے کھا کر جیسے بے بسی سے اٹھ کر کہا۔

”ای کٹر صاحب سے بھوک لگانے کا شربت لکھوا کر منگوا لوں گی، وہ پیتا پھر خوب بھوک لگے گی۔“ انہوں نے دو چار اور ادھر ادھر کی باتیں کر کے پیٹ صاف کر دی۔ پانی پلایا اور خالی برتن مینا کماری کے حوالے کیے۔

”کچھ پتا چلا۔“ پچھلے چند سال سے روزانہ وہ یہی ایک سوال کرتی تھیں اور پچھلے چند سالوں سے ہر بار اس کا جواب سن کر وہ گہری چپ سادھ لیتی تھیں۔

”پتا چل جاتا تو ہاتھ پاؤں بندھوا کر، سیدھا تمہارے سامنے لا کر ڈال دیتی۔“ اُبی جان کی عرفیت سے مشہور مالا بیگم ان کی چھوٹی بہن تھیں۔ کڑوے لہجے میں جواب دے کر کمرے سے باہر نکل گئیں۔ اب کمرے میں بڑی بی اپنی خاموشی اور کھلی آنکھوں کے انتظار کے ساتھ تھامیں۔

☆☆☆

پرانے دقتوں کا بنا ہوا مضبوط گھراب نئے پرانے ڈیزائن کا استخراج تھا۔ گھر کے صحن کے ٹائلز اب تک دی تھیں سفید و سیاہ، شطرنج کے خانوں جیسے جبکہ کچن اور ہاتھ روم وغیرہ کو تڑا کر ذرا اور کشادہ کر کے انہیں نئے ٹائلز اور جدید کھولتوں سے آراستہ کیا گیا تھا۔

داوی اپنے کمرے میں تھیں۔ شیشم کی لکڑی کی بنی پرانے طرز کی بڑی بھاری مسہری، دیوار گیر وارڈ روم، ایک طرف کی خالی دیوار کے ساتھ چار کرسیاں رکھی تھیں۔ مہمانوں اور ملاقاتیوں کے لیے جوان کے کمرے میں نئی تشریف لے جاتے تھے، مگر زیادہ تر مہمان اور ملاقاتی بڑی بے تکلفی سے ان کی جہاز کی سائز مسہری پر ہی اڑتے تھے۔

اس وقت بھی ان کی بہن شاہ جہاں بیگم کی تشریف آوری ہوئی تھی۔ پچھلے دس برسوں سے امریکا میں اپنے بیٹے بھو کے پاس مقیم تھیں۔ دو تین سال میں، دو تین ماہ کے لیے آتیں اور پاکستان بھر کے مختلف شہروں میں پھلے اپنے سارے رشتے داروں سے ملاقاتیں کر کے جاتیں۔ آج کل اسلام آباد سے کراچی آئی ہوئی تھیں۔ دونوں کے لیے یہاں رکی تھیں۔ آج پہلا دن اور دوسرا آٹھ گھنٹہ تھا انہیں آئے ہوئے۔ اپنی بہن اور بچپن کی ہم جوئی کے ساتھ چنبیلی پرانی یادوں اور بیٹے دتوں کی یاد تازہ کر رہی تھیں۔

”میں یاد ہے زہرہ! انا ابا کی لکھنؤ والی کوئی میں کتنا کنبہ آباد تھا۔ ماٹو ایک چھوٹا سا گاؤں، ایک دن میں یوں ہی بیٹھی بیٹھی افراد کا حساب لگا رہی تھی۔ یا شاہ اللہ ساتھ سے زائد افراد تھے وہاں، پھر مہمانوں کا تانتا بھی بندھا رہا تھا۔ کیسی چہل پہل، کیسی رونق ہوئی تھی وہاں۔“ شاہ جہاں بیگم کی بوڑھی آنکھوں میں اب تک وہ سماں ٹھہرا ہوا تھا شاید۔

”ہاں۔۔۔ وہ بھی ایک دور تھا، اب تو سب کچھ خواب، خیال ہو گیا جیسے، کیسا بڑا باغ تھا، آم، امرود، انار، بھنڈے، لیموں کے درخت تو آج تک مجھے بھی یاد ہیں اور پھولاری کا کیا کہنا۔ برسات کے بعد تو لگتا تھا جنت کا کوئی ٹکڑا زمین پر آ گیا۔“ زہرہ جیسے نے یادوں کی اہم میں سچے کچھ نقوش تازہ کیے۔

”آمدنی کے سرسرا ہے۔ تانا بابا کی بھی کیا آن بان شان تھی۔ کیا باپکین تھا اس دور میں۔ پوتروں کے رخصتی یوں ہی تو نہیں کھلاتے تھے۔ ان کے بعد تو بس چائیں کیا ہوا۔ جیسے کوئی آمدنی آن کے پل کے پل میں صفایا کر دے ہر شے کا۔ اشتقاق ماموں نے تو پورے گھرانے کی لٹیائی ڈبودی، کسی نے ان کو پسر نوح کا نام دے دیا۔ کسی نے پاگل، دیوانہ کہہ کر ہر الزام سے بری کر دیا۔“

”کہاں کے پاگل، کہاں کے دیوانے تھے وہ۔“ دیوانہ بکا رآید ہوشیار (دیوانہ اپنے مطلب کے لیے ہوشیار ہوتا ہے۔) ”زہرہ جنیں چمک کر بولیں۔“ خود تو انہوں نے کوئی تم پالا نہیں، نہ گودیا، نہ غم آخرت، عجب بے فکری اور لالباہی پن سے زندگی گزار دی اور اللہ دوسروں کے لیے مسئلہ بن جاتے تھے۔ دیوانہ باش تا تم تو دیگران خورد (ایسا بے فکر جس کی فکر دوسروں کو کرنی پڑتی ہے۔) اب اشتقاق ماموں تو ان سے بہت ہی چھوٹے تھے۔ وہ سب سے بڑے، یہ سب سے چھوٹے، دور میان میں چندہ سال کا وقفہ، جب تک وہ کچھ کرنے کے قابل ہوئے، بڑے ماموں اچھا خاصا بکاڑ پیدا کر چکے تھے۔ بے چاروں نے بہتیرا سنبھالنے کی کوشش کی، مگر وہ بھی کیا کرتے، مہاجنوں کے سودور سو فخرضوں نے بالآخر وہ کو بھی، وہ باغات سب ہی کچھ ہڑپ کر لیے۔ تانا بابا کو ٹیٹس اور وہ خاص ہاتھی ”ٹیل“ سنا ہے سب بھلام ہو گئے تھے۔ ”زہرہ جنیں کو بڑے عرصے بعد کوئی ہم نوا ملتا تھا۔ وہ تو بس ایسی شروع ہوئیں کہ اللہ دے اور بندہ لے۔“

”کہاں تانا بابا، کہاں اشتقاق ماموں، وہاں تو وہ حساب تھا کہ سیدتوں کے پوت اور پوتوں کے سیدت۔“ ”ارے زہرہ! تمہاری فارسی تو ابھی تک بڑی چست ہے۔ ہمیں تو جی یاد بھی نہیں رہتا کہ ہم نے آمدن نامہ، گلستان، بوستان سے ابتدائی فارسی سیکھی تھی۔ ابامیاں نے بھی ہم بہن بھائیوں پہ بڑی جان ماری زبانیں سکھانے کے لیے۔“ شاہ جہاں بیگم نے ایک خوش گوار مسکراہٹ کے ساتھ بہن کی طرف دیکھا۔

”یہاں کون کچھ رہا ہے ہماری فارسی، ایک وہ اللہ رکھے تصویر بہن سے ملاقات ہو جاتی ہے، انہیں بھی ذرا شدہ بد ہے فارسی کی، پھر ان کے میاں بھی مشہد کے، تو بھی، ان ہی سے مل کر یہ شوق پورا ہو جاتا ہے ہمارا۔ ابھی کبھار ہمارے بیٹے صاحب کوئی فقہر چست کر دیتے ہیں تو بھی ہم بھی شروع ہو جاتے ہیں، ویسے ہم بھی انہیں طنز کر دیتے ہیں کہ میاں آپ کو فارسی پڑھانے کا کوئی فائدہ ہمیں تو ہوا نہیں، بولتے ہی نہیں، اب تو خیر بہت کچھ بھول بھال گئے۔“

”ہماری پوتی کا حال سنئے، وہاں انہوں نے پہلی بار ہماری زبان سے فرخ کے چند الفاظ سنے تو بقول ان کے، بے ہوش ہوتے ہوئے چپیں، کیوں بھی! کیا جاہل جٹ سمجھ رکھا ہے ہمیں، ہم نے بتایا کہ ہمارے ابامیاں نے عربی، فارسی، اردو خود پڑھا لی تھی ہمیں اور انگریزی اور فرخ کے لیے ایک اتالیق مقرر تھے جو ہمیں روزانہ پڑھانے آتے تھے۔ پوتی صلح فرمائے لگیں۔“

”کیا اس زمانے میں تعلیم کا رواج تھا۔ لوگوں کے پاس دولت تھی۔ خوش حالی تھی۔“ ”ارے بھی کیوں نہیں کوئی پورا برصغیر جاہل، غریب، تنگا بھوکا تھوڑا ہی تھا۔ ہمارے ابامیاں نے انیسویں صدی کے ابتدائی برسوں میں علی گڑھ سے گریجویشن کیا تھا۔ پھر آگے بھی مزید تعلیم حاصل کی۔ روپے پیسے کا منہ بھی دیکھا اور ماشاء اللہ خوب دیکھا، کیوں زہرہ۔“

”ہاں ہاں کیوں نہیں۔ مگر آج کل کی نسل کو یہ سب باتیں کہانیاں لگتی ہیں۔ یہاں پوتے، پوتیاں ہی ہماری باتیں سن کن کر حیران ہوتے ہیں۔“ ”وہ مسکرائیں۔“

”دادی حضور! کھانا کھانے کا ارادہ ہے۔“ ”حنہ کمرے میں داخل ہوئی تھی۔“

”تھوڑی دیر میں کھائیں گے چنانچہ آدھ کھٹے بعد لگانا دسترخوان۔“ شاہ جہاں بیگم نے جواب دیا، پھر وہ اپنی

بہن سے مخاطب ہوئیں۔

”تمہیں بھوک لگ رہی ہے تو ابھی کھالیں۔“

”بھوک تو لگ رہی ہے۔“ انہوں نے اعتراف کیا۔

”چلو بیٹا! پھر ایسا کرو کہ دسترخوان لگاؤ۔“ انہوں نے دوبارہ حنہ کو مخاطب کیا جو ابھی تک خستہ کھڑی تھی۔

”جی اچھا۔“ وہ تابعداری سے کھتی ہوئی باہر نکل گئی۔

ماریہ اور مانی چکن میں حنہ کے ساتھ تھے۔ کھانا لگوانے میں مدد بھی کروا رہے تھے اور ساتھ ساتھ ان کی باتیں بھی جاری تھیں۔

”بوزمے افراد جب مل بیٹھتے ہیں تو زیادہ تر اپنے ماضی کو کیوں یاد کرتے رہتے ہیں۔“ مانی نے سوال کیا۔

”شاید اس لیے کہ وہ اپنی عمر تقریباً“ گزار چکے ہوتے ہیں۔ مستقبل کا کوئی خواب، کوئی پلان ان کے پاس نہیں ہوتا، اسی لیے وہ بیٹھے بیٹھے ماضی کی یادوں میں کھوئے رہتے ہیں۔“ ماریہ نے سوچ سوچ کر جواب دیا۔

”یہ انسانی فطرت ہے شاید اور تقریباً ہر انسان جو بڑھاپے کو پہنچتا ہے وہ اپنے بچپن، اپنے ماضی کو ضرور دہراتا ہے۔ ایک بے ضرر سا مشغلہ، جس سے ان لوگوں کو خوشی ملتی ہے، تسکین ملتی ہے۔ حنہ نے رسلان سے جواب دیا۔ ”میں کوئی اعتراض نہیں کر رہا۔ ویسے ہی ایک بات کہہ رہا ہوں۔“ مانی نے مسکرا کر اپنی پیاری آپتی جان کو دیکھا اور سلا دمیں سے کھیرے کا ٹکڑا اٹھانے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ مگر ماریہ نے اس کا ارادہ پہلے ہی بھانپ کر فوراً پلیٹ اس کے آگے سے اٹھالی۔ اور پکن سے باہر چل دی۔

”اے..... رکو..... ایک کھیرے کا ٹکڑا اسی تو تھا ظالم۔“ مانی اس کے پیچھے پیچھے بھاگا۔

☆☆☆

گلے کی چٹی یہ فیوزنگ، جہاں اس نے گرم گرم استری پھیری۔ ابھی وہ استری ہٹا کر جائزہ لے رہی تھی کہ بجلی اچانک ہی چلی گئی۔ اچانک یوں کہ وہ کوڈ شیڈنگ ٹائم نہیں تھا، مگر بجلی کا کیا ہے، وہ تو بھی کسی بھی وقت، کتنی ہی دیر کے لیے غائب ہو سکتی تھی۔

”اف.....“ مانتھ کے منہ سے بے اختیار نکلا، مگر اگلے ہی لمحے اس نے کلمہ شکر ادا کیا۔

”شکر ہے کہ فیوزنگ لگالی، اب بیٹھ کر کھانا بنائی لوں گی۔“ ششیں ہاتھ کی تھیں، وہ ابھی عصر کی نماز پڑھ کر آئی تھی۔ مغرب ہونے تک اس کا اچھا خاصا کام ہو جاتا۔ وہ آٹھویں جماعت میں بھی جب سے سلائی کے کام میں اپنی امی کا ہاتھ بٹانے لگی تھی۔ نویں جماعت تک وہ کافی کچھ سیکھ چکی تھی اور میٹرک کر کے وہ کالج گئی تو سلائی میں مہارت حاصل کر چکی تھی۔ اس کے ہاتھ میں صفائی تھی۔ نفاست تھی اور کچھ قدرتی ہنر تھا اس میں، وہ ڈیزائننگ، بکمریشن بہت اچھے کرتی تھی۔ سلائی کا آدم سے زیادہ کام اب وہی بناتی تھی۔

امی کی ایک آنکھ میں موتا آخر آیا تھا۔ ڈاکٹروں نے آپریشن بتایا تھا۔ عانت اب حتی الامکان کوشش کرتی کہ انہیں مشین پر نہ بیٹھنے دے، مگر پھر بھی وہ جب کالج میں ہوتی تو امی کچھ نہ کچھ سلائی کر ہی لیتیں۔ عانت کالج سے آئی تو ان پر تھا ہوتی وہ مسکرا کر اسے نال دیتیں۔

”ای! آپ فریڈ آئی کے کپڑے مت لیا کریں۔“ سوئی میں دھاگا ڈالتے ہوئے وہ ماں سے مخاطب ہوئی۔

”کیوں۔“

”مستے کم پیسے اور ڈھیروں ڈھیر خرچے، مجھے تو بہت غصہ آتا ہے ان کے کپڑے کی کر۔“

”بیٹا بہت پرانی کسٹمر ہیں ہماری، ایسے کیسے صاف جواب دے دوں انہیں۔“ امی نے مجبوری کا اظہار کیا۔
 ”مرانا کسٹمر ہو یا نیا، جو محنت کے مطابق معاوضہ دے، اس کا کام کریں، ہاتھوں کو گندہائے۔ برانا ہونے کا یہ مطلب چھوڑی ہے کہ جو معاوضہ دس سال پہلے وہ دیا کرتی تھیں، آج بھی وہی دیں، مہنگائی دیکھیں کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہے۔“ عائشہ نے ان کے غمزہ کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے کہا۔
 ”اتنا جذباتی ہو کر فیصلے نہیں کرتے۔ سوچ سمجھ کر قدم اٹھاتے ہیں۔ جب ہمارے پاس کوئی متبادل انتظام ہو جائے گا تو آہستہ آہستہ ایسے سارے کسٹمرز سے جان چھڑائیں گے۔ ابھی تو ہماری مجبوری ہے، تاہم سے ہاں تو ہے حق حلال کی روزی چھوڑی بھی ہو تو اللہ اس میں برکت دیتا ہے۔“ امی نے آرام سے اسے سمجھایا۔
 ”بات کم یا زیادہ روزی کی نہیں امی! ہماری محنت کے مطابق صلہ نہیں ملتا تو دل دکھتا ہے۔“ عائشہ کی دھیمی آواز اب مشین کی گھر گھر میں اور دب رہی تھی۔

کالج میں آ کر اس میں بہت سے ایسے احساس پیدا ہوئے تھے جن کو اس نے اب تک کوئی خاص توجہ اور اہمیت نہیں دی تھی، مگر اب جب عمر اوز شعور نے کچھ آگے سفر کیا تو اس کے خیالات اور اعتراضات کو زبان مل گئی۔ کالج جاتے ہوئے اسے چھ ماہ سے زائد ہو چکے تھے۔ اب وہ پہلے جیسے ڈری سکی، ڈار سے پچھڑی کونج کی طرح حیران پریشان نہیں رہتی تھی۔ بہت جلد اس نے اعتماد کا ذائقہ چکھ لیا تھا۔

وہ جس نئی دنیا سے روشناس ہو رہی تھی۔ اس کے نت نئے دل بھاتے رنگوں کی طرف وہ کچھ ایسی ملتفت نہیں تھی کہ ماضی کی تربیت کی بنیادیں بہت مضبوط تھیں۔ ہر دل فریب، چمکتے دیکھتے منظر سے بے نیاز نہ گزر جانا اس کی فطرت اور تربیت کا خاصا تھا، مگر اپنی اور اپنی ماں کی محنت کے حوالے سے ہونے والی حق سنی اور استحصال اسے اب بری طرح کھلنے لگا تھا۔ اکثر پُر جوش ہو کر ایک چھوٹی سی تقریر جھاڑ دیتی اور امی اور احمد اس کے زور خطابت اور جذباتیت پر فقط مسکرا کر اردے دیتے۔

”عائشہ.....“ امی نے کچھ یاد آتے ہی اسے مخاطب کیا۔ ”بجلی کا بل اور بارہ سو روپے، ایک ساتھ کر کے شوکیں یہ رکھ دینا، احمد صبح جاتے ہوئے لے جائے گا۔ آخری تاریخ پہ تو بہت رش ہو جاتا ہے۔ بل پہلے ہی بھر جائے تو بہتر ہے۔“

”بجلی تو عموماً ہوتی ہی نہیں ہے۔ لوڈ شیڈنگ کا دورانیہ بڑھتا ہی جا رہا ہے اور بل میں ہر ماہ اضافہ ہوتا رہتا ہے۔“ عائشہ بڑبڑائی۔

”امی! آپ بھی بھائی سے کہہ کر کنڈے لگوا لیں۔ سوائے ایک آدھ گھر کے، سب ہی کے گھروں میں کنڈے لگا ہوا ہے۔ ہم لگائیں گے تو کیا قیامت آ جائے گی۔ ایک سیور اور ایک پنکھا ہی تو چلتا ہے ہمارا اور ایک چھوٹا سا فریج، روز بروز اسٹیج بھی نہیں ہوتی کپڑوں پر، نہ کئی کئی گھنٹے کی دبی چلتا ہے اور تو کوئی خاص الیکٹریٹس کی شے ہمارے گھر میں ہے نہیں۔ پھر بھی اتنا اتنا بل بھیج دیتے ہیں اٹھا کر۔“ عائشہ سلائی کے ساتھ ساتھ بولتی بھی جاری تھی۔

”کنڈے لگانے سے کسی کا مسئلہ حل نہیں ہوتا، بلکہ اور بڑھ جاتا ہے۔ آئے دن چھاپے پڑتے ہیں اور پھر ہزاروں روپوں کا بل بنا کر دوبارہ بھیج دیتے ہیں۔ کنڈے لگنا کتنا ہی بچت نہیں ہوتی جتنی رقم جرمانوں میں چلی جاتی ہے، پھر ایسے کام کر کے ہم کسی اور کو نقصان نہیں پہنچاتے، خود اپنے آپ کو پہنچاتے ہیں۔“
 ”امی حضور! آج کل کے دور میں ایمان داری کے ساتھ زندگی بسر کرنا بال صراط پہ چلنا ہے گویا۔ مجموعی طور پر کرپٹ معاشرے میں، انفرادی ایمان داری اور راست بازی سے نہ خود کو کوئی فائدہ ہوتا ہے، نہ دوسروں کو۔“
 عائشہ یوں باغیانہ لب و لہجہ عموماً اختیار نہیں کرتی تھی، مگر ابھی اس کا دل بے حد دکھ سے بھر جاتا تھا۔ یہ اتنے دل

چمکتا تو کچھ بھی بول کر بغیر اس نکال لیتی۔
 ہر مہینے بجلی کے بل کی مد میں اچھی خاصی رقم نکل جاتی تھی۔ درندہ امی کے آپریشن کے لیے رقم جمع کرنے کا مشن اتنا مست رفتار نہ ہوتا۔
 ”ہاں..... کبھی کبھار کچھ ایسا ہی لگتا ہے۔ مگر.....“ امی ایک لمحے کو رکیں۔ ”چڑیاں کی چونچ میں دبے پانی کے دو قطرے سے بے شک آگ نہیں بجھتی، مگر اس کا خلوص نیت ریکارڈ پر آ جاتا ہے۔ وہ ضائع نہیں جاتا، کریپشن کے سمندر میں چاہے پورا معاشرہ غرق ہو رہا ہو، مگر ایمان داری کا چھوٹا سا جزیرہ بھی انسان کو ڈوبنے سے محفوظ رکھتا ہے۔“
 ”ڈرگ گانے جزیروں پر قدم جمانا بھی تو آسان نہیں ہوتا۔“ عائشہ نے ایک لمحے کے لیے مشین پہ جھکا سر اٹھایا۔

”اسی لیے تو اللہ تعالیٰ سے ہدایت کے ساتھ ساتھ استقامت کی دعا بھی مانگتے ہیں۔“ امی نے پاک کاٹ کر ایک طرف رکھی اور آلو چھیلنے لگیں۔
 ”پتا ہے امی! جب میں اپنے گھر پر ہوتی ہوں تو جیسے کسی اور بری دنیا میں ہوتی ہوں اور گھر سے باہر کی دنیا بالکل الگ، بالکل مختلف ہے۔ جیسے..... جیسے کوئی اپنی کنیا سے نکل کر کسی جادوگری میں آ جائے۔“ عائشہ دھیرے سے مسکرائی۔

”اس جادوگری میں جاؤ، چلو پھرو، ہر شے دیکھو، خوب دیکھو اور بس دیکھ کر گزرتے جاؤ، جہاں قدم رکے، وہیں انسان کی منزل کھولی اور راستہ کم ہو جاتا ہے۔“
 ”پتا ہے، میں نے اپنی سہیلیوں کو آپ کے بارے میں بتایا ہے کہ میں نے آج تک اپنی امی کو کتنا نہیں پڑھتے نہیں دیکھا، مگر وہ ایک کپی فلاسفر ہیں۔“ عائشہ مسکرائی۔

”فلاسفر بننے کے لیے ڈھیروں ڈھیر کتابیں پڑھنا ضروری نہیں۔ بعض لوگوں کو زندگی اور دوسرے لوگ بھی فلسفہ سکھا دیتے ہیں۔“

امی نے سادہ سے انداز میں جواب دیا اور سر جھکا کر پھر سے آلو کاٹنے میں مگن ہو گئیں۔ ان کے چہرے پہ جو سکون تھا وہ ان کے صبر اور قناعت کی گواہی تھا۔

☆☆☆

”السلام علیکم بھابھی! میں جمال بات کر رہا ہوں سر مد کا دوست۔“
 ”وعلیکم السلام! کیا حال ہے جمال بھائی؟“ نائلہ نے اس کی آواز پہچان لی تھی۔ وہ سر مد کا بہت قریبی دوست تھا اور ان کے گھر اس کا بے تکلفانا آنا جانا تھا۔

”میں تو بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں، مگر آپ کے شوہر نامدار بے چارے کا فی پریشان ہیں۔ پچھلے ایک ہفتے سے میرے پاس آ، آ کر کتابیں کر رہے ہیں کہ آپ سے بات کروں۔“

جمال بہت ریشمیں ہو کر بات کر رہا تھا۔ وہ اس سے پہلے بھی دو تین بار دونوں کی صلح کروا چکا تھا، بلکہ دونوں کی صلح کیا، سر مد بے چارہ تو مرخصان مرنے انسان تھا۔ یہ نائلہ ہی تھی اکثر فوں، جسے منانے کے جتن کیے جاتے تھے۔ جمال اپنے دوست کی دکالت، بخوبی کر لیتا تھا اور مزے کی بات کہ نائلہ اس کے سمجھانے اور منانے سے مان بھی جاتی تھی۔

”جمال بھائی! میں اس شخص کے چھوٹے دلاسوں سے تنگ آ چکی ہوں۔ ہر بار مجھ سے یہ ہی کہتا ہے کہ اس بار یہ گھٹیا نوکری چھوڑ کر کوئی بہتر کام دیکھیے گا اور ہر بار پھر وہی راگ لگی لگائی نوکری کو یوں چھوڑنا ٹھیک

نہیں، مسئلہ وہ مسئلہ، آخر میں کب تک صبر اور برداشت سے کام لیتی رہوں۔“ نائلہ یوں چھٹ پڑی جیسے اس کی شادی کو چھ مہینے نہیں بلکہ دس بارہ سال ہو گئے ہوں۔

”بھانجی..... بھانجی.....“ دھیرج رہیں۔ میں پوری کوشش کر رہا ہوں۔ ان شاء اللہ کچھ عرصے میں اس کا اپنا کام ایسے سیٹ کرادوں گا کہ اس کے ساتھ ساتھ آپ کی لائف بھی سیٹ ہو جائے گی۔“ جمال نے اسے یقین دلانے ہوئے کہا۔

”رہنے دیں جمال بھائی! آپ بھی اپنے دوست کی طرح سبز باغ دکھانے میں ماہر ہیں۔“ نائلہ نے ٹھنک کر کہا۔

”ارے..... رے..... رے.....“ سبز باغ.....“ جمال ہنسا۔ ”بھنا جو کچھ کہا ہے، دل سے کہا ہے اور سچ کہا ہے، بھلا ہم یہ برداشت کریں گے کہ ہماری اتنی پیاری بھانجی اپنی پسندیدہ چیزوں کے بغیر ترس ترس کر زندگی گزاریں۔“

جمال کو لکھے دار باتیں بنانی خوب آتی تھیں اور نائلہ کو یہ انداز گفتگو بڑا اچھا لگتا تھا۔ سرد متواس کے رعب حسن کے آگے بس ٹھکھیا کر یا منسٹا کر رہ جاتا۔ نائلہ کی طبیعت بھی کھار تو بری طرح ادب جاتی تھی سرد کے انداز سے۔

”بولے نا بھانجی! میں نے تو سرد کو یقین دلادیا تھا کہ آپ کو گھر ضرور لے آؤں گا۔ پلیز، اب میری بات کا مان تو رکھ لیجیے گا۔“ جمال کا لہجہ خود بخود التجائیہ ہو گیا۔

”جمال بھائی! آپ کی بات بھلا میں ٹال سکتی ہوں۔“ نائلہ کے لبوں پہ مسکراہٹ بکھر گئی۔ ”مگر یاد رہے، آپ ضمانت لے رہے ہیں اپنے دوست کی، کوئی گڑبڑ ہوئی تو آپ ہی پھنکیں گے پھر۔“ نائلہ نے بڑی اداسے اسے متنبہ کیا۔

”ارے بھانجی جان! ہم خوشی خوشی بھگت لیں گے۔ آپ گھر آنے کی ہاں تو کریں۔“ جمال کا لہجہ معنی خیز ہو گیا۔

”بناد بیجیے گا پھر ہمارے شوہر نامدار کو، آکر لے جائیں، لیکن اگر آپ نے جلد از جلد ان کا کام سیٹ نہیں کر دیا تو آپ ذمے دار ہوں گے۔ آپ کے کہنے سے جاری ہوں میں۔“ نائلہ نے اسے بتایا۔

”ٹھیک ہے بھانجی! آپ بے شک ساری ذمہ داری میرے کاندھوں پہ ڈال دیجیے گا۔ میں اف نہیں کرنے والا۔“ جمال نے پھر نس کر یقین دلایا۔

نائلہ کے الفاظ، انداز میں جو ترغیب اور حوصلہ افزائی تھی۔ وہ جمال جیسے شخص کی پیش قدمی کے لیے کافی تھی۔

سرد سے اس کی اچھی سلام دعا تھی۔ سرد نے اپنے گھر اور گھریلو معاملات میں اسے انوالو کیا تو وہ ابتدا میں ہی نائلہ کے رنگ ڈھنگ دیکھ کر ٹھنک گیا تھا۔ مگر اس کا یہ ٹھنکنا محض سوچ بچار کی غرض سے تھا کہ وہ ایسی عورت سے فائدہ اٹھانے کے لیے اگلا قدم کب اور کیسے اٹھائے، اسے کوئی خاص جلدی نہیں تھی۔ وہ اپنا کھیل بہت سست روی اور آرام سے کھیل رہا تھا۔

سانے دوئی تو حریف تھے۔ ایک بے وقوفی کی حد تک سیدھا سادا جسے وہ یوں ہی چیت کر سکتا تھا۔ دوسری مد مقابل، لالچ، ہوس اور خواہشات کی ماری، جو خود ہی خلست کے پاتال میں گرے کو تیار تھی۔ بظاہر سب کچھ آسان لگ رہا تھا، مگر پھر بھی وہ بڑی بھرمندی اور چابک دستی کے ساتھ دونوں کے گرد اپنا جال بن رہا تھا۔

کمرہ بہت زیادہ بڑا نہیں تھا، مگر آرام دہ اور پرسکون تھا۔ ایک طرف بیڈ جس پر ٹھیلیں پھولوں کی دیدہ زیب چادر اور اس کے ساتھ کے ٹیکے تھے۔ اسی کے ہم رنگ، دو گاؤ ٹیکے بھی سائیزوں میں لگے ہوئے تھے۔ رسمی پرے کھڑکیوں پہ گرے ہوئے تھے۔ قالین نیا اور دبیز تھا۔ الماری دیوار گیر تھی اور سنگھار میز، خوب صورت اور انشاکش، میک اپ کے دیگر لوازمات کے ساتھ اس پر ایک شے بہت نمایاں اور زیادہ تعداد میں تھی۔ بھانت بھانت کے پرفیوم۔

مختلف انداز و ذرائع کی بوتلیں، انواع و اقسام کی خوشبوئیں، وہ دیوانی تھی، خوشبو کی۔

”کیا ضرورت ہے اتنے پرفیوم لگانے کی، تم جسم خوشبو ہو، سراپا پھول ہو۔“ طلال شیخ نے ایک گہری سانس لے کر اس کے وجود سے انٹشی دل فریب میک اپ سے انداز تاری۔

”میرا شوق ہے۔“ چنبیلی مسکرائی، شہر رنگ بالوں کی ایک لمبی سی لٹ اس کی سر میں گردن کو چوم رہی تھی۔

”آپ کہیں تو آپ کے سارے شوق پورے کر دیں۔“ طلال نے اس کی گردن کو چومتی زلفوں کو سیٹ کر ایک طرف کیا۔ اس نے آج کی نہیں تھی، مگر بن سے ہی مدہوش ہو رہا تھا۔

”دو چار دن کے شوق تو کوئی بھی پورے کر سکتا ہے شیخ جی! عمر بھر کے جو نچلے کون پورے کرتا ہے۔“

”اور اگر کوئی ہو پورا کرنے والا تو۔“

”ایسے دعوے کرنا بہت آسان ہوتا ہے۔ ان پر عمل کرنے کے لیے بڑی ہمت چاہیے۔“ چنبیلی نے مسکرا کر اسے دیکھا۔

”بندہ بہت جی دار ہے جان! آزما کر دیکھ لو۔“ طلال جوش میں آ کر اٹھ بیٹھا۔

”ہم کسی کو آزما تے نہیں ہیں، توقع پوری نہ ہو تو تکلیف ہوتی ہے۔“ چنبیلی نے آہستہ سے بولتے ہوئے آنکھیں بند کیں۔

کمرے میں زیر و پاور کی نیلگوں روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ دیوار پر لگے وال کھاک نے سر یلا ساز بجانا شروع کیا اور پھر ٹن، دو گھنٹے بجنے کا سیدھا سا مطلب دونے نچکے تھے۔

”کبھی کبھی کوئی آزمائش پر پورا اتر بھی جاتا ہے۔“ طلال دوبارہ اس پر جھک گیا۔ ”ہمیں آزما کر تو دیکھو۔“ اس نے چنبیلی کے کان میں سرگوشی کی۔

”آزمائش یا تو دوستی کے بل پر ہوتی ہے یا محبت کے، ہم کس بھروسے پہ آزمائیں آپ کو۔“

”محبت کے بھروسے پہ۔۔۔۔۔“ طلال نے بغیر کسی توقف اور تذبذب کے جواب دیا۔

”انتا بڑا دغا۔“

”صرف دغا ہی نہیں وعدہ بھی ہے اسے بھانے کا۔“ طلال بے خود ہو کر اس میں گم ہو رہا تھا۔

”ایسے خواب نہ دکھائیں شیخ جی! میں تو مر ہی جاؤں گی۔“

”شوق سے مر رہا، مگر صرف مجھ پر۔“

”وہ تو کب کی مرنے لگی ہوں۔“ چنبیلی نے بے ساختہ ہی اعتراف کیا۔

”ہلے کیوں نہیں بتایا۔“

”گناہ کرنی بتا کر۔“ دکان دار اپنی چیز کے دام لے کر گامک کو رخصت کر دیتے ہیں۔ اس سے محبت کرنا تھوڑی شروع کر دیتے ہیں۔“ چنبیلی کے لہجے میں معمولی سی چھین تھی۔

”اور جو گامک ہی دام الفت میں گرفتار ہو جائے۔“

”دکان دار کی خوش نصیبی ہے، کوئی بے مایہ شے معمول ہو جائے۔“

”ایسی باتیں نہ کرو جو میرے سر پر سے گزریں، اتنے پیار سے بات کرتی ہو تو پیار کی بات ہی کیا کرو۔“ طلال نے اس کی مہکتی زلفوں میں منہ گھسیا۔

”پیار کی بات آپ کی طرف سے ہو تو دل کی خوشی کا عالم کچھ اور ہی ہوتا ہے۔“

”بھلا میں یہ گستاخی کر سکتا ہوں کہ حسن کی بارگاہ میں پیار کے علاوہ کچھ اور بات کروں۔“ طلال کی باتیں، والہانہ رویہ، خوشی سے اس کا دل دھڑکا رہے تھے۔

وہ آٹھ مہینے پہلے یہاں آیا تھا۔ پہلی بار، اس کے بعد اس کے آئے دن کے چکر لگنے شروع ہو گئے تھے۔ وہ ایک نامور سیاست دان اور جاگیردار کا سیوت تھا اور اس چوہارے میں چٹیلی کی زلف کا اسیر ہو گیا تھا۔

☆☆☆

کالج قدیم تھا اور نیم کا وہ درخت بھی اتنا ہی پرانا۔ اس کی تنگی سرسبز چھاؤں کالج ٹائم میں کبھی خالی نہیں رہتی تھی۔ کوئی نہ کوئی ٹولی اس کے نیچے براجمان ہی رہتی تھی۔ اس وقت بھی ماریہ اینڈ گروپ نے وہاں قبضہ بنایا ہوا تھا۔ گروپ کے تین ارکان تو کینٹین کا رخ کر چکے تھے۔ باقی دو افراد نیچے تھے جو ہمیں بیٹھے جانے والوں کی واپسی کا انتظار کر رہے تھے۔

”تم کیا روزہ رکھ کر آتی ہو یا پرہیز کرتی ہو باہر کی چیزوں سے۔“ ماریہ نے اپنی فطری بے تکلفی اور بے ساختگی سے عائشہ کو مخاطب کیا۔

فرسٹ ایر — اب ختم ہونے کو تھا۔ دونوں کی دوستی کو بھی تقریباً اسی عرصہ ہو چکا تھا۔

”باہر کی چیزیں زیادہ کھالوں تو میری طبیعت خراب ہو جاتی ہے، ہضم نہیں ہوتا۔“ عائشہ نے بہانہ بنایا۔

حقیقت تو یہ تھی کہ اس کا جب خرچ بہت محدود تھا۔ اس نے خود ہی محدود کیا ہوا تھا۔ اسی تو اسے روز کی اتنی رقم دیتی تھیں کہ اس کا کرایہ اور کالج کینٹین سے کچھ کھانا پینا ہو سکے، مگر اس نے باہر کی چیزوں کی لت نہیں لگائی تھی خود کو گھر میں رات میں اکثر آلو، وال یا کوئی بھی سبزی پتی، اس میں سے تھوڑی سی، صبح خشک کر کے اس کا پراٹھا بنا لیتی، کبھی چٹنی، کبھی اچار کی بھانک رکھ کر دل لے لے جاتی، بریک میں اس کے ساتھ ساتھ سہیلیاں بھی لگے، دو لگے لے لیتیں اور پھر چیتیں۔

”اللہ عائشہ! کتنے مزے کا ہے، تم خود صبح صبح پراٹھا بناتی ہو۔“ ان میں سے کوئی حیران ہو کر آنکھیں پھاڑتی۔ جنہیں صبح اپنے لیے ایک کپ چائے بنانا بھی پہاڑ لگتا تھا۔

عائشہ متانت کے ساتھ مسکرا دیتی۔ وہ اپنے ساتھ ساتھ اپنے بھائی کا پراٹھا اور ای کی سادہ روٹی پکا کر کالج آتی تھی۔ یہ بتا کر وہ اپنی اوٹ پٹا تک مختلف دوستوں کو مزید حیران نہیں کرنا چاہتی تھی جو پہلے ہی چھوٹی چھوٹی باتوں پر چٹیں مار کر حیران ہونے کا عالمی ریکارڈ بنانے کا تہیہ کیے بیٹھی تھیں۔

”تم آج اپنے چائے کے لیے بھی کچھ نہیں لائیں گھر سے، کینٹین سے کچھ لے لو۔“ ماریہ نے اسے ہونکا دیا۔

”موڈ نہیں ہے۔“ عائشہ نے ٹٹی میں سر ہلایا۔ اس کے پاس اکھوتاس کا نوٹ تھا جو گھر واپسی کرانے کے لیے تھا۔

”کھانے پینے کا کام موڈ سے نہیں بھوک سے ہوتا ہے۔“ ماریہ نے بتایا۔

”پھر سمجھ لو کہ بھوک نہیں ہے۔“ عائشہ مسکرائی۔

”کیا کھایا تھا صبح۔“ ماریہ کی جرح بدستور جاری تھی۔

”اٹو۔۔۔۔۔“ عائشہ نے اکتا کر اسے دیکھا۔ ”کتنی فٹیش کرتی ہو، ویمن پولیس میں بھرتی ہونے کا ارادہ تو نہیں ہے تمہارا۔“

”دراصل مجھے حیرت ہوتی ہے تمہیں دیکھ کر۔“ ماریہ نے غلج ہو کر اسے دیکھا اور ادھوری بات چھوڑ کر

سپنس پھیلا یا۔

”کیوں بھئی! کیا میرے سر پر سیگنٹ لیا کچھ کوئی دم وغیرہ ہے۔“ عائشہ نے مصنوعی انداز میں منہ بنایا۔

”ہاں ہے، ایک میرے بھائی ہیں، جن کا دنیا میں آنے اور جینے کا فہم ایک ہی مقصد ہے، کھانا، کھانا، بس کھانا۔ ہر وقت کھانا اور کھاتے ہی چلے جانا، ہر دس، پندرہ منٹ بعد انہیں منہ چلانے کے لیے کچھ نہ کچھ چاہیے اور ہر آدھ گھنٹے بعد بھوک مٹانے کے لیے کچھ نہ کچھ چاہیے۔ میں تمہیں دہشت ہوں تو یہ ہی سوچتی رہتی ہوں کہ یا اللہ یہ لڑکی بغیر کچھ کھائے آدھ دن کیسے نکال لیتی ہے۔“ ماریہ مزاحیہ انداز میں اتنی بے ساختگی کے ساتھ بتا رہی تھی کہ بے اختیار عائشہ کی ہنسی نکل گئی۔

”مہالہ آرائی خوب کرتی ہو تم کھاری بن سکتی ہو، ٹرائی کرو کبھی۔“

”یہ بتاؤ میرے لیے تو کیر پر بڑے ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکال رہی ہو، کبھی ویمن پولیس، کبھی لکھاری، اپنے لیے کیا سوچا ہے۔“ ماریہ نے اسے گھور کے دیکھا۔

”بہشتی کی ڈریس ڈیزائنر، وہ بھی اعلا پائے کی۔“ عائشہ نے فرضی کارلار کڑا ہے۔

”اعلا پائے تو بس پینٹس کے ہوتے ہیں۔ واہ واہ! کیا ہڈی ہوتی ہے، کیا پوٹی۔“ ماریہ نے آنکھیں بند کر کے جھوم کے سر ہلایا۔

عائشہ خاموشی سے اسے گھور رہی تھی۔ جس نے عائشہ کی بات کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا تھا۔

”بھئی، مجھے یوں اپنی نظروں سے شہید مت کرو۔ میرے بھائی کا قول ہے جو میں نے ابھی تمہیں سنایا ہے۔“ ماریہ نے اپنے بچاؤ کے لیے جلدی سے صفائی پیش کی۔

عائشہ نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ کینٹین جانے والا ٹولا واپس آتا دکھائی دیا۔

”یہ لو۔۔۔۔۔ وہ آگئیں معرکہ سر کر کے۔“ عائشہ نے ان لوگوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ بریک ٹائم میں

کینٹین میں اتار دیا ہوتا کہ وہاں سے کچھ خریدنا معرکہ سر کرنے کے برابر ہی تھا۔

”اف! اڈہ تینوں دم سے کرنے کے انداز میں بیٹھ گئیں۔ ماریہ نے اپنے لیے برگر منگوایا تھا اور جوس، سنیچہ اور انیلا نے اپنے اپنے دول کھانا شروع کر دیے، مگر عائشہ کو آفر کرنے کے بعد، یسری نے اپنے دوسو سے چپس

کا پیکٹ اور کوئل ڈریک عائشہ کے سامنے رکھے۔

”عائشہ! یہ تم کھالو۔“ اس نے گہری آواز بھر کے کہا۔

”کیا ہوا۔“ ماریہ اور عائشہ دونوں نے چونک کر اسے دیکھا۔ جس کے چہرہ پر بارہ بج رہے تھے۔ سنیچہ اور

انیلا کے لبوں پر پہلے مسکراہٹ آئی، پھر ہکا بیک دونوں تھپہ دار کپس پڑیں۔

یسری کا گول مٹول، بھولا بھالا سامنا اور بھی گول گیا ہو گیا۔ ماریہ اور عائشہ کی حیرانی ہنوز برقرار تھی۔

”یسری کی خالہ امی، یعنی ہونے والی ساس امی کا ٹیٹم بلکہ وارننگ آئی ہے کہ موجودہ وزن کو نام صرف کم کیا جائے بلکہ اگر اس میں ایک پاؤ کا بھی اضافہ ہوا تو شادی کینسل بلکہ منگنی ہی ختم۔“ انیلا نے ہنسی کے دوران بتایا۔

”اب محترمہ نے عادت کے مطابق اپنا بیچ خرید لیا، ڈھیروں ڈھیر کیوریز والا، مگر تین کھانے کے وقت

خالہ کی وارننگ یاد آئی اور یہ بھی یاد آیا کہ محترمہ گھر سے گھبرا کر لائی تھیں اپنے بیک میں، آج وہی تناول فرمائیں گی۔“ اس بار ہنسی میں انیلا اور سنیچہ کے ساتھ ساتھ عائشہ اور ماریہ بھی شریک تھیں۔

”اڑو مذاق، نف ہے ایسی دوستوں پر۔“ یسری بیچ رو ہنسی ہو رہی تھی۔ منگنی یا شادی کینسل ہونے کا

ڈرنیکس تھا، کھانے پینے سے محرومی اور ڈانٹنگ کا کد زیادہ بڑا اور شدید تھا۔

”لو بھئی عائشہ! پہلے تو تم موج اڑاؤ، تمہارے لیے غیب سے من و سلویٰ کا انتظام کیا ہے اللہ تعالیٰ

55 2010

نے۔" ماریا اس سے مخاطب ہوئی۔

"میں اس کے پیسے کل....." عائشہ نے کہنے کی کوشش کی۔

"ارے بھاڑ میں گئے پیسے، تم کھانی کر ختم کرو اسے۔" یسری اپنے بیک میں ہاتھ گھسیڑتے ہوئے دھاڑی۔ ہاتھ واپس آیا اس میں ایک عدد سالم کھیر ادا ہوا تھا۔

"کھیر اچھا یسری! تم تمہارے ساتھ ہیں۔" گنگنائی۔

یسری فی فی تم دھسے کے برابر حساب کے ساتھ کھیرایوں چار ہی تھیں جیسے اس کے ساتھ ساتھ اپنی ساس امی کی وارننگ بھی ہڑپ کر رہی ہوں۔

☆☆☆

سوئی میں دھاگا ڈال کر وہ بڑی مہارت سے پینٹ میں بن ٹانگ رہا تھا۔

"میشین سے ٹانگ لیتا بیٹا۔" رسول بخش چاچا کا وہ سب سے چھپتا کاری کرتھا۔ ہنرمند، مہنتی اور فرماں بردار، ان ہی تین خوبیوں نے اسے چاچا کی آنکھ کا تار بنا دیا تھا۔

"بجلی آنے میں زیادہ ٹانگ تھوڑی ہے۔" وہ دوبارہ بولے۔

"میشینوں کی مدد سے کام چلدی ہو جاتا ہے چاچا! وہ سر جھکا بے دستور بن ٹانگ رہا۔

"ہاں یہ ہی تو فائدہ ہے مشینوں کا۔" چاچا نے نہ سمجھنے والے انداز میں اسے دیکھا۔

"یہ ہی تو خرابی ہے مشینوں میں، کام چلدی ختم کر کے بندہ فارغ بیٹھ جاتا ہے۔" وہ دیر سے مسکرایا۔

"یہ تو اچھی بات ہے جھلے، ہر کوئی یہ ہی چاہتا ہے کہ کام چلدی چلدی نینا کر فارغ ہو کر آرام سے بیٹھے۔"

"مجھے مصروفیت اچھی لگتی ہے چاچا۔" وہ ایک گہری سانس لے کر تازہ مضبوط کرنے لگا۔

"کیوں۔ تیار دل نہیں چاہتا کہ ٹھکن سے جو بدن کو کچھ آرام دے، پاروں، دوستوں کے ساتھ موج

مستی کرے، میلہ کرے، تقریب کرے، یوں آدم بے زاد، سب سے الگ ٹھگ، کسی زندگی گزار رہا ہے یا تو!"

چاچا نے ذرا محبت اور بے تکلفی سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"میں کہاں زندگی گزار رہا ہوں، یہ تو زندگی ہے جو مجھے گزار رہی ہے۔" اس نے پینٹ ایک طرف رکھتے ہوئے دل ہی دل میں کہا۔

"کل سارے لڑکے بالے کانٹنن جارہے ہیں، تو بھی چلا جا سب کے ساتھ ذرا دل بہل جائے گا۔" اسے خاموش دیکھ کر چاچا نے صلاح دی۔

"میرا دل یہاں بھی بہل جاتا ہے چاچا!" اس نے آرام سے انہیں جواب دیا۔

"اللہ جانے کیسا لڑکا ہے، ایک کوٹے میں سر جھکا کر کام کرتے ہوئے ساری زندگی گزار دے گا۔" اس کے بے نیازی اور لاپرواہی سے کہنے پہ چاچا بڑبڑائے۔

"یہ گھوڑے عافیت بھی غنیمت ہے میرے لیے۔" شاہ میر کی آنکھوں کو حزن و ملال کے سائے گھیر گئے۔

"خوش رہا کر بچے اتنی سی عمر میں یہ خاموشی، یہ اداسی اچھی نہیں لگتی۔" چاچا کا انداز اس کے ساتھ پیش

مشفقانہ ہی ہوتا تھا۔

یہ سچ ٹانم تھا۔ سارے کاری گر کھانا کھانے باہر تھے۔ بس ایک وہی تھا جو ہمیشہ کی طرح اکیلا یہاں بیٹھا

تھا۔ اب تو چاچا جانے بھی اسے پہلے کی طرح ہر وقت سمجھانے اور نصیحتیں کرنا تم کروا تھا۔ کسی حد تک اس کی خاموشی،

نتہائی اور اداسی کے ساتھ وہ بھی جھوٹا کر چکے تھے مگر پھر بھی کبھی کبھی بھول چاچا کے جھینس کے آگے بین بجای

دیتا ہوں، حالانکہ نتیجہ معلوم ہے۔

"چاچا! تم تو کھانا کھا لو۔" شاہ میر کو اچانک ہی خیال آیا، اس نے ندامت سے چاچا کو دیکھا۔

اس کے اکیلے پن کی وجہ سے وہ وہیں اس کے پاس ہی بیٹھے اس سے دنیا جہاں کی باتیں کرتے رہتے تھے۔ شام کا اخبار جو تین بجے انہیں مل جاتا تھا۔ اس کی ساری خبریں جب تک شاہ میر کو سنا نہیں دیتے تھے، انہیں

کون نہیں ملتا تھا۔

"چاچا..... پورا اخبار شاہ میر کو یوں سناتا ہے جیسے وہ سچ سچ چاچا کو سن رہا ہو۔" حسن چاچا کو چھیڑتا۔

"مستنا ہے، وہ میری ہر بات غور سے سنتا ہے۔ تم لوگوں کی طرح نہیں ہے، سارے بدمعاش۔" چاچا حسب

وقع اس پر گرم ہوتے اور شاہ میر پر مہربان۔

"میرا بیٹا ہے وہ۔" دن میں ایک آدھ بار تو سارے لڑکوں کو یہ بات ضرور جانتے، جو اس بات سے بھی حظ

اٹھاتے تھے۔

"چاچا! اگر تو اپنی ساری جائیداد میرے نام لگا دے تو میں آج، ابھی سے حیرا بیٹا بننے کو تیار ہوں۔" یہ حقیقت

تھا، ایک پختہ خیالی چھوڑ کر ان سے دل لگی کرنا اور پھر دیر تک ان کی صلواتیں سنتا۔

"تو اپنے سنگے باپ کی اولاد نہ بننا ٹھیک سے، نافرمان، تو میرا بیٹا کیا خاک بنے گا۔ لاپٹی گدھ۔ یہ جو میرا

ہے نا جسے میں نے بیٹا بنایا ہے، تم جیسے پھچھوروں سے الگ ہے۔ اسے میری کیا، کسی کی بھی جائیداد سے، روپے

جیسے سے کوئی مطلب نہیں، یہ بے چارہ تو اپنی مزدوری بھی میرے پاس ہی رکھوا دیتا ہے، اسے کیا لالچ کسی چیز کا یا

روپے پیسے کا..... تو بڑا آیا بیٹا بننے والا، جائیداد کی اولاد۔"

"چاچا! شاہ میر اسے سارے پیسے تمہارے پاس رکھواتا ہے نا؟"

"ہاں تو۔" چاچا نہ سمجھنے والے انداز میں اسے دیکھتے۔

"تو یہ کہ آج سے شاہ میر میرا بیٹا ہے۔" حقیقت کے بولنے ہی سب کے منہ سے ایک زوردار قہقہہ نکلتا اور

چاچا کی ایسی ہنسی کہ جب تک حقیقت ان کی نظروں کے سامنے سے ناٹ جاتا، ان کے منہ سے اس کے لیے

مغفلت کی بارش ہوتی رہتی۔ شاہ میر کی آنکھوں کے سامنے روزانہ یہ سب تماشے ہوتے رہتے اور وہ یوں بے

نیازی سے سب کچھ دیکھتا، سنتا، لاتعلقی بناتا جیسے اس کے نہیں کسی اور کے مشفق ہوتی ہوں۔

چاچا اکیلا تھا، اس نے شادی نہیں کی تھی، جس گھر کے بیچے اس کی ٹیڑھک شاپ بھی۔ اس کی تیسری منزل پر

ایک کرفا چھڈا ہوا تھا جو ان کے اور شاہ میر کے تصرف میں تھا۔ برسوں سے وہ یہاں کے کرایہ دار تھے، شاہ میر کا

بچپن، لڑپن اور اب جوانی سب یہیں گزرے اور گزر رہے تھے۔

رات کو وہ سونے لیتا تو خیالات کی ایک ختم نہ ہونے والی زنجیر، اس کے وجود کے گرد اپنا گھیرا نگ کرتی

رہتی، دن بھر کی ٹھکن کے باوجود اسے بہت دیر میں نیند آتی تھی۔ تکلیف دہ خیالات کی زنجیر سے خود کو آزاد کرنے

کی کوشش میں وہ کروٹ پے کروٹ لیے جاتا اور رات کے کسی پہر نیند اپنی مہربان آنکھوں میں اسے لے لی جیتی

☆☆☆

نیلے رنگ کے جار جٹ کے سوٹ میں وہ میرے کی طرح دھک رہی تھی۔ جدید انداز کا بے حد فٹنگ کا

سوٹ، اس کا وہ پٹا بار بار پھسل پھسل کر، دھوت نکلا رہتے حسن سے، دیکھنے والوں کی نگاہیں خیرہ کر رہا تھا، اور

دیے بھی لگتا تھا۔ کون سی زیادہ تھیں، کل چار نظر رہیں۔ وہ اس کے شوہر سردار کی، جن میں بے وقوفی کی حد

تک سادگی اور بوی کے بے پناہ حسن سے بے نیازی تھی۔ دوسری دو نگاہیں اس کے دوست جمال کی تھیں، ان

آنکھوں میں وہ سب کچھ تھا جو اس کے دل میں تھا، لالچ، ہوس، عیاری، مکاری اس کے ناپاک غلیظ جذبات اس

کی آنکھوں سے جھلکتے تھے مگر سردان سب سے بے غافل تھا۔

سرمد کو لڈو ریک لے کر آیا تو جمال اپنے ہاتھوں سے اسے دو تین تھکے کھلا چکا تھا۔ اس کے آنے پر دونوں سنجیدہ ہو کر بیٹھ گئے۔

جمال آج یہاں سے رخصت ہوا تو وہ بہت خوش تھا۔ آج اکٹھے کی قدم آگے بڑھ گیا تھا۔ وہ اپنی منزل کی طرف، گھر واپسی کا سفر اس نے بڑی سرخوشی کے عالم میں طے کیا تھا۔

☆☆☆

صفائی ستھرائی عموں مہمانوں کی آمد پر ڈرائنگ روم پر خصوصی توجہ دی گئی تھی۔ پردے، صوفے، کھن، نالیچے، سجاولی اشیاء سے — ہر ایک شے پیلیک نیا جون، نئی بھاری۔

مہمانوں کے بارے میں یہ پتا تھا کہ لڈو اکثر ہے۔ عالیہ بیگم کی کسی جاننے والی کے محلے دار تھے تعریف اور تعارف تک بتایا گیا تھا کہ اچھے خاندانی لوگ ہیں، بولی شعل اعظم گڑھ کے شیخ ہیں۔ لڑکے کے برادر اور کہاں بہت بڑی زمین داری تھی، قیام پاکستان سے قبل لڑکے کے دادا اپنے علاقے کے ایک مشہور اور قابل وکیل تھے۔ پاکستان بننے کے بعد وہ یہاں آ گئے۔ لڑکے کے والد یہ ستر تھے۔ وہ انتقال کر گئے ہیں۔ آج اس جلی کے افراد حتمہ کو دیکھنے آ رہے تھے، عالیہ بیگم نے اپنی ساس صاحبہ کے حضور ساری تفصیلات گوش گزار کیں۔

مہمان مقررہ وقت سے ڈیڑھ گھنٹہ لیٹ ہو گئے تھے۔ انتظار کر کے سب بے زار ہو گئے۔ حتمہ کتاب لے کر بیٹھ گئی۔ عالیہ بیگم بار بار اپنی جاننے والی کا ہیر ملا تیں اور رابطہ ہونے پر ماپوس ہو کر موبائل رکھ دیتیں۔ شوہر صاحب اپنی والدہ ماجدہ کے ساتھ باتیں کرتے رہے پھر وہ اوتھنے لگیں تو وہ بی۔ وی۔ لاؤنج میں اخبار لے کر بیٹھ گئے۔ مانی اپنی بڑھائی میں مصروف تھا، بیٹی لیپ ٹاپ پر مصروف ہوئی۔ بیرون ملک مقیم دو چار گزرنے سے کمپیوٹر کے ذریعے بڑی اچھی دوستی ہو گئی تھی، اکثر ہی یہ لوگ آپس میں رابطے میں رہتے، ماریہ سب کی مصروفیات دیکھ کر کچھ کرپور ہونے لگی تو آ کر دادی کے سر ہوئی۔

”دادی حضور۔“

”اوں۔“ وہ آنکھیں بند کیے کیے ہی بولیں۔

”آپ کے لیے چائے لاؤں۔“ ماریہ نے انہیں جگانے کا نسخہ سوچا، حالانکہ وہ کون سا چمچ سو رہی تھیں۔

”چائے۔ مہمان آ گئے کیا۔“ انہوں نے بیٹ سے آنکھیں کھولیں۔

”اللہ جانے کب آئیں گے، ہم تو انتظار کر کر کے سوکھ گئے۔“ ماریہ نے منہ بنایا۔ گاؤں کی ٹھیک کیا اور ٹیک

لگا کر نیم ورائز ہو گئی۔

”دادی اعر فائدہ آئی ہیں نابراہر والی۔“

”ہوں۔“

”انہوں نے میر بھائی کی منگنی ختم کر دی۔“

”کیوں۔“ ماریہ کی توقع کے عین مطابق دادی سیدھی ہو کر بیٹھ گئیں۔

”کہہ رہی ہیں کہ اسے پہلے لوگ دیکھیں گے جو اپنی بیٹی کو خوب سارا بچہ اور دادا کو سلامی میں گاڑی دے سکے۔“

”تو پہلے ہی دعوہ شہتی ایسا گھرانہ، پانچ سال منگنی رکھنے کے بعد اب خیال آیا ہے۔“

”ہاں، دیکھیں ذرا، کتنی اچھی، کتنی پیاری عین نامیر بھائی کی منگیتیر، پھر چیں بھی ان کی کزن۔ سنا ہے میر

بھائی خوش نہیں ہیں اپنی منگنی ختم ہونے سے۔“ ماریہ نے ایک اور انکشاف کیا۔

”تمہاری عرفانہ آئی تو مجھے شروع سے ہی پسند نہیں ہے، اس کا تو وہ حساب ہے کہ آپ خود رہے آپ

مرادے، منگنی دیر بات کر وں اس کے قصیدے سنتے رہو۔ تو دلیتے کہیں کے۔ جب سے پیسہ گھر میں آیا ہے خود

”میں نے سوچا، بھابھی گھر آ گئی ہیں، کیوں تا اس خوشی میں ٹریٹ ہو جائے۔ لیں بھابھی! جلدی نہ انہیں پلیٹوں میں نکال لیں، بڑے زوروں کی جھوک لگ رہی ہے۔“ جمال نے بے تکلفی سے کہتے ہوئے بڑے بڑے شاپر زنا ملک کی طرف بڑھاے جنہیں کھولے بغیر ہی ان سے انواع و اقسام کی خوشبوئیں آ رہی تھیں۔ ”آپ نے کیوں زحمت کی جمال بھائی! ٹریٹ تو ہماری طرف سے ہونی چاہیے گی۔“ نائلہ نے شاپر زنا کے ہاتھ سے لیتے ہوئے رسا کہا۔

”ان تکلفات کو چھوڑیں بھابھی! ٹریٹ آپ کی طرف سے ہو یا میری طرف سے ایک ہی بار ہے۔“ جمال نے گویا ناک پر سے بھی کواڑ لایا۔

”ایک ہی بات کیسے ہے۔ ہماری طرف سے ٹریٹ ہوتی تو زیادہ سے زیادہ آلو گوشت سے آپ کی تو اہم ہو جاتی۔ آپ تو ماشاء اللہ دل کے بھی تخی، ہاتھ کے بھی تخی، کتنا خرچایوں ہی کر ڈالتے ہیں۔“ نائلہ نے تیز مزاج بولنے ہوئے شوہر کی کم مائیگی کو جتایا۔

سرمد محض پہلو بدل کر رہ گیا۔ اور جمال نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔

”جب وقت آئے گا تو آپ بھی اپنے خزانوں کے منہ کھول دیتا۔ ابھی تو بس ہماری سخاوت سے فائدہ اٹھائیں۔“ اس نے انتہائی معنی خیز انداز میں کہا۔

نائلہ نے شاپر زکھول کر ایک ایک کر کے چیزیں نکالنی شروع کیں۔ مشن بریانی، فرانی فیش، چکن تکر چٹنیاں، برائید، سلاد اور میٹھے میں رس ملائی اور آکس کریم، اس نے باقی چیزیں نکال کر آکس کریم فریزر میں رک دی تاکہ پھلنے سے بچے۔

دستر خوان لگا کر وہ کھانے بیٹھے ہی تھے کہ اچانک نائلہ کو کچھ خیال آیا۔

”سب کچھ تو جمال بھائی اپنی جیب سے لے ہی آئے، اب تم کم از کم کو لڈو ریک ہی لے آؤ۔“ وہ آہستہ سے سرمد سے مخاطب ہوئی۔

”لے آتا ہوں۔“ وہ فرماں برداری سے سر ہلاتا ہوا کو لڈو ریک لینے نکل گیا۔

”ایک منٹ جمال بھائی! میں گلاس لے آؤں، پھر بار بار اٹھتا پڑے گا۔“ نائلہ دستر خوان سے اٹھی، وہ کھڑی ہوئی اور اس کا دو پینچسل کر نیچے ڈھیر ہو گیا۔

”افوہ، ایک تو یہ آپ کا دو پینچ بڑا تنگ کرتا ہے۔“ جمال وہیں بیٹھا تھا، اس کے دوپٹے کو ہاتھ میں لے کر نائلہ کے عین سامنے کھڑا ہو گیا۔

”ایک طرف پھینک کیوں نہیں دیتیں اسے۔“ نائلہ کے سانچے میں ڈھلے انتہائی حسین پیکر کو اس نے اوپر سے نیچے تک دیکھا۔

”اللہ جمال بھائی، مذاق مت کریں دو چنادیں۔“ نائلہ کو کچھ احساس نہ تھا کہ وہ کس حالت میں، کس کے سامنے کھڑی ہے۔ اس نے لا پرواہی سے کہتے ہوئے دو چاند جمال کے ہاتھ سے چھینا اور گلاس لینے چل دی۔

”خوش کی خوشی میں پہلوا والہ میر ہے ہاتھ سے۔“ اس کے دستر خوان پر بیٹھے ہی جمال نے اسے مخاطب کیا۔

”ہمارے میاں کو تو توفیق نہ ہوئی تھی ایسی باتیں کرنے کی۔“ نائلہ نے منہ بنایا۔

”آپ کا شوہر تو بدھو ہے بالکل آپ کو تو کوئی قدر دان ملنا چاہیے تھا۔ میرے کی قدر تو جو ہری ہی کر سکتا ہے۔“ جمال نے ایک نایدہ درہنہ کی تار اس کے گرد بنا۔

”کھاؤ نا بھئی!“ جمال نے بے تکلفی سے چکن تھکے کا ٹکڑا اس کے منہ میں ٹھونسا۔

”اوں۔ ہوں۔“ وہ بیک وقت کھا بھی رہی تھی اور ہنس بھی۔

نہ غالب کو زیادہ سمجھنے کا دعو ہے، مگر اس مصرعہ میں ہزاروں خواہشوں سے مراد زرد جواہر یا تو نگری کی خواہش نہیں ہے۔
 ”ہماری پیچھے نہ تو یہی بتایا تھا۔“

کوشاخ وعفران سمجھنے لگی ہے۔ بھلا بتاؤ۔ سگی بہن بھانجی کو لات مار دی، وہ بھی چند گھنٹوں کے پیچھے۔ ارے میرے ہاتھ کا سٹیل ہے، آج میرے پاس ہل تیرے پاس، شریفوں میں وضع داری ہوئی ہے، زبان کا، جہد کا پاس ہو ہے، دوسرے کی عزت کا خیال ہوتا ہے۔ یہ ٹھوڑی کہ گھائی کی میری، تولے کی تیری، خود غرض لاچی لکھی کی۔“ دادی نے عرفانہ آئی کے غائبانہ لٹے لٹے شروع کر دیے۔
 ”آج کل روزانہ لڑکیاں دیکھو دیکھ کر آ رہی ہیں۔“ ماریہ ایک ایک کر کے خرابی پٹاری سے نکال رہی تھی۔
 ”ہاں تو ڈھونڈ بھی لے کی کوئی اپنے مطلب کی، ہوشیار تو ہے ہی۔ آپ ڈال ڈال، میں پات پات پھر جب سے چار پیسے گھر میں آئے تو چار عقل اور آ گئی۔“
 ”چار پیسے آنے سے چار عقل آتی ہے تو یہ جو کروڑ پتی اور ارب پتی ہیں ان کی عقل کا کیا ٹھکانا ہوگا۔ ہیں، دادی۔“

”معاذ وہ ہے بیٹی، لا چار کی پر بت سے زیادہ بیماری ہتی ہے، اللہ تعالیٰ اتنا ضرور دے کہ عزت کے ساتھ ضروریات پوری ہوئی رہیں، چار پیسہ ہو تو چار عقل آتی ہے، پیسہ ہاتھ میں نہ ہو تو آئی عقل بھی چلی جاتی ہے، اللہ تعالیٰ سب کی خبر رکھے۔“
 ”اور یہ تمہیں عرفانہ کے گھر کی خبریں کس نے دے دیں۔“ دادی کو اچانک خیال آیا۔
 ”ان کی بہن آئی ہیں کل رانی کے پاس، آپ دوائی کھا کر سو رہی تھیں، اس لیے امی نے اٹھایا نہیں۔ دادی وہ رو رہی تھیں، کہہ رہی تھیں کہ سگی بہن سے ایسی سید نہیں تھی، پانچ سال مٹکی رہی اور پھر توڑ دی۔ لوگ باتیں بناتے ہیں۔“

”اللہ بچی کے نصیب اچھے کرے۔“ دادی کا دل دکھ سے بھر گیا۔
 ”بزرگ کہا کرتے تھے کہ اپنا مارے بھی تو چھاؤں میں ڈالتا ہے، ارے بھئی ایک تو اپنوں کی مار، غیروں کی مار سے زیادہ تکلیف دہ ہوتی ہے پھر مارنے کے بعد کوئی چھاؤں میں ڈالے یا دھوپ میں، کیا فرق پڑتا ہے۔“
 ”دادی آپ کا وہ بچے موتیوں والا سیٹ ہے نا۔“ ماریہ نے اب اصل بات کی تمہید باندھی۔
 ”ہاں، تو۔“ دادی چونکی ہوئیں۔

”آپ نے کہا تھا وہ سیٹ آپ مجھے دے دیں گی۔“ ماریہ نے انہیں یاد دلایا۔
 ”حسنہ کی شادی ہے۔“ دادی نے مکمل ڈیل بیان کی جو ان دونوں میں ہوئی تھی۔
 ”ہاں تو آپ کی شادی پر ہی کہہ رہی ہوں۔ آج آ تو رہے ہیں مہمان، انہیں دیکھنے، رشتہ طے ہو جائے گا پھر شادی بھی ہو جائے گی۔“ ماریہ کا انداز بچوں والا تھا۔
 ”ماشاء اللہ، یوں بھٹی پھٹی یہ سوسوں نہیں جیتی بیٹا! مہمانوں کو آنے تو دو، پھر ہی کچھ پتا چلے گا، تم نے تو بیٹھے بیٹھے ہی محل کھڑا کر دیا۔“ دادی کو لگی آ گئی۔

”ہائے دادی! اچھا کچھ کا نہ سہی، خیالوں میں ہی محل کھڑا کر لیں۔“ ماریہ نے ایک آہ بھری۔
 ”تو بیٹا یہ محلوں میں رہنے والے سب ہی لوگ سہی ہوتے ہیں کیا۔ دل کی خوشی اطمینان اور قناعت کی دولت معمولی سے گھر میں بھی مل سکتی ہے تو مجھو بیڑا پار ہے، اللہ مغفرت کرے ہمارے ابا مرحوم اکثر کہا کرتے تھے کہ ہر چہ کیر بید مختصر کیر بد مطلب یہ کہ جو کچھ لو، ٹھوڑا، ٹھوڑی چیز پر قناعت کرو، زیادہ کی ہوس مت کرو۔“
 ”دادی حضور! پھر بچا غالب کیوں کہہ گئے کہ۔“ ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پر دم نکلے۔“ ماریہ نے کلمۂ اعتراض اٹھایا۔
 ”بھئی۔ وہ ٹھہرے شاعر! اپنے اشتہار میں کچھ بھی مضمون باندھ سکتے ہیں، ہم کوئی غالب کے شارح تو

”اے اباسے پوچھنا۔ اس معاملے میں ان کا علم اور مطالعہ ہم سے کہیں زیادہ ہے۔“
 ”ابا کی دو گھنٹے کی کلاس کون لے۔“ ماریہ نے کالٹی اور سستی کے عالم میں آنکھیں بند کیں۔ عین اسی وقت مینا سیٹ کی بیل بجی۔ ”مہمان آ گئے“ ماریہ کی ساری سستی، کالٹی اک دم غائب ہو گئی، وہ ایک چھلانگ مار کر تخت سے نیچر آئی۔
 ”دھیرج۔ بیٹا اتنی جلدی کس بات کی ہے۔“ دادی نے اسے ٹوکا۔ ”دو پٹا ٹھیک کر دو۔“
 ”کر رہی ہوں دادی حضور! ایک منٹ۔“ ماریہ نے جلدی جلدی ہاتھوں سے کپڑوں کی نادیہ شکنیں دور کیں دو پٹا ٹھیک سے اوڑھا۔
 ”کیسی لگ رہی ہوں۔“ شفاف، بے ریا آنکھیں، بھولے بھالے چہرے پہ کم عمری کا بائگن، کانوں میں چوٹی چوٹی بالیوں نے چہرے کی آرائش کر رکھی تھی۔
 ”ماشاء اللہ، میری بیٹی تو بہت پیاری ہے۔“ دادی کو بچی بھر کے اپنی لاڈلی، معصوم پوتی پہ پیار آیا۔
 ”افو، کہیں ایسا نہ ہو کہ مہمانوں کو ہماری یہ پری پسند آ جائے۔“ انہیں شرارت سوچھی۔
 ”دادی۔“ ماریہ نے ٹھیک کر آنکھوں میں ناراضی بھر کے انہیں دیکھا۔ اس کے خواب ابھی صرف اور صرف پڑھائی اور اے کیریز کے متعلق تھے۔
 ”چلو بھئی۔ ذرا مہمانوں کو بھی دیکھ لیں۔“ دادی آگے آگے ہولیں پوتی پیچھے پیچھے۔

☆☆☆

کینٹی میں دو دو ڈال کر اس میں پتی چینی ڈالی اور اسے چولہے پر رکھ کر ابلنے کا انتظار کرنے لگی۔ قریبی صاحب اور فرمان صاحب کے ساتھ آج عقل بھی تھی۔ مذہب، سیاست، معاشرہ کتنے ہی موضوعات تھے جن پر خیال آرائی کی گئی۔ اب سید صاحب اپنے مہمانوں کی خاطر داری کے لیے کچن میں آ گئے تھے۔ گھر کے خصوصاً کچن کے بہت سے کام وہ بخوبی سرانجام دے لیتے تھے۔ حالات نے سب کچھ سکھادیا تھا، ٹرے میں تین کپ چائے لے کر وہ اپنے دوستوں کے پاس آ گئے۔
 ”دو بھئی سید صاحب! بیٹی کو رخصت کیا تھا تو ایک، یہ بھی گھر میں لے آتے، ہانڈی چولہے کی مشقت سے بچتے۔“ فرمان صاحب نے با آواز بلند کئی بار کا دیا ہوا مشورہ آج پھر دیا۔
 ”مذہم راضی نہیں، کہتا ہے کچھا کچھ لکھش ہو جاؤں، پھر شادی کروں گا۔ ویسے تو گھر کے کام کاج کا اتنا بڑا مسئلہ نہیں ہے جیسے بی دن میں آپ کر سب کام کر جاتی ہیں۔ کھانا وغیرہ بھی پکا کر رکھ جاتی ہیں۔ ہر ماہ خواہ دے دیتے ہیں ان کو، تو فی الحال تو گزراہ چل ہی رہا ہے مگر ہاں یہ ہے کہ گھر میں ایک عدد عورت کی موجودگی ضروری ہے۔ سو سمجھتے ہو تو ہیں، سو سمجھیں، ہم کہاں تک ان سے نہیں۔“
 ”تو انہیں رشتہ تو دیکھیں۔ بات چلائیں، رشتہ طے ہو جائے گا تو صاحبزادے ابھی رسد نہ آ کر بھاگ رہے ہیں آ کر خود ہی کھوٹے سے بندھ جائیں گے۔“ قریبی صاحب نے انہیں صلاح دے کر ایک زوردار قہقہہ لگایا۔
 ”دیکھتے ہیں، آپ چائے تو لیں۔“ سید صاحب زبردست مسکرائے۔
 ”آپ کہیں تو کسی سے ذکر کروں آگے بڑکی دیکھنے کے لیے۔“ فرمان صاحب نے ذرا آگے جھک کر راز دارانہ انداز میں کہا۔

کوشاخ زعفران سمجھنے لگی ہے۔ بھلا بتاؤ۔ مگر بہن بھانجی کولات مار دی، وہ بھی چند ٹکوں کے پیچھے۔ ارے ہاتھ کا میل ہے، آج میرے پاس، کل تیرے پاس، شریفوں میں وضع داری ہوتی ہے، زبان کا، جہد کا پاس ہے، دوسرے کی عزت کا خیال ہوتا ہے۔ یہ ٹھوڑی کہ گھائی کی میری، تو لے کی تیری، خود غرض لایا گی کی۔ "دادی نے عرفانہ انٹی کے غائبانہ لٹے لیتے شروع کر دیے۔

"آج کل روزانہ لڑکیاں دیکھ دیکھ کر آ رہی ہیں۔" ماریہ ایک ایک کر کے خبر اپنی چاری سے نکال رہی تھی "ہاں تو ڈھونڈ بھی لے کی کوئی اپنے مطلب کی، ہوشیار تو ہے ہی۔ آپ ڈال ڈال، میں پات پات جب سے چار پیسے گھر میں آئے تو چار عقل اور آگئی۔

"چار پیسے آنے سے چار عقل آتی ہے تو یہ جو کروڑ پتی اور ارب پتی ہیں ان کی عقل کا کیا ٹھکانا ہوگا۔ دادی۔

"مخاورہ ہے بیٹی، لا چاری پر بت سے زیادہ بیماری ہتی ہے، اللہ تعالیٰ اتنا ضرور دے کہ عزت کے سرائ ضروریات پوری ہو رہی ہیں، چار پیسہ ہو تو چار عقل آتی ہے، پیسہ ہاتھ میں نہ ہو تو آئی عقل بھی چلی جاتی ہے، اللہ تعالیٰ سب کی خیر رکھے۔

"اور یہ تمہیں عرفانہ کے گھر کی خبریں کس نے دے دیں۔" دادی کو اچانک خیال آیا۔

"ان کی بہن آئی تھیں کل رانی کے پاس، آپ دو الی کھا کر سو رہی تھیں، اس لیے اسی نے اٹھایا نہیں۔ دادی وہ رو رہی تھیں، کہہ رہی تھیں کہ کسی بہن سے ایسی میڈ نہیں تھی، پانچ سال مچھلی رہی اور پھر توڑ دی۔ لوگ باتیں بنا رہے ہیں۔"

"اللہ بچی کے نصیب اچھے کرے۔" دادی کا دل دکھ سے بھر گیا۔

"بزرگ کہا کرتے تھے کہ اپنا مارے بھی تو چھاؤں میں ڈالتا ہے، ارے بھی ایک تو اینوں کی مارے غیروں کی مارے زیادہ تکلیف دہ ہوتی ہے پھر مارنے کے بعد کوئی چھاؤں میں ڈالے یا دھوپ میں، کیا فرق پڑتا ہے۔

"دادی! آپ کا وہ سچے موتیوں والا سیٹ ہے نا۔" ماریہ نے اب اصل بات کی توجہ باندھی۔

"ہاں تو۔" دادی چونکی ہوئیں۔

"آپ نے کہا تھا وہ سیٹ آپ مجھے دے دیں گی۔" ماریہ نے انہیں یاد دلایا۔

"حسنہ کی شادی پہ۔" دادی نے مکمل ڈیل بیان کی جو ان دونوں میں ہوئی تھی۔

"ہاں تو آپ کی شادی پر ہی کہہ رہی ہوں۔ آج آ تو رہے ہیں مہمان، انہیں دیکھنے، رشتہ طے ہو جائے گا پھر شادی بھی ہو جائے گی۔" ماریہ کا انداز بچوں والا تھا۔

"ناشاء اللہ، یوں چھٹی پر سرسوں نہیں جتنی بیٹا! مہمانوں کو آنے تو دو، پھر ہی کچھ پتا چلے گا، تم نے تو بیٹھے بیٹھے ہی محل کھڑا کر دیا۔" دادی کو لگی آگئی۔

"ہائے دادی! اچھ کچ کا نہ کھی، خیالوں میں ہی محل کھڑا کر لیں۔" ماریہ نے ایک آہ بھری۔

"تو بیٹیا یہ محلوں میں رہنے والے سب ہی لوگ سمجھی ہوتے ہیں کیا۔ دل کی خوشی اطمینان اور قناعت کی دولت معمولی سے گھر میں بھی مل تو جائے تو سمجھو بیٹا پار ہے، اللہ مغفرت کرے ہمارے ابا مرحوم اکثر کہا کرتے تھے کہ ہر چیز گیرید مختصر گیرید مطلب یہ کہ جو کچھ تو خود آلو، خود ڈی چیز پر قناعت کرو، زیادہ کی ہوس مت کرو۔"

"دادی حضور! پھر بچا غالب کیوں کہہ گئے کہ۔" ہزاروں خواہشیں انہیں ایسی کہ ہر خواہش پر دم ٹکے۔ "ماریہ نے کلمہ اعتراض اٹھایا۔

"بھئی۔ وہ ٹھہرے شاعر! اپنے اشعار میں کچھ بھی مضمون باندھ سکتے ہیں، ہم کوئی غالب کے شارح تو نہیں۔

غالب کو زیادہ سمجھنے کا دوا ہے، مگر اس مصرعہ میں ہزاروں خواہشوں سے مراد زرد جواہر یا تو نگری کی نہیں ہے۔

"ہماری سچ نے تو یہی بتایا تھا۔"

"اپنے ابا سے پوچھتا۔ اس معاملے میں ان کا علم اور مطالعہ ہم سے کہیں زیادہ ہے۔"

"ابا کی دو سمجھنے کی کلاس کون لے۔" ماریہ نے کاہلی اور سستی کے عالم میں آنکھیں بند کیں۔ عین اسی وقت بیٹ کی ہیل بجی۔ "مہمان آ گئے۔" ماریہ کی ساری سستی، کاہلی اک دم غائب ہو گئی، وہ ایک چھلانگ مار کر تخت پر اتر گئی۔

"دھیرج۔ بیٹا اتنی جلدی کس بات کی ہے۔" دادی نے اسے ٹوکا۔ "دو پٹا ٹھیک کرو۔"

"دیکھ رہی ہوں دادی حضور! ایک منٹ۔" ماریہ نے جلدی جلدی ہاتھوں سے کپڑوں کی نادیہ ٹکئیں دور دھو پٹا ٹھیک سے اوڑھا۔

"کیسی لگ رہی ہوں۔" شفاف، بے ریا آنکھیں، بھولے بھالے چہرے پہ کم عمری کا بائکس، کانوں میں لی چھوٹی بایلوں نے چہرے کی آرائش کر رکھی تھی۔

"ناشاء اللہ، میری بیٹی تو بہت پیاری ہے۔" دادی کو جی بھر کے اپنی لاڈلی، معصوم پوتی پہ پیار آیا۔

"افوہ، کہیں ایسا نہ ہو کہ مہمانوں کو ہماری یہ پری پسند آ جائے۔" انہیں شرارت ہو گئی۔

"دادی۔" ماریہ نے ٹھٹھک کر آنکھوں میں ناراضی بھر کے انہیں دیکھا۔ اس کے خواب ابھی صرف اور صرف عکاسی اور اسے کیریز کے متعلق تھے۔

"مچلو بھئی۔ ذرا مہمانوں کو بھی دیکھ لیں۔" دادی آگے آگے ہوئیں پوتی پیچھے پیچھے۔

☆☆☆

کیتلی میں دو وہ ڈال کر اس میں جتنی ڈالی اور اسے چوہے پر رکھ کر ایلنے کا انتظار کرنے لگی۔ قریشی صاحب اور فرمان صاحب کے ساتھ آج مختل جی تھی۔ مذہب، سیاست، معاشرہ کتنے ہی موضوعات تھے جن پر ال آرائی کی گئی۔ اب سید صاحب اپنے مہمانوں کی خاطر داری کے لیے کچن میں آ گئے تھے۔ گھر کے خصوصاً کچن کے بہت سے کام وہ بخوبی سرانجام دے لیتے تھے۔ حالات نے سب کچھ سکھا دیا تھا، ٹرے میں تین کپ لے لے کر وہ اپنے دوستوں کے پاس آ گئے۔

"بھئی سید صاحب! بیٹی کو رخصت کیا تھا تو ایک بہو بھی گھر میں لے آتے، ہانڈی چوہے کی مشقت سے بچتے۔" فرمان صاحب نے با آواز بلند کنگی بار کا دیا ہوا مشورہ آج پھر دیا۔

"مذہم رہتی نہیں، کہتا ہے کچھ سنگیلاش ہو جاؤں، پھر شادی کروں گا۔ ویسے تو گھر کے کام کاج کا اتنا بڑا مسئلہ نہیں ہے طبعی بی دن میں آ کر سب کام کر جاتی ہیں۔ کھانا وغیرہ بھی پکا کر رکھ جاتی ہیں۔ ہر ماہ خواہ دے دیتے ہیں ان کو، تو فی الحال تو گزارہ چل ہی رہا ہے مگر ہاں یہ ہے کہ گھر میں ایک عدد عورت کی موجودگی ضروری ہے۔ سو بکھڑے ہوتے ہیں بسوا بھنیں، ہم کہاں تک ان سے ہیں۔"

"تو انہیں رشتہ تو دیکھیں۔ بات چلا لیں، رشتہ طے ہو جائے گا تو صاحبزادے ابھی رسدہ ٹوا کر بھاگ رہے ہیں آ کر خود ہی کھوٹے سے بندھ جائیں گے۔" قریشی صاحب نے انہیں صلاح دے کر ایک زرد واز بچہ لگایا۔

"دیکھتے ہیں، آپ جاتے تو گھر۔" سید صاحب زیر لب مسکرائے۔

"آپ کہیں تو کسی سے ذکر کروں آگے، لڑکی دیکھنے کے لیے۔" فرمان صاحب نے ذرا آگے جھک کر راز دارانہ انداز میں کہا۔

”لجے ابھی کوئی پوچھنے والی بات ہے۔“ کوئی اچھی سی لڑکی دیکھیں اور بتائیں سید صاحب کو تاکہ اسے اڑیل ٹوک کھوٹے سے باندھیں۔“ قریشی صاحب ذرا ہنسوز طبیعت کے تھے، خود تو ہنستے ہی تھے، دوسروں کو بھی ہنساتے تھے۔

”تو پھر سید صاحب! مسجد کعبہ کی صدارت سے انکار کیوں کر دیا؟“ فرمان صاحب نے دیر سے لوکر زبان پر بھگتا ہوا سوال پوچھ ہی لیا۔

”بس یونہی فرمان بھائی! خود کو اس قابل نہیں سمجھتا، اس لیے انکار کر دیا۔“ سید صاحب نے چائے کی چمکی لیتے ہوئے رساں سے جواب دیا۔

”کیا کیا بات ہوئی بھلا، آپ جیسے نیک، معزز اور ایمان دار لوگ پیچھے رہیں گے تو کرسٹ افراد کو اپنی من مانی کرنے اور آگے آنے کا موقع ملے گا۔“ قریشی صاحب گویا تپ کر بولے۔

”بعد میں دیکھیں گے، ابھی تو شاید اعزاز صاحب کو یہ عہدہ تفویض کیا جا رہا ہے۔“ سید صاحب نے بات ہی ختم کر دی۔

☆ ☆ ☆
گیارہ بج کر پانچ منٹ ہو چکے تھے۔ وہ کبھی گھڑی کی طرف دیکھتیں، کبھی دروازے کی طرف، احمد ابھی تک نہیں آیا تھا۔ انہیں تشویش ہو رہی تھی، بیٹا اس وقت تک تو گھر آ جاتا تھا، شہر کے حالات کے سبب ان کی تشویش، فکر اور پریشانی بے جا نہ تھی۔

آدھا دن احمد کالج میں ہوتا تھا، وہ بی کام کر رہا تھا۔ پھر شام چار بجے سے رات دس بجے تک ایک جنرل اسٹور میں پارٹ ٹائم ملازمت کرتا تھا۔ ساڑھے دس، پونے گیارہ تک وہ گھر ضرور پہنچ جاتا تھا مگر آج آدھ گھنٹہ اوپر ہو گیا تھا اور وہ ابھی تک نہیں آیا تھا۔

”قون ملا۔“ وہ بار بار بے چینی سے عائشہ سے پوچھ رہی تھیں، جو کئی بار احمد کا نمبر لٹائی کر چکی تھی مگر بحال اس سے کوئی رابطہ نہیں ہوا تھا۔

”نہیں امی! موبائل آف ہے شاید۔“ عائشہ نے نفی میں سر ہلایا۔

”اللہ خیر کرے، نہ جانے کیا بات ہے، اگر دیر ہو بھی گئی تو بتا دیتا نہ اس نے فون کیا، نہ یہاں سے کال جا رہی ہے۔“ امی کے چہرے سے پریشانی عیاں تھی۔ اندر آنکھوں میں خوف و خدشات کے سائے تھے۔

”پریشان نہ ہوں امی! کیا پتا دکان پر دیر ہوئی ہو، آ رہے ہوں گے بھائی۔“ عائشہ نے ماں کو متشکر دیکھ کر تسلی دی حالانکہ اندر ہی اندر پریشان تو وہ بھی ہو رہی تھی مگر اس نے خود کو ماں کے سامنے پرسکون رکھا ہوا تھا۔

وہ زیر لب دعا میں پڑھ پڑھ کر احمد کی سلامتی اور عافیت کی دعائیں مانگ رہی تھیں، جب ساڑھے گیارہ بجے دروازے پر ہانوس دستک ہوئی، احمد ہی تھا ہاں بے نیہ ہانوس دستک سن کر خدا کا شکر ادا کیا۔ ایک گھر اسانس سکون کا لیا۔ عائشہ فوراً دروازہ کھولنے لگی۔

”السلام علیکم! احمد تمکا پارا گھر میں داخل ہوا اور ماں کے پاس تخت پر لیٹ گیا۔

”بڑی دیر لگادی آج، میرا تو بی ہول رہا تھا کہ جانے کہاں رہ گیا، ابھی تک آیا کیوں نہیں۔“ امی نے بیٹے کو گھر پہ خیریت کے ساتھ موجود پایا تو ان کی جان میں جان آئی، پھر بھی وہ پوچھنے بغیر نہ رہ سکیں۔

”بھائی، پانی۔“ احمد کے جواب دینے سے مل ہی عائشہ گلاس میں پانی لے آئی۔

”جزاک اللہ۔“ احمد نے اٹھ کھڑا ہوا، اور گلاس والی اس عائشہ کو دیا۔

”ڈبل سواری پہ پابندی لگ گئی ہے نا۔“ سرور بھائی لفٹ دے دیتے تھے گھر تک۔ اب آج دین سے آیا

گھر کے قریب اترتا تو دو بیسیں بندنی پڑتیں، ایک ہی دینگن میں آیا ہوں۔ ایک اسٹاپ پیدل چل کر گھر ہوں۔ موبائل کی جارنگ ختم ہوگئی تھی، اس لیے کوئی رابطہ بھی نہیں کر سکا۔“ احمد بولتا ہوا دوبارہ لیٹ گیا۔

”میں روٹیاں ڈال لوں، پھر کھانا لگاتی ہوں۔“ عائشہ کچن میں چلی گئی۔

”آج پھر گیس چلی گئی۔“ احمد مسکرایا، وطن عزیز کے باسی اپنے حالات پر کب تک روتے، اب بھی مسکرا بھی رہے، اور بھی ہنس پڑتے۔

”ہاں بیٹا! اب تو معمول بننا جا رہا ہے بجلی ہوتی ہے تب بھی گیس چلی جاتی ہے، اور بجلی نہ ہو تو گیس لازمی جاتی ہے۔“ وہ یہ بھی کہ کر لوڈ شیڈنگ کے ٹائم میں لوگ جزیئر چلا تے اور پیٹرول کی قیمت آسان کو چھونے کے

باعث تقریباً سب ہی جزیئر مالکان اپنے جزیئر گیس پر چلا تے تھے۔ ادھر محلے بھر کے کئی گھروں میں جزیئر اشارت ہوتے ادھر سب گھروں میں چوہوں کی آواز ختم ہو جاتی۔ اب جس کو چاہے پر کچھ پکاتا ہو وہ ڈھالی ٹین سٹین کی لوڈ شیڈنگ ختم ہونے کا انتظار کرے۔

گھر میں احمد کے آنے پر تینوں ایک ساتھ کھانا کھاتے۔ سو عائشہ بھائی کے آنے پر نفاٹ روٹیاں پکاتی اور درخان لگا دیتی، اب بھی اس نے پھرتی سے روٹیاں پکائیں اور کھانا چن دیا۔ ماش کی پھریری وال، بجلی ہوئی مرنجیں اور اچار۔

”سرور بھائی اگلے مہینے سے دوسروپے بڑھا دیں گے۔“ احمد نے کھانے کے دوران بتایا۔

”شکر ہے اللہ کا، وہ مسبب الاسباب ہے اور کچھ نہیں تو گیس کا بل بھرنے میں آسانی ہو جائے گی۔“ امی نے حسب عادت فوراً شکر ادا کیا۔

یہ شکر تو شاید ان کی گھنٹی میں پڑا تھا، اٹھتے بیٹھتے، دن بھر میں سینکڑوں بار وہ کتنی ہی باتوں پر کلمہ شکر منہ سے ادا کرتی رہتی تھیں، عائشہ اور احمد اپنے بچپن سے ہی ماں کے اسی انداز کے عادی تھے، مگر بھی کبھی وہ ایسی باتوں پر بھی شکر ادا کرتی تھیں کہ عائشہ حیران ہو کر بے اختیار سوال کر لیتی تھی، سر میں درد ہو، بخار یا کوئی اور جسمانی تکلیف، وہ اس حال میں بھی اللہ کا شکر ادا کرتیں۔ احمد یا عائشہ کسی تکلیف سے دوچار ہوتے تو انہیں بھی شکر کی تلقین۔

”بیاری میں کس بات کا شکر، آپ ہی تو کہتی ہیں کہ شکر کرنے سے اللہ اور زیادہ دیتا ہے، بیاری کا شکر کریں تو بیاری بڑھے گی نہیں۔“ عائشہ چڑ جاتی۔

”شکر بیاری کا نہیں، اس بات کا ہے کہ اللہ نے اس سے بڑھ کر کسی اور تکلیف میں مبتلا نہیں کیا اور مومن کے لیے دکھ اور بیاری میں بھی اجر کمانے کا موقع ہے اگر صبر کرے تو پھر دنیا کی تکلیف ہے ختم ہوئی جائے گی اللہ آخرت میں ہر آفت اور دکھ درد سے محفوظ رکھے۔“

☆ ☆ ☆
ایک دو تین۔ اور خوش گوار دن اسے اختتام پڑھا، چاہا جائے گھڑی کی سوئیوں پر نظر دوڑائی، مانچ بجتے کھتے، اپنی بوڑھی، چمکی ہوئی آنکھوں کو کچھ لمحوں کے لیے بند کر کے انہوں نے پہنوں کو سہلایا اور چمچر آکھیں کھول دیں۔

”السلام علیکم چاچا۔“ سائے حسن کا ہنسا مسکراتا چہرہ تھا۔

”ارے تو کب آیا۔“ انہیں خوش گوار حیرت ہوئی۔

”بس ابھی ابھی، جب تم جانے کس کے خیالوں میں گم آنکھیں بند کیے بیٹھے تھے۔“ وہ مسکرایا۔

”اب بڑھا ہے میں کس کے خیال آئیں گے بیٹا اب تو روزانہ بس ایک ہی خیال آتا ہے کہ جانے کب موت کے فرشتے آئیں اور ہمیں لے جائیں۔“ مسیدہ سے ہو کر بیٹھ گئے۔

”ارے چاچا! تم تو تمہاری لمبی عمر کی دعائیں کرتے ہیں۔ تمہارے ہاتھ کے علاوہ کسی اور کی سلامتی تو ہمیں

پسند ہی نہیں آتی۔
”بس بیٹا، ذرہ نوازی ہے آپ لوگوں کی۔“ وہ انکساری سے گویا ہوئے۔
”میرا سوٹ تیار ہے۔“

”بالکل تیار ہے۔“ چاچا نے اثبات میں جواب دیتے ہوئے حفیظ کو آواز لگائی۔
”حفیظ! بلیک ٹوٹیں نکال دے حسن کا۔“
”آیا استاد۔“ حفیظ فوراً ہی اس کا سوٹ لے کر حاضر ہو گیا۔

”چاچا! ہمارے دانیال صاحب کو ایک کاریگر چاہیے، پارٹ ٹائم میں شام چھ سے دس بجے تک۔ دراصل وہ اپنا نیا بوتیک شروع کر رہے ہیں، بہادر آباد میں۔“ حسن چاچا سے مخاطب ہوا۔
”کیوں بے حفیظ! تو جائے گا، دیے بھی تجھے آج کل پیسوں کی زیادہ ضرورت رہنے لگی ہے۔“ چاچا نے حفیظ سے پوچھا۔

”چلے جائیں گے چاچا، بس لاناؤنٹ صبح ملنا چاہیے۔“ حفیظ کی بانجھیں کھل گئی تھیں جب سے اس کی منگنی ہوئی تھی۔ وہ زیادہ سے زیادہ رقم جوڑنے پہ لگا ہوا تھا تا کہ شادی و محوم دھام سے کر سکے۔
”اپنا نمبر دے دے حسن کو، جو بھی بات کرنی ہو کر لیتا۔“
”ہاں، اپنا نمبر بھی دے دو اور میرا بھی لے لو۔“ حسن نے اپنا موبائل جیب سے نکالتے ہوئے کہا۔

☆☆☆

فجر کی نماز کے بعد وہ معمول کے مطابق درود و وظائف پڑھ رہی تھیں، عانتناشتہ بنا کر فارغ ہو چکی تھی اور اب احمد کو آواز لگا رہی تھی۔

”آ رہا ہوں، بس ایک منٹ۔“ وہ جلدی جلدی شرٹ کے بٹن بند کرتا ہوا آیا اور ناشتا کرنے لگا۔
”لیٹ ہو گیا یا رہ۔“ اس نے جلد ہی پراٹھے سے ہاتھ کھینچا۔ چائے کا کپ منہ سے لگایا اور اپنا بیگ لے کر ماں کے آگے کھڑا ہو گیا۔ ان کا معمول تھا کہ دونوں بچوں کے باہر نکلنے سے پہلے آیت الکرسی اور دعائیں پڑھ کر دم کر لیتی تھیں۔

”بیٹا! ناشتہ تو ٹھیک سے کر لیتے۔“ انہوں نے دم کر کے بیٹے کو فخر اور محبت سے دیکھا، ان کا مانتی لائق اور فرماں بردار بیٹا، دیکھتے ہی دیکھتے اتنا لمبا ہو گیا تھا۔ وہ تو اب اس کے کاندھے تک آئی تھیں۔
”کانٹ میں کچھ کھالوں گا امی! اس وقت تو بہت دیر ہو گئی ہے۔“ اس نے ہاتھ پہ بندھی گھڑی پہ نگاہ ڈالی اور تیزی سے باہر نکل گیا۔

اسٹاپ پکھڑا وہ بے چینی سے بس کا انتظار کر رہا تھا۔ روزانہ پڑوس کے کامران انگل اپنی بانیک پر اسے لٹھ دے دیتے تھے، ان کے آفس کے رستے میں احمد کا کان پڑتا تھا۔ ڈبل سواری پر پابندی کی وجہ سے وہ اکثر اس سہولت سے محروم ہو جاتا تھا۔ آج بھی وہ اسی لیے بس پر جا رہا تھا۔

بس آئی مگر کھانچا بھری ہوئی۔ بس کی چھت پر بڑی مشکل سے آگے کوٹنے میں جگہ ملی ہے۔ ڈرائیور تیز رفتاری کے ساتھ بس کو چلائیں بلکہ اڑا رہا تھا، ایک موڑ کاٹتے ہوئے اتنا زور کاچھٹکا لگا کہ چھت پہ بیٹھے گی افراد ایک دوسرے پر لڑھک گئے اور آگے کوٹنے میں بیٹھے احمد اور اس کے ساتھ بیٹھا ایک شخص دونوں قلابازی کھاتے ہوئے چھت سے نیچے آن گرے لوگوں کی چیخیں، اچانک لگنے والے بریکوں اور چرچراتے ٹائروں کی آوازیں فضا میں گونج اٹھیں۔

(باقی آئندہ بابا انشا اللہ)

”آ رہی تھی کا کیا مطلب ہے۔ اب کیا حیات مرگئی ہیں یا تاک نے کام کرنا چھوڑ دیا ہے۔“ عادل نے کڑے تیوروں سے اس کو گھورتے ہوئے کہا۔
اس اس کی بات پر گڑبڑا گیا۔

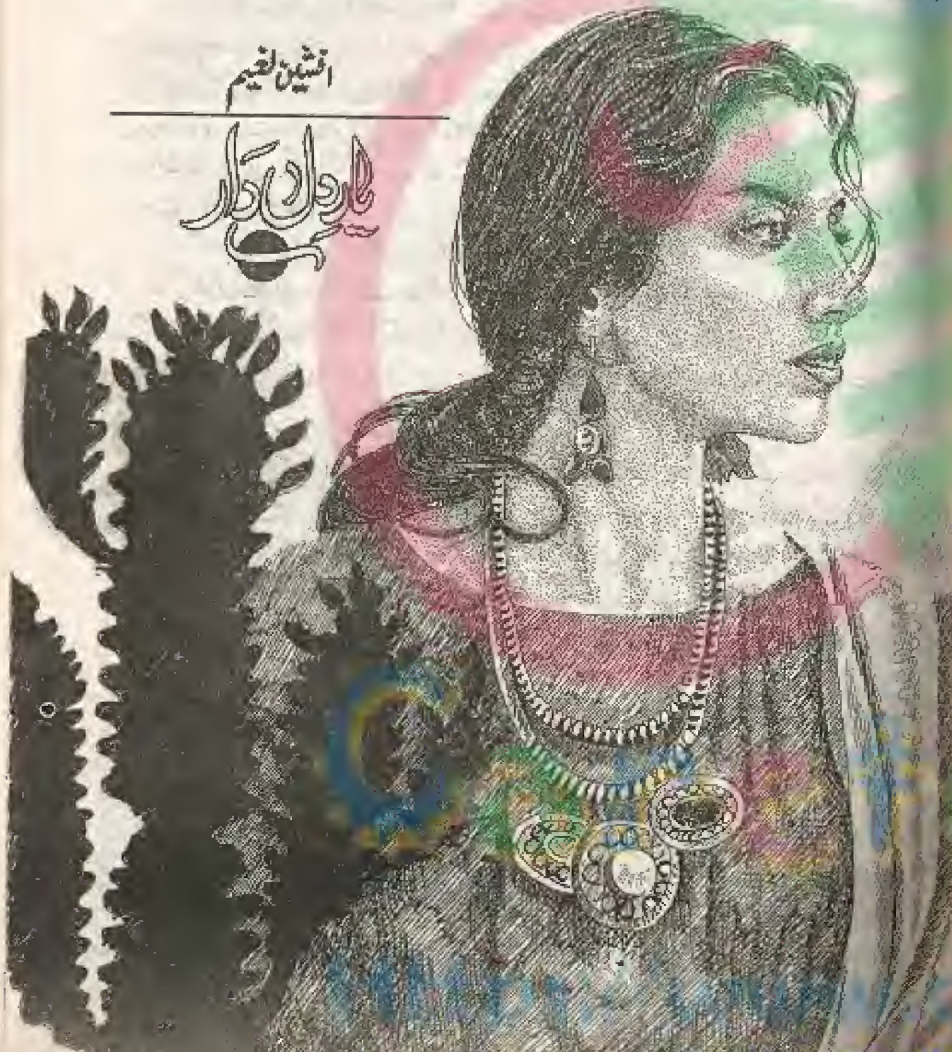
”نہیں، وہ اصل میں جیسے ہی ہم لوگ گلی میں داخل ہوئے چاولوں کی سوندھی سوندھی مہک نے ہمارا دل خوش کر دیا تو بے اختیار ہی دل سے دعا نکلی تھی کہ یا اللہ! ان چاولوں کو ہمارا بھی نصیب بنادے۔ اب یہ

گھر میں داخل ہوتے ہی اس اور حیدر کا استقبال بریائی کی اشتہا انگیز خوشبو نے کیا۔
عادل چوہے کے پاس بیٹھا بریائی کو غالباً فاسل ڈال دے رہا تھا۔

”واؤ! زبردست، یہ اس قدر دل بھانے والی خوشبو ہمارے گھر سے آ رہی تھی۔ یقین نہیں آ رہا مجھے۔“ اس نے بڑے بے ساختہ انداز میں اپنے جذبات کا اظہار کیا۔

اشیئن نعیم

مارون دکر



علم نہیں تھا کہ یہ ہمارا ہی نصیب نہیں گئے۔“ انس نے جلدی جلدی وضاحت پیش کی۔

”اچھا تو یہ بات تھی۔“ عادل نے سر ہلایا (گویا وضاحت قبول کر لی تھی)۔

عادل سے سلام دعا کے بعد وہ اندر آئے تو احسن کو سلام دے کر بیٹھا۔

”بھئی، یہ اتنا اہتمام کس خوشی میں ہو رہا ہے؟“ حیدر نے ایک کھیر اٹھا کر منہ میں رکھتے ہوئے پوچھا۔

”میں تو جب گھر آیا تھا تو جناب اعزت مآب عادل صاحب کو برائی کی تیاری میں مشغول پایا۔

پوچھنے پر محض اتنا بتایا گیا کہ یہ ان کی طرف سے ایک سربراہز پارلی ہے۔ اب سربراہز سے کس خوشی میں یہ وہ بعد میں بتائیں گے۔“ احسن نے کندھے اچکاتے ہوئے معلومات بہم پہنچائیں۔

”مولوی کدھر ہے؟“ حیدر کو محبت اللہ کا خیال آیا۔

”دہی لئے گیا ہے۔ راستے کے بغیر مولوی کے حلق سے برائی نہیں اترتی۔“ احسن نے سلام دے کاٹے

کاٹے جواب دیا۔

اتنی دیر میں محبت اللہ دہی لے کر آ گیا۔

”مجھے دیں، میں راستہ بناتا ہوں۔“ انس نے اس کے ہاتھ سے دہی لے لیا۔

”مجھے حیدر بھائی! آپ ہم سب کو نکال کر دیں۔ آخر آپ ہم سب سے سنیئر ہیں۔“ عادل نے

برائی کا دیگچہ حیدر کے سامنے رکھتے ہوئے ادب سے کہا۔

”اتنی عزت۔“ حیدر کا منہ کھل گیا مارے حیرت کے۔ عادل کی آنکھوں میں جھانکا۔ عادل نے

آنکھیں پٹپٹا کر اثبات میں سر ہلایا۔

”یہ تو نے حیدر کو سنیئر کس حساب سے کہا ہے؟“ احسن کو ایک ہی بات قابل گرفت نظر آئی۔

”نکاح شدہ ہونے کے حساب سے۔“ عادل نے اپنی بات کی وضاحت کی۔

”اوہ اچھا۔“ حیدر نے سر ہلایا۔

پلیٹوں میں سب کو برائی دینے کے بعد حیدر نے اپنی پلیٹ میں برائی نکالی۔ پہلا چمچ منہ میں رکھا۔

”واہ بھئی واہ، کیا ذائقہ ہے۔“ حیدر نے تو صبی انداز میں عادل کو دیکھا۔

”اتنی شان دار برائی بنائی تو نے کہاں سے سیکھی؟“ حیدر نے ایک اور چمچ منہ میں رکھا۔

”یہاں سے۔۔۔۔۔“ عادل نے ایک طرف پڑے برائی مسالے کے ڈبے کی طرف اشارہ کیا۔

باقی تمام لوگ خاموشی سے برائی سے انصاف کرنے میں مشغول تھے۔

”اب تو بتادے بھائی! یہ ٹریٹ ہے کس خوشی میں؟“ احسن نے عادل کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”اصل میں نا۔۔۔۔۔ مجھے ترس آ گیا تھا۔“ عادل نے برائی کا نوالہ حلق سے اتارتے ہوئے کہا۔

”جھے، ہم پر ایسا ترس آیا کہ برائی کی دعوت کر ڈالی۔“ حیدر حیران ہوا۔

”اوہ، ایک تو تم لوگ پوری بات سننے ہی نہیں ہو۔ تم لوگوں پر ترس نہیں آیا۔ یہ ٹرے پر جو پکچن شارب

ہے نا۔۔۔۔۔“ (عادل نے ہاتھ سے اشارہ کیا)۔

”وہ۔۔۔۔۔ جس کا پورے محلے نے بیمار مرغیاں بیچنے پر پناہ نکات کر رکھا ہے۔“ محبت اللہ نے قصد بے ضرورتی بھی۔

”ہاں۔۔۔۔۔ وہی۔“ عادل اطمینان سے کہہ کر منہ چلانے لگا۔

باقی جو جہاں تھا وہیں بت بن گیا یعنی کہ بتا مرغی۔۔۔۔۔ عادل نے اطمینان سے نوالہ حلق سے اٹھا

پھر بات مکمل کرنا شروع کی۔

”بے چارہ، بہت اداس اور دکھی بیٹھا تھا۔ مجھ دیکھا تو دل کا بو جھٹکا کرنے لگا۔ کہتا ہے بھائی! معاف

تو خدا بھی کر دیتا ہے، پتا نہیں ہمارے محلے والے! پتھر دل کیوں ہیں۔ میں نے کب کی توبہ کر لی۔ اب

صحت مند اور تندہ دست مرغیاں لا کر رکھی ہیں۔ لوگ آ

بھی نہیں خرید رہے۔ بس بھائیو! مجھے اس غریب پر بہت دس آیا۔ ساتھ ہی تم غریبوں کی خشکیں نظروں کے

سامنے ٹاپے لگیں تو جھٹ سے میں نے چکن خریدا اور فٹ سے برائی کا روگرا مزہ تزیین دے لیا۔“

عادل نے سکون سے کہتے ان سب کا سکون دہم برہم کیا۔

”تو نے، ہمیں بیمار مرغی کی برائی کھلائی۔“ حیدر جارحانہ تیوروں سے اس کی طرف پڑھا۔

”نہیں! بیمار مرغی بالکل صحت مند تھی۔ اس نے میرے سامنے ذبح کی تھی۔“ عادل کہتے ہوئے حیدر سے ذرا پرے کھسکا۔

”اور پھر۔۔۔۔۔ اس چکن والے نے توبہ بھی کر لی تھی۔ دے! اگر تم لوگ جا ہو تو موت کھاؤ۔ میں کل آفس لے

جاؤں گا۔ میرے کوئی خوش خوشی کھا لیں گے۔“

”اب کیا فائدہ، اب تو جو ہوتا ہے وہ ہو کر رہے گا۔“ انس کہتے ہوئے اپنی پلیٹ پر جھٹک گیا۔

اس کی دیکھا دیکھی باقی سب نے بھی کھانا وہیں سے دوبارہ شروع کر دیا۔ جہاں سے چھوڑا تھا۔

”ہائے بے چارے بھوکے۔“ عادل نے انفس کا اظہار کیا۔ کسی کی طرف سے کوئی رد عمل

سامنے نہ آیا۔

”ایک اطلاع اور بھی دینی ہے۔“ عادل نے سسپنس پھیلانے کی کوشش کی۔ پھر مطلوبہ رسپانس

نہ پا کر مزید کوہا ہوا۔

”آخر کار میری سسپٹی والے ایک ایسا گھر ڈھونڈنے میں کامیاب ہو گئے ہیں، جس کے مالک

مکان کو ہم چھڑے کر ایہ داروں پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔“

”شکر ہے، محنت ٹھکانے لگی۔“ احسن نے با آواز بلند شکر ادا کیا۔

”کیا کتنی والوں کی؟“ عادل نے کچھ حیرت سے استفسار کیا۔

”تین میری۔ اتنی محنت سے سلام بنایا تھا، شکر

ہے کھالیا گیا۔ (اس نے ہاتھ سے سلام کی خالی پلیٹ کی طرف اشارہ کیا) درنہ محنت ضائع ہو جاتی۔“

”ہمارے پیڑوں سے کبھی کچھ بچا ہے۔ دیکھو بیمار مرغی تک کو نہیں بچتا۔“ حیدر نے ٹکڑا لگایا۔

”مرغی ہرگز بیمار نہیں تھی۔“ عادل سخت برامان کر بولا۔

”تیری کیا کوئی جذباتی وابستگی تھی مرغی کے ساتھ جو اس کی صحت مندی کو ہر صورت منوانا چاہتا ہے۔“ کافی دیر سے خاموش بیٹھا محبت اللہ بولا۔

”جی، مرحومہ میری بہن اور غم گسار تھیں۔ قدم قدم پر میری راہ نمائی فرماتی تھیں۔“ عادل جل کر

بولا۔

”یہ آپ لوگ مرغی ہی کے بارے میں بات کر رہے ہیں نا؟“ انس نے تصدیق چاہی۔

”یاد دیکھ بھال کر، میرے خرچ کر کے مرغی خرید کر لایا تھا۔ جو تم سب کھا بھی چکے ہو، اب تو بخش دو۔“

اس نے دونوں ہاتھ جوڑے۔

”جا، بخش دیا۔ کیا یاد کرے گا۔“ احسن نے کمال فیاضی کا مظاہرہ کیا۔

”اچھا، بات سنو میری۔“ عادل کو اچانک کچھ یاد آیا۔ ”مئے مکان مالک ہم سب سے ملنا چاہتے

خواتین ڈائجسٹ

کی طرف سے

بہترین کیلئے خوبصورت ناول

یہ لگیاں یہ چوہا رہے

فائزہ انصاری

قیمت 400/- روپے

ملقبہ عمران ڈائجسٹ

فون نمبر: 32735021

37، اردو بازار، کراچی

ہیں۔ کوئی ایک وقت طے کر لو تو سب چلتے ہیں۔
 ”کیا ہم سب کو جانا ہوگا؟“ انس کے منہ سے
 بلا ارادہ ہی نکل گیا۔
 ”نہیں، آدھے چلے جائیں گے، باقیوں سے
 وہ آکر مل لیں گے۔“ حیدر نے فوراً سے پیش تر
 جواب دیا۔ انس بول کر کچھ بتایا۔
 ”میرے خیال سے کل شام چار بجے تک چلتے
 ہیں۔“ محبت اللہ بولا، جس پر سب متفق نظر آئے۔
 ☆☆☆

سفید کمر کے اس بڑے سے اتنی گیٹ کے
 سامنے کھڑے وہ خاصے متاثر نظر آ رہے تھے۔
 ”اس کو مکان یا گھر کہنا تو بڑی زیادتی ہوگی۔“
 محبت اللہ جانے کس رو میں کہہ بیٹھا۔
 ”تو پھر کیا کہنا چاہیے، ہوٹل یا سرائے؟“ عادل
 نے انتہائی سنجیدگی سے دریافت کیا۔
 مزید کسی بھی گفتگو سے قبل گیٹ کھل گیا۔ چودہ
 پندرہ سال کا وہ بچہ ان کو اندر لے آیا۔
 ”صاب! پہلے آپ لوگ گھر دیکھ لیں گا یا مونا میم
 سے ملے گا؟“ سوال پوچھ کر اب وہ منتظر نظروں سے
 ان کو دیکھ رہا تھا۔
 چند سیکنڈ کے توقف کے بعد محبت اللہ بولا۔
 ”پہلے گھر دکھا دو۔“
 ”ٹھیک ہے صاب! آ جاؤ۔“
 گیٹ سے اندر آ کر بائیں ہاتھ بہت بڑا اور
 خوب صورت لالہ تھا۔ کار پورج کے ساتھ ہی
 سیڑھیاں اوپر جا رہی تھیں۔
 اوپر کا حصہ دپور شہر میں بٹا ہوا تھا، ایک کامین
 دروازہ لاک تھا۔
 وہ لوگ اسی سمت بڑھے، جب ملازم نے بچے نے
 انہیں آواز دی۔
 ”صاب! آ جاؤ، وہ حصہ مونا میم کے بچہ لوگ
 کا ہے۔“
 ”تو کہاں ہیں وہ لوگ، جن کا یہ حصہ ہے۔“
 انس نے پوچھا۔

”وہ باہر ہوتا ہے۔ دو سال میں ایک بار
 ہے۔ چھ ماہ کا واسطے۔“ اس نے اطلاع بھیج کر
 دوسرے پورشن کی راہ لی۔
 ”تمہارا نام کیا ہے؟“ احسن نے بچے سے
 سوال کیا۔
 ”صاب! ام آپ کو ایک شرط پر نام بتاؤں گا۔“
 ”ہیں۔۔۔۔۔“ انہوں نے حیران ہو کر اسے
 دیکھا۔ ”نام بھی کوئی، کسی شرط پر بتانا ہے۔“
 ”جی صاب! ام۔۔۔۔۔“ اس نے فخر سے اپنا سر
 پھلاتے ہوئے کہا۔ ”امارا شرط یہ ہے آپ امارا
 سن کر بیٹے کا نہیں۔ یہاں آنے والا ہر کرایہ دار امارا
 نام سن کر ہنستا ہے۔“
 ”ہر کرایہ دار کا کیا مطلب ہے؟“ عادل کے
 کان کھڑے ہوئے۔
 ”صاب! یہ اور آنے والا کوئی کرایہ دار زیادہ کم
 نہیں ہے۔ کوئی دو ماہ رہتا ہے، کوئی تین ماہ۔“
 ”کیوں۔۔۔۔۔؟“ حیدر نے پریشانی سے
 دوستوں کو دیکھتے ہوئے بچے سے پوچھا۔
 ”یہ تو ام کو نہیں پتا۔ اتنا اچھا تو ہے مونا میم! پتا
 نہیں کرایہ داروں کو ان سے کیا مسئلہ ہوتا ہے۔ جو
 آتا ہے میم سے لڑ پھٹ کر چلا جاتا ہے۔“
 ”یار عادل! دیکھ بھال کر گھر لینا چاہیے۔ یہ نہ
 ہو دو تین ماہ بعد ہمیں بھی بھاگنا پڑ جائے۔“ حیدر نے
 عادل کے کان میں سرگوشی کی۔
 ”ہمارے پاس کوئی دوسرا تیسرا آپشن موجود
 نہیں ہے۔“ عادل نے جوابی سرگوشی کی۔
 ”تب ہی بچہ جوش سے بولا۔
 ”لو صاب! شرط منظور ہے۔“
 ”کوئی ہی شرط؟“ عادل اور انس نے چونک کر
 اسے دیکھا۔ باقی سب بھی متوجہ ہوئے۔
 ”دینی صاب! امارا نام سن کر بیٹے کا نہیں آپ
 لوگ۔“
 ”ہاں ہاں، ہم میں سے کوئی بالکل نہیں ہنسے گا۔“

”محبت اللہ نے اس کی تسلی کرائی۔
 ”صاب! امارا نام ہے ”سائیکل خان۔“ اس
 نے کہہ کر فخریہ نظروں سے ان سب کو دیکھا۔ یوں
 کہہ کر ہاتھ ”اب بتاؤ ہو سکتا ہے کسی کا ایسا نام۔“
 ”یار، یہ کیسا نام ہے؟“ عادل نے حیران ہو کر
 پوچھا۔
 ”اصل میں نا صاب! جس دن ام پیدا ہوا تھا،
 اس دن امارا والد صاب نے نیا سائیکل خریدا تھا۔ پس
 اس نے ہمارا نام بھی سائیکل خان رکھ دیا۔“
 ”پھر تو تمہارے بعد ہونے والے بھائیوں
 کے نام موٹر سائیکل خان، گاڑی خان اور ٹرک خان
 ہوئے چاہئیں۔“ احسن نے اللہ جانے پوچھا تھا یا بتایا
 تھا۔
 ”نہیں صاب! امارا والد صاب، امارے
 پیدائش کے دو سال بعد اللہ کو پیارا ہو گیا۔ امارا اور کوئی
 بھائی نہیں ہے۔“ بچہ برامانے بغیر بولا۔
 ”محبت اللہ نے اس کی بات پر افسوس سے سر
 ہلایا۔
 ”گھر بہت خوب صورت تھا۔ تین بیڈ روم، ٹی
 وی لاونج، دو باتھ، بہت خوب صورت اور شائستگی
 کچن۔ لیکن کوئی چیز ان کو مسلسل ٹھنک رہی تھی۔
 خانہ کرایہ داروں کے دو تین ماہ سے زیادہ نہ
 ٹکنے والی بات۔ سائیکل خان اب باہر جا چکا تھا۔
 وہ پانچوں دائرے کی صورت کھڑے غور و خوص
 فرما رہے تھے۔
 ”پھر کیا خیال ہے مولوی؟“ عادل نے بال
 اس کی کورٹ میں لڑھکانی۔
 ”یار! بابا جی کو ہم نوٹس دے بیٹھے ہیں، اس
 لیے وہ گھر تو خالی کرنا ہی پڑے گا۔“
 ”مونا میم سے مل لیتے ہیں، پھر دیکھتے ہیں کیا
 صورت حال بنتی ہے۔“
 ”چلو ٹھیک ہے پھر آؤ۔“
 وہ سب آگے پیچھے باہر نکلے۔
 ☆☆☆

اب اس وقت وہ اس وسیع و عریض، انتہائی
 شان دار لاونج کم ڈرائنگ روم میں مونا میم کا انتظار
 کر رہے تھے۔
 تب ہی ان لوگوں کو تک تک کی آواز سنائی
 دی۔ سب سے پہلے عادل مڑا۔
 ایک انتہائی اسمارٹ اور خوب صورت مناسب
 سرسے والی اسٹائش سی خاتون اپنے لیے گھنے کالے
 بالوں کو جھٹکتی۔ ان کے قریب چلی آ رہی تھی۔
 لاٹک کوٹ کے ساتھ بلیو جینز اور ہائی ٹیل پہنے
 وہ خاتون اب ان سب سے تعارف کر رہی تھیں اپنا۔
 تک تک، ٹیک، ٹیک کی آواز قریب اور قریب
 ہوتی جا رہی تھی۔ اس قدر حسین مکان کی مالک سے
 کوئی خیریں لڑ پھٹ کر چلا جاتا ہے۔ خواب ایک
 چھناکے سے ٹوٹا تھا اور اس کے چھناکے کی گونج کہیں
 عادل کے اندر ہی ختم ہو گئی تھی، آواز تک نہ آئی باہر۔
 ”ہائے، کس قدر ظالم ہوتے ہیں یہ خیالات
 اور کتنی سچی ہوتی ہے حقیقت۔“
 احسن کے شو کا مارنے پر وہ خیالات کی دنیا سے
 حال کی دنیا میں واپس آیا تھا۔
 ”مونا میم!“ اس نام سے جو خیالی پیکر اس نے
 تراشا تھا۔ وہ حقیقت والی مونا میم کو دیکھ کر ایسا پکڑ
 پکڑ ہوا کہ آدھ ٹھنک، بے چارے عادل کی۔
 وہ چومیل کی تک تک اس کی ساعتوں پر دستک
 دے رہی تھی، وہ اصل میں مونا میم کی ہولڈنگ اسٹک
 کی آواز تھی۔
 برف کے جیسے سفید بالوں والی کوئی پچھترے
 اسی برس کے درمیان کی عمر والی ”مونا میم“ اسٹک کے
 سہارے کھڑی ان سب کا اپنی نگاہوں سے ایکسرے
 کر رہی تھیں۔
 وہ بھاری تن پوش کی حامل ایک چاقی و چوبند
 بزرگ محسوس ہوتی تھیں۔ نظر کا چشمہ آنکھوں پر
 جمائے وہ باری باری ہر ایک کے سامنے آ کر اس سے
 اس کا نام اور خاندان کی تفصیل پوچھ رہی تھیں۔
 عادل کا نمبر سب سے آخر میں آیا۔



”آئی امما اب ہم سے پیار کیوں نہیں کرتیں۔
اب ہمارے کپڑے روز بدلتی ہیں، منہ پونیاں بناتی
ہیں اور منہ ہی ہمیں اپنے پاس بٹھا کر ہم سے باتیں
کرتی ہیں۔ وہ اب ایسی کیوں ہو گئی ہیں۔“
”پتا نہیں در پشہر ماما ایسا کیوں کرتی ہیں۔
جب بابا تھے تو وہ ہمارا کتنا خیال رکھتی تھیں۔ ہمارے
لے اچھے اچھے کھانے بناتی تھیں۔ روز نہلا کر کپڑے

”تم لوگوں کو کسی نے محفل کے آداب نہیں
سکھائے۔ کیا کسر پھر لگا رکھی ہے۔“
”محفل کہاں ہے، کلاس روم محسوس ہو رہا
ہے۔“ عادل بس منہ ہی منہ میں بدیدا کر رہ گیا۔
”شام کی چائے تم لوگ میرے ساتھ پیو گے
روز۔ شام کے وقت مجھے اکیلے میں بہت دھشت
ہوتی ہے۔“

”ویری گڈ۔ خالی چائے یا ساتھ میں۔۔۔۔۔“
ابھی عادل اتنا ہی سوچ پایا تھا کہ مونا سیم کی آواز پھر
اسے حال میں لے آئی۔
”ہاں چائے تم میں سے جو بھی بنائے، نہایت
عمدہ ہوتی چاہیے۔“
”جی کریم۔۔۔۔۔ بنائیں گے، وہ بھی عمدہ۔“
”پانی فالٹو خرچ نہیں کر دو گے۔ پانی کا میل تم
لوگ بھرو گے۔“

لان کی صفائی ستھرائی تم لوگوں کے ذمے ہوگی۔
اگر تم میں سے کسی کا کوئی رشتہ دار آنا ہو تو اس کی
پیشگی اطلاع مجھے دو گے۔“
”شکر ہے ہمارے رشتے دار ہمیں منہ ہی نہیں
لگاتے۔“ عادل پھر سوچ کر رہ گیا۔
”سائنس ہم مرضی سے لے سکتے ہیں یا اس سے
پہلے بھی اجازت لینا ہوگی؟“ آخر ہمت کر کے عادل
نے بول ہی دیا۔

”کچلی مرتبہ مونا سیم کے بزرگ چہرے پر
مسکراہٹ نمودار ہوئی۔
”تم۔۔۔۔۔ بیک ہوائے۔“ انہوں نے عادل کی طرف
اشارہ کیا۔ ”تم بہت شریعہ مند ہوتے ہو لگتا ہے تمہارے
ساتھ وقت اچھا کر دو گے۔ پھر فائل کر لیں۔“
انہوں نے جواب طلب نظروں سے ان کی
طرف دیکھا۔

وہ سب بس ایک دوسرے کو دیکھ کر رہ گئے۔ گویا
زبان بے زبانی کھڑے ہوئے۔
”کیا کریں کیا نہ کریں۔۔۔۔۔؟“

وہ تو خیالوں ہی خیالوں میں جانے کہاں پہنچا
ہوا تھا۔ چونہ مونا سیم کے گھورنے کا اثر لیا نہ ان سب
کے باری باری ہنکھارنے کا۔ آخر مجبوراً احسن کو ٹپو کا
دینا پڑا۔

عادل کا نام اور یہ تفصیل سن کر کہ بے چارے
کے والدین حیات نہیں ہیں۔ ٹھنڈی سانس بھر کر محض
انتاہی کہا۔

”ہاں۔۔۔۔۔ بن ماں باپ کے بچوں کی ایسی
حالت ہو ہی جاتی ہے۔“
”کیسی حالت؟“ عادل کچھ چونکا۔

”ایسی ہی، جیسی تمہاری عور ہی ہے۔ کچھ
غائب و مافی کی سی۔“
عادل نے اس تبصرے کے بعد خود کو چاق و
چوبند ثابت کرنے کی کوشش کی۔

”اچھا، تم لوگ میری باتیں دھیان سے سن لو۔
اول تو چھٹی کے دن دیر سے اٹھنا مجھے سخت ناپسند
ہے۔“

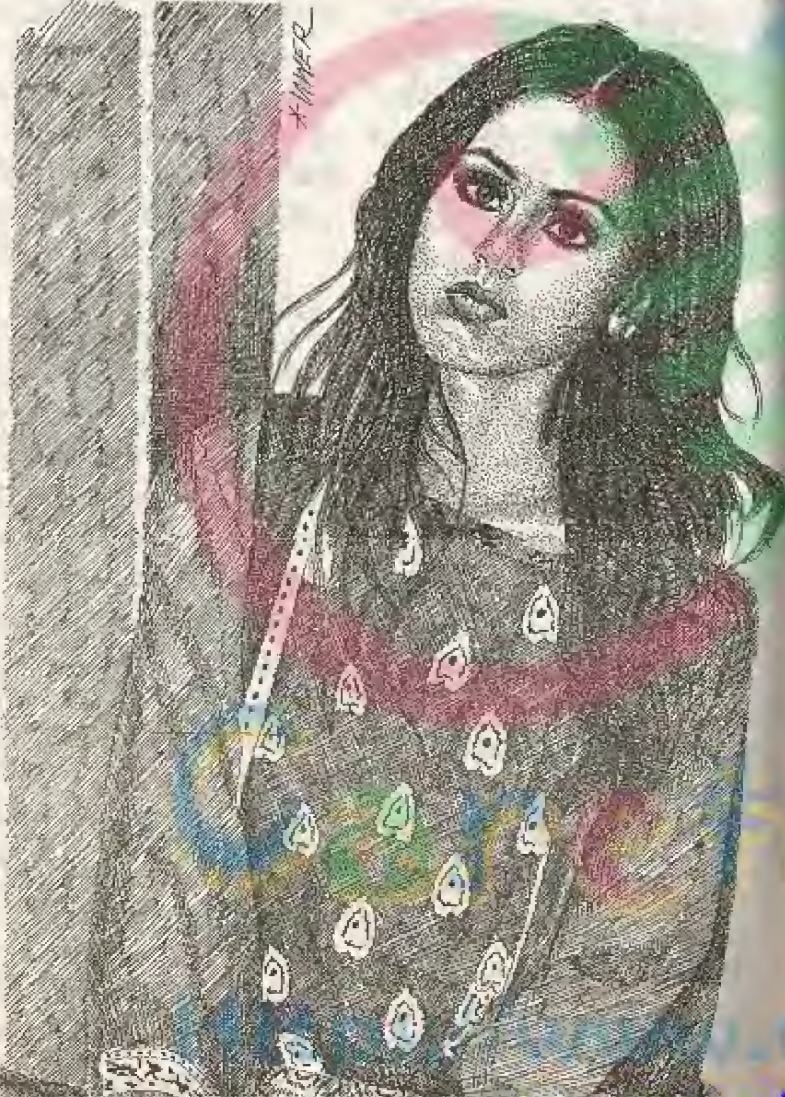
”تو آپ اٹھ چائیں جلدی، ہمیں کوئی
اعتراف نہیں ہوگا۔“ عادل نے احسن کے کان سے
منہ جوڑ کر کہا۔

”سو اتوار کو زیادہ سے زیادہ آٹھ بجے تک
سونے کی اجازت ہوگی تم لوگوں کو۔“
”ہم لوگوں کو۔۔۔۔۔؟“ بے آواز چپیں اندر ہی دم
توڑ گئیں۔

”رات دس بجے کے بعد کسی صورت گیٹ نہیں
کھلے گا۔ میوزک بالکل قابل برداشت نہیں ہے۔
صرف خیریں دیکھنے اور سننے کی اجازت ہوگی۔ کوئی
واہیات تم کا ذرا لاپرواہی نہ دیکھنے کی اجازت نہیں ہوگی۔
تکی اور میس کے میٹر مشترک ہیں لہذا بہت
احتیاط سے تکی اور میس کا استعمال کرنا ہوگا۔“

سردیوں میں ہیٹر اور گرمیوں میں اسے سی کا
استعمال بالکل نہیں کرو گے۔“

”شکر ہے یہ دونوں ہی چیزیں ہمارے پاس
نہیں ہیں۔“ انس نے حیدر کے کان میں سرگوشی کی۔



پہناتی تھیں۔ اب تو وہ بھی ہمارے بالوں میں کنگھا بھی نہیں کرتیں۔ اب مجھے اپنے بال بھی خود بنانے پڑتے ہیں اور تمہارے بھی۔“ شانزے نے بھی ماں کے رویتے پر اسرہ بھی۔

”رات کو جب بابا میرے خواب میں آئیں گے تو میں ماما کی شکایت لگاؤں گی کہ ماما ہماری مالتائی ہی نہیں ہیں۔ وہ تو بس اپنے نئے شوہر کا ہی ہر وقت خیال رکھتی ہیں۔ ان ہی کے کام کرنی رہتی ہیں اور ان سے ہی ہنس ہنس کر باتیں کرتی ہیں۔“

”ہاں یہ ٹھیک ہے میرے خواب میں بھی جب بابا آئیں گے تو میں بھی ان سے یہی کہوں گی۔ چلو اب جلدی سے ہوم ورک مکمل کر لیتے ہیں ورنہ ماما ڈانٹیں گی۔“ دونوں ہمیشہ جلدی جلدی ہوم ورک کرنے لگیں۔

☆☆☆

شانزے چھ سال کی اور وریشہ پانچ سال کی تھی کہ ناگہاں سائے پداری سے محروم ہو گئیں۔ معصوم ذہنوں نے تو کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ سچ کا سورج ان کی قسمت میں کبھی لکھ کر نمودار ہوگا۔ رات کو ماجد انور نے اپنی مٹی پر یوں کے ساتھ کھانا کھایا، ان کی ساتھ خوب باتیں کیں، دونوں کو اپنے بازوؤں پر لٹا کر کہانیاں سنائیں تو وہ نیند کی وادیوں میں کھو گئیں۔ انہیں سچ طرح سے لٹا کر ان کے ماتھے پر بوسہ دیا اور بیوی سے چائے کے ایک کپڑی فرمائش کی تو مہک فوراً چائے بنا لائی۔ دونوں نے ملکی پھلکی باتوں کے دوران چائے پی اور سو گئے۔

انہی سوئے زرا دیر ہی گزری تھی کہ ماجد انور کا سانس اکھڑنے لگا۔ ساتھ ہی الٹیوں کا ایسا حملہ ہوا کہ اس کی جان پر بن گئی۔ وہ انہیں بھی توبہ بنا کر دیتی اور کبھی گھبر رہی کوئی ایسی کی کوئی کھلا دیتی مگر طبیعت تھی کہ بگڑتی ہی جا رہی تھی۔ جب مہک نے دیکھا کہ وہ ہوش و خرد سے بے گانہ ہو رہے ہیں تو اس نے ماجد انور کے بھائیوں کو فون کر کے بلالیا تو وہ فوراً ہی

دوڑے چلے آئے مگر قسمت کی ستم ظریفی کہ وہ ابھی اسے ڈاکٹر کے ہاں لے جانے بھی نہ پائے تھے کہ وہ قلمرو اجل بن گیا۔

بھائی اس کے اتنے جلدی دنیا سے منہ موڑ لینے پر انگشت بدنداں رہ گئے جس نے سنا اس کی ایسا ایک وفات پر ششدر رہ گیا۔ جوان بیوی سکتے میں آگئی اور معصوم بچیاں باپ کے ایک دم خاموش ہونے پر سہم گئیں۔ باپ کی محبت و شفقت بھری چھاؤں سے کڑی دھوپ میں آ گئیں۔ وہ باپ کو یاد کر کے تڑپ کر روئیں۔ راتوں کو اٹھ کر بیٹھ جائیں۔ اس کو پکارتیں ان کی حالت دیکھ کر ہر آن کھٹکنا ہوا جاتی۔

تایا کبھی پارک میں گھمانے لے جاتے، کبھی پھوپھو اپنی آغوش میں بھر لیتیں اور ماں ان بچیوں کو کنگڑا کنگڑا دیکھ جاتی۔ منہ سے کچھ نہ بولتی مگر ان کا درد دل میں لیے بے چین رہتی۔

مہک نے عدت مکمل کی تو اس کے بھائی اسے اپنے گھر لے گئے پھر ایک دن ماموں نے بتایا کہ ”تمہاری ماما کی ہم شادی کر رہے ہیں۔ اب تم اپنے ماما بابا کے ساتھ رہو گی۔“ وہ دونوں خوش ہو گئیں کہ اب ہمارے ماما بابا ہمارے لیے اچھی اچھی چیزیں لایا کریں گے۔ ہمیں کہانیاں سنائیں گے اور روز گھمانے لے جایا کریں گے۔ وہ آنے والے دنوں کا تصور کر کے ہی خوش رہنے لگیں مگر دونوں کے خواب اس وقت چٹنا چور ہو گئے جب ایک دن ماں نے انہیں خوب تھلایا دھلایا، نئے کپڑے پہنا کر بال بنائے اور ان کی پھوپھو کے گھر لے گئیں۔ پھوپھو نے انہیں اپنے ساتھ چمکا کر خوب پیار کیا۔ بیٹیوں کو کچھ کر بھائی کی یاد دلانے لگی۔ شانزے نے پھوپھو کی گود میں لیٹے ہوئے سنا کہ اس کی ماں اپنی شادی کے متعلق بتا رہی تھی کہ ”چند دن بعد اس کی شادی اس کے کنوارے کزن سے ہو رہی ہے اور وہ بچیوں کو اپنے ساتھ رکھنے پر آمادہ تو ہے مگر میں نہیں سمجھتی کہ وہ ان کو باپ جیسا پیار دے سکے گا اس لیے بچیوں کو آپ اپنے

ہاں رکھ لیں۔ یہاں آپ کے بچوں کے ساتھ ان کا دل لگا رہا ہے۔“ یہ سن کر بھی شانزے کا دل جیسے کسی نے مٹی میں لے کر مٹل دیا ہو کہ کیا اب انہیں اپنی ماں سے بھی دور رہنا پڑے گا۔ خود پھوپھو یہ بات سن کر سکتے میں آ گئیں کہ ایک ماں نے کیسے اپنی بچیوں کو اپنے سے دور کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

”بھابھی! آپ بچیوں کے بغیر کیسے رہیں گی اور پھر یہ اتنی چھوٹی ہیں کہ ابھی باپ سے دوری کا دھم بھی نہیں بھرا اور آپ انہیں اپنی ممتا سے بھی محروم کر رہی ہیں۔“ پھوپھو نے کرب سے کہتے ہوئے اس کے ماتھے پر آنے والے بال سنوارے۔

”میں نے یہ فیصلہ ان کی بہتری کے لیے ہی کیا ہے، وہاں رہ کر اگر ان پر توجہ دوں گی تو اسامہ ناراض ہوگا اور اگر اسامہ کا خیال رکھوں گی تو بچیاں نظر انداز ہوں گی، دونوں صورتوں میں بچیوں کو ہی مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا اور میں بھی ہر وقت ذہنی ٹینشن کا شکار رہوں گی۔ یہ یہاں رہیں گی تو مجھے اطمینان رہے گا کہ انہوں کے پاس ہیں۔ خرچے کی تم فکر نہ کرنا، ان کی پڑھائی اور دیگر اخراجات کے لیے میں پیسے دیتی رہوں گی۔“ وہ جیسے جیسی فیصلہ کیے بیٹھی تھی۔

”کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ۔ بات خرچے کی نہیں ہے، بات محبت اور احساس کی ہے اگر آپ کا دوسرا شوہر جو کہ آپ کا کزن بھی ہے، بچیوں کا خیال نہیں رکھ سکے گا تو مجھ سے آپ کیسے اچھی امید رکھ سکتی ہیں۔ میں تو غیر خاندان میں بیاہ کر آئی ہوں۔ جو اسٹ فمیلی سسٹم ہے۔ میں تو ان خیال رکھ لوں گی مگر فیملی اور اس کی فمیلی سے کیسے اچھے سلوک کی توقع رکھ سکتی ہوں۔ آپ بہت غلط فیصلہ کر رہی ہیں۔ بچیوں کو آپ اپنے پاس ہی رکھیں، انہیں اپنی محبت سے دور نہ

کر لیں۔ جو محبت ماں دے سکتی ہے وہ کوئی اور رشتہ کبھی نہیں دے سکتا۔“ پھوپھو نے دو ٹوک جواب دے دیا۔

”تو پھر میں تمہاری طرف سے انکار سمجھوں۔“

”سو فیصلہ انکار۔ ان کو اپنے سے دور کر کے ان پر ظلم مت کریں۔ بچیاں ساری عمر احساس محرومی کا شکار ہو کر پروان چڑھیں گی تو اپنے دلوں کو ماں باپ کی محبت سے خالی پائیں گی۔ باپ کا پیار تو زیادہ دیر یہ اپنی قسمت میں لکھا کر نہ لاسکیں، خدا ار ان کے دلوں کو ماں کی محبت سے تو بھر دیں ورنہ ساری عمر اپنے آپ کو ان کا مجرم تصور کریں گی۔“ پھوپھو نے سمجھاتے ہوئے حقیقت بھی گوش گزار کر دی اور وہ ان کی بات سن کر دونوں کے ہاتھ پکڑ کر کھڑی ہوئی۔

”ان کو کچھ دنوں کے لیے میرے پاس چھوڑ دیں، جب نئے گھر میں ایڈجسٹ ہو جائیں تو آ کر ان کو لے جائیں گے۔“ انہوں نے دونوں کو اپنے ساتھ لگایا اور مہک خاموشی سے انہیں وہیں چھوڑ کر چلی گئی۔

پھر پھوپھو نے ان دنوں میں ان کا بہت زیادہ خیال رکھا، ان کی پسند کے کھانے بنائے۔ ڈھیروں کھلونے لے کر دیے۔ وہ بھی ان کے بچوں کے ساتھ بہل گئیں مگر ماں کو یاد کر کے اداس ہو جاتیں۔ کافی دن گزر گئے مگر مہک نے کوئی رابطہ نہ کیا تو ایک دن پھوپھو نے خود ہی ان کو فون کر کے یاد کروا دیا کہ بچیاں آپ کو یاد کر رہی ہیں تو وہ اگلے ہی دن انہیں لینے آ گئی۔

خوب صورت کیڑوں میں ملبوس بنی سنوری ماں نے انہیں اپنے ساتھ لگایا۔ وہ بھی اتنے دنوں کی پچھڑی ماں سے لپٹ گئیں مگر بتائیں کیوں ماں کے لمس میں شانزے کو وہ پہلے جیسی گری محسوس نہ ہوئی۔ پھوپھو انہیں رخصت کرتے وقت اپنے ساتھ چمکا کر ایسے تڑپ کر روئیں گویا بھائی کے ساتھ ساتھ اب بچیوں کی شکل بھی آئندہ نہ دیکھ سکیں گی مگر وہ معصوم ان کے دکھ کو نہ سمجھ سکیں اور ماں کے ساتھ خوش خوش چل دیں۔

☆☆☆

گھر آ کر انہیں جس پہلی ذہنی ازیت کا سامنا کرنا پڑا، وہ ان کا الگ کرنا تھا۔ جب مہک نے انہیں

بتایا کہ تم آج سے اس کمرے میں رہو گی۔

”مما! آپ میری والی سائیڈ پر سوئیں گی ناں۔“ شانزے بولی۔

”نہیں جی، ممما میرے ساتھ سوئیں گی۔“ وریش نے ماں کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”نہیں، میں تم دونوں کے ساتھ نہیں سوؤں گی۔ میرا کمرہ تمہارے ساتھ ہی ہے۔ میں وہیں پر ہوں گی۔ اب یہ تم دونوں کا کمرہ ہے، تم لوگ یہیں رہا کرو گی۔“ مہک نے ان سے لگا ہیں چراتے ہوئے کہا تو وہ دونوں شاکہ کڈ رہیں۔

”مگر ممما! ہم دونوں کیسے اکیلی سوئیں گی، ہمیں ڈر لگے گا۔ ہم آپ کے بغیر نہیں رہ سکتیں۔“ شانزے نے فوراً انکار کر دیا۔

”اب تم دونوں بڑی ہو گئی ہو۔ اکیلے کمرے میں رہ سکتی ہو۔“ وہ مزید ان کی کوئی بات سننے وہاں سے اٹھ کر چل دی اور وہ ساری رات دونوں بہنوں نے ڈرتے اور روتے ہوئے جاگ کر گزاری۔ ابھی ماں کو آوازیں دیتیں اور ابھی بے بس ہو کر باپ کو نکارتیں۔ ماں ساتھ والے کمرے میں ان کی نیکار سن سکتی تو باپ تو اب دی نیند سو یا ہوا تھا وہ کیسے ان کی تنہائی باغتا۔

☆☆☆

وہاں رہتے ہوئے چند ہی دنوں میں انہیں اندازہ ہو گیا کہ باپ کے ساتھ ساتھ ماں کی محبت بھی ان کے لیے دُشمن ہو چکی ہے۔ وہ حیران ہوئیں کہ ہماری ماں ہمارے ساتھ ایسا کیوں کرتی ہے۔ دن میں تو پھر بھی وہ ان کا کچھ خیال کر لیتی تھی مگر شام کو اسامہ کے آتے ہی وہ ان دونوں سے لاتعلقی ہو جاتی۔ اکثر ان کو گھر پر اکیلا چھوڑ کر وہ رات کو گھونٹے پھرنے نکل جاتے اور خوف سے ان کے دل کا پتے رہتے۔ نئے بابا کو جب انہوں نے پہلی بار بابا کہا تو اسامہ کے چہرے پر ناگواری کی لکیریں ابھر آئیں۔

”بھئی مہک! ان کو بتاؤ، میں ان کا باپ نہیں ہوں۔ ان کا بابا مر چکا ہے۔“ وہ سفاکی سے بولا۔

بچیاں اس دن کے بعد سے اسے انکل کہنے لگیں۔ ان کے درمیان ایسا رشتہ تھا کہ جیسے کسی دور پرے کے رشتہ دار نے یتیم و یتیم کو اپنے گھر بنا دے رکھی ہو اور وہ اپنی ماں کے ہوتے ہوئے بھی یتیموں کی سی زندگی بسر کرنے لگیں۔ معصوم ذہنوں نے حالات سے سمجھوتا کر لیا تھا۔ اب وہ نہ تو ماں سے کسی چیز کی فرمائش کرتیں اور نہ ہی اس سے اپنے لیے دل میں محبت کی امید رکھتیں۔

☆☆☆

زندگی میں کتنی تلخیاں برداشت کرنا ہوں گی، کیسے غموں کے پہاڑ تلے ان کے وجود پر یہ وہ ہوں گے، اس کا انہوں نے ابھی سوچا بھی نہ تھا۔ وہ اب بڑی اور سمجھ دار ہو چکی تھیں۔ ماں کے روتے پر دل ہی دل میں کڑھتی رہتیں۔ شانزے پہروں پہنچی سوچتی رہتی کہ کیا میری ماں سگی ماں ہے۔ ہو سکتا ہے ہم بابا کی بیٹیاں ہوں، ہماری ماں ہمیں جہنم دے کر مر چکی ہو اور بابا نے اس مہم سے دوسری شادی کر لی ہو۔ بابا کے ڈر سے ممما اس وقت ہمارے ساتھ اچھا سلوک کرتی تھیں اور بابا کے جاتے ہی ہم سے ان کا رویہ بڑا ہو گیا۔ ماں کا ناروا سلوک دیکھ کر یہ خیال اس کے دل میں جڑ چکا تھا جا رہا تھا۔

ان دونوں کے دلوں میں باپ کی چند برسوں کی

رہی ہوئی محبت کا پودا تناور درخت بن چکا تھا اور ماں کے لیے نفرت کی جڑیں مضبوط ہو چکی تھیں اور اس دن یہ نفرت نہ رہیں کر شانزے کے پورے وجود میں پھیل گئی، جب وریش ساری رات بخار سے پھٹکتی رہی اور اس نے پریشان ہو کر ماں کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹا دیا تو سوئیے باپ نے غصے سے اس کے منہ پر ایک پتھر رسید کر دیا کہ ہماری نیند میں خلل کیوں ڈالا۔

”دفع ہو جاؤ، جا کر اپنی بہن کی حصار داری کرو۔“ کچھ نہیں ہوتا اسے، بڑی ڈھیت جان لے کر پھرا ہوئی ہوتی دونوں۔“

خداوت سے کہتے ہوئے اس نے دروازہ بند کر لیا اور شانزے رو لی ہوئی کمرے میں وریش کے پاس آ کر اس کے ہاتھ پاؤں سہلانے لگی۔ وہ نیم بے ہوشی کی حالت میں بھی اور ممما کا پرکاری بھی۔ بخار سے اس کا پورا جسم تپ رہا تھا۔ وہ پریشانی سے مسلسل اپنے اللہ سے بہن کی صحت و سلامتی کی دعائیں مانگتی رہی اور پانی کی پٹیاں اس کے ماتھے پر چھتی رہی۔

اس وقت اسے اپنی ماں دنیا کی بد صورت ترین عورت لگی تھی جو اپنے نئے شوہر کی محبت میں اپنی ممتا کا گلا گھونٹ چکی تھی۔ ماں تو وہ ہستی ہے کہ بچے کے معمولی دکھ پر بے چین ہو جاتی ہے۔ اس کی تکلیف اسے اذیت میں مبتلا کر دیتی ہے۔ یہ کیسی کمزور ماں تھی جس کی بیٹی شدت تکلیف سے گرا رہی تھی اور ماں کو خبر تک نہیں۔ پتا نہیں اس ماں کے سینے میں دل ہے کہ نہیں، وہ ساری رات دھکی ہوئی رہی۔ صبح تک وریش کی حالت کافی گمراہ تھی، اسے دورے پڑنے لگے تو مہک اسامہ کے ساتھ اسے ڈاکٹر کے پاس لے گئی اور وہ گھر پر رو کر بہن کے لیے دعائیں مانگتی رہی مگر پتا نہیں اس کی دعاؤں میں اثر نہیں تھا اور وریش کی باپ سے محبت اتنی شدید تھی کہ وہ اس سے زیادہ عرصہ دور۔ نہ وہ سکی یا پھر ماں کی محبت کی محرومی کا غم نہ سہا رہا۔ شانزے باپ کی جدائی کے غم کے بعد اب چھوٹی بہن کے پھپھرنے پر ماتم کرتی رہ گئی۔

اس کا معصوم چہرہ ہاتھوں میں لے کر وہ کتنا تر پی تھی، اس سے کتنی التجا میں کی تھیں کہ وریش مجھے یوں تنہا چھوڑ کر مت جاؤ۔ بابا تو چلے گئے، تم تو مجھ سے یوں بے وفائی نہ کرو۔ میں اکیلی کمرے میں کسے رہوں گی۔ مگر اس کی تمام تر التجا میں مٹی کا ڈھیر بن کر وریش کے ساتھ ہی دفن ہو گئیں اور اس کے دل میں ہولناک سناٹوں نے پڑاؤ ڈال لیا۔

☆☆☆

وقت کا پتہ سرکھ رہا اور شانزے نے بچپن کو رخصت کر کے جوانی کا ہاتھ تھا تو ماں کے لیے نفرت اس کے انگ انگ میں بس چکی تھی۔ سچ یا دیں جب ذہن کی سلیٹ پر نمودار ہوئیں تو وہ درد کی شدت سے بے حال ہو جاتی۔ وہ منہ سے کچھ نہ کہتی، کانچ سے آنے کے بعد گھر کے کام کاج میں مصروف ہو جاتی۔ ماں سے ضرور پتا بات کر لیتی ورنہ وہ اس کی طرف دیکھتی تنک نہیں تھی۔ نہ بھی اس نے مہک کے ساتھ بد تمیزی کی اور نہ اسامہ کو پلٹ کر جواب دیا مگر وہ ان دونوں کو اپنی بہن کا قاتل ضرور سمجھتی تھی اور اس رات کا تصور کر کے نفرت اس کے دل میں اور سوا ہو جاتی۔

پچھلے کچھ دنوں سے اسامہ کا رویہ اس سے کچھ بہتر ہوتا جا رہا تھا۔ ابھی ابھی اس سے پڑھائی کے متعلق پوچھ لیتا، اسے کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے، وہ اکثر پوچھتا اور وہی میں سر ہلا دیتی۔

مہک بھی اسے توجہ دینے لگی تھی، اس کا خیال رکھنے لگی تھی اور اکثر وریش کو یاد کر کے آنسو بہاتی تو شانزے کا دل چاہتا کہ اس عورت سے ان گھوں کا حساب لے جو انہوں نے اس کے پاس رہتے ہوئے بھی اس سے دوری میں گزارے۔ اسے وہ ماں نہیں وہ سنیوں لگتی تھی جو اپنے بچوں کو جہنم دے کر خود ہی انہیں نکل جاتی ہے۔

مہک کی طبیعت اچانک خراب رہنے لگی، ٹیسٹ کروائے تو پتا چلا کہ اسے بلڈ کنسر ہے۔ اسامہ اس کا بہتر سے بہتر علاج کروا رہا تھا، اس کے لیے روتا، اس کی زندگی کی دعائیں مانگتا۔ شانزے سے اس کا خیال

رکھنے کے لیے کہتا، وہ اسامہ کو اپنی ماں کا اتنا خیال کرتے دیکھتی تو حیران رہ جاتی۔ یہ تو اسے اپنی ممانی سے ہی پتا چلا تھا کہ یہ دونوں لڑکیاں سے ہی ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے۔ کسی دوست سے جھگڑا ہوا تو اسامہ قتل کے جرم میں جیل چلا گیا اور اس کی مانی نے مہک کی شادی شانزے کے باپ سے کر دی۔ مہک کو اپنے شوہر سے رتی بھر محبت نہ تھی مگر ماں کی وجہ سے وہ اس گھر میں بسنے پر مجبور تھی۔ شادی کے دو سال بعد ہی اس کی مانی فوت ہو گئی اور جس دن اس کا باپ اس دنیا سے رخصت ہوا اسامہ کو جیل سے باہر آئے چھ ماہ کا عرصہ ہوا تھا اور اس کی ماں نے عدت مکمل ہونے کے بعد اپنے عاشق سے شادی کر لی۔ اسے اپنے بابا شدت سے یاد آتے اور وہ سوچتی کاش میرے بابا کی شادی میری ممانے نہ ہوئی ہوتی۔ کاش میں اس عورت کی بیٹی نہ ہوتی۔ کاش میری ممانے مر جاتیں مگر میرے محبت کرنے والے بابا زندہ رہتے تو آج ور پشہ بھی میرے ساتھ ہوتی اور ہم کتنی خوشی خوشی زندگی گزارتے۔ وہ خیالوں کے تانے بانے بنتی رہتی۔

وہ مہک کا پورا خیال رکھتی، اس کی مکمل نگرانی کرتی۔ ہاسٹلو میں راتوں کو اس کے لیے جاگتی، اس کا سر دباتی، ٹانگیں دباتی۔ اس کے لیے پرہیز کی کھانا بناتی مگر اس میں ماں کی محبت شامل نہ ہوتی صرف ایک انسانیت کے ناتے یا پھر وہ اس احسان کا بدلہ چکانا چاہتی تھی جو اتنے عرصے ان میاں بیوی نے اس محبت کے سائے تلے دکھا تھا۔

☆☆☆

شانزے نے جلد ہی سے سوپ کا پیالہ ٹرے میں رکھا اور مہک کے کمرے کی طرف قدم بڑھا دیے۔ اس کی ماں روز بروز موت کے قریب ہوتی جا رہی تھی اور اسامہ کا اس خیال سے ہی چہرہ زبرد پڑتا جا رہا تھا۔ اس نے کاروبار پر توجہ دینی چھوڑ دی تھی اور سارا دن اس کے پاس بیٹھا رہتا۔ اسے دیکھ کر یوں لگتا کہ وہ خود کسی بڑی بیماری کا شکار ہے۔

شانزے نے دروازہ کھولنے کے لیے جوں ہی ہاتھ آگے بڑھایا، اپنی ماں کی آواز سن کر وہیں صدمہ لگ کر رک گئی۔

”میں اپنے آپ کو اپنی بیٹیوں کا مجرم سمجھتی ہوں اسامہ! میں نے ان کے ساتھ کچھ اچھا نہیں کیا۔ نہ صرف ان سے ان کا باپ چھین لیا بلکہ اپنی محبت کے لیے بھی انہیں ترسایا۔ میری خود غرضی دے تو بھی کہ وہ میری بیٹی اس دنیا سے چل بسی۔ میں کسی ماں ہوں جسے اپنے بچوں پر ذرا رحم نہ آیا۔ تمہاری محبت پانے کی خواہش میں اپنی محبت بیٹیوں پر نہ لانا ہی غلطی اس ڈر سے کہ کہیں تم خفا نہ ہو جاؤ۔ تمہاری ناراضگی کے ڈر سے میں نے ہمیشہ ان کو اپنے سے فاصلے پر رکھا، اس ظلم پر میرا خدا مجھے کبھی بھی معاف نہیں کرے گا۔ ماجد انور کا تکلیف کی شدت سے زور پڑتا چہرہ مجھے راتوں کو اٹھ اٹھ کر رونے پر مجبور کرتا ہے۔ میری معصوم بچی ساری رات بخار میں لڑتی رہتی اور میں کبھی چین کی نیند سوئی رہی۔ بچپنا تو مجھے نکل رہے ہیں اسامہ!“ ضمیر نے آج اس کو جتنی تڑپا تھا اور وہ بیٹے دنوں پر شرم سارہ ہو رہی تھی۔

”یہ احساس مجھے بھی بہت شرمندہ رکھتا ہے مہک! شاید قدرت نے مجھے اسی بات کی سزا دی ہے کہ اس نے مجھے اپنی اولاد کی خوشی سے محروم رکھا۔“ دونوں آج ضمیر کی عدالت میں کھڑے اپنا احتساب کر رہے تھے۔

”ہم آج ہی شانزے سے اپنے رویوں کی معافی مانگ لیں گے۔ بہت اچھی بیٹی ہے۔ نفرت و حقارت کے جواب میں اس کی طرف سے ہمیشہ خاموشی ہی ملی۔ مجھے یقین ہے کہ وہ ہمیں معاف کر دے گی۔“ اس کا سوتلا باپ خوش فہمیوں کو گلے لگائے ہوئے تھے۔ اس کی خاموشی کو اچھے پن سے تعبیر کرتے ہوئے معافی کی امید رکھے ہوئے تھا جب کہ ان کے لیے شانزے کے پور پور میں نفرت اپنا کھانا بناتے ہوئے تھی۔

”وہ تو ہمیں معاف کر دے گی مگر اسامہ! ماجد

انور کے قتل کے گناہ کی معافی ہم کس سے مانگیں گے۔ میرا ضمیر مجھے بچو کے لگاتا ہے، ساری رات آنکھوں میں کٹ جاتی ہے کہ ایک بے گناہ کو ہم نے موت کی دوا دی میں دھکیلا۔ بیٹیوں کو باپ کی شفقت و سامنے سے ہمیشہ کے لیے محروم کر دیا۔ ہمیں پانا تو میرا خواب تھا اور اس خواب کو تعبیر دینے کے لیے اپنی محبت پانے کے لیے میں نے اپنے شوہر کو ہی قتل کر دیا۔“

شانزے کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا اور بڑے ہاتھوں میں لرز کر رہ گئی۔

”کاش تم نے مجھے وہ زبرد اشتراز نہ دیا ہوتا، جو اس رات میں نے اس کی چائے میں ملا دیا تھا۔ کسی کو اس بارے میں خبر تک نہ ہوئی کہ اس کو موت کے منہ میں پہنچانے والی اس کی اپنی بیوی ہے۔ لوگ میرے بچوں میں پیوہ ہونے پر ناممکن سمجھتے اور ان کو بھڑکائی کہ یہ بیوی کی چادر میں نے خود اپنی مرضی سے اڑائی ہے۔ مجھے اپنے آپ سے نفرت محسوس ہوتی ہے۔ اس بوجھ کو اپنے دل میں چھپائے میں تھک چکی ہوں اسامہ! اویو قدرت نے مجھ سے کیا انتقام لیا ہے کہ آج میں ایک موذی مرض میں مبتلا ہو چکی ہوں اور سکے ہوئے کسی بھی دن یہ دنیا چھوڑ جاؤں گی۔ یہ احساس مجھے وقت سے پہلے ہی دہائے جاتا ہے کہ میں ماجد انور کو کیسے اس پر اور اس کی بیٹیوں پر کیے ظلم کا حساب دوں گی۔ وہ دونوں احساس جرم کا شکار ہو کر اندر آنسو بہا رہے تھے اور شانزے کے قدم جم چکے تھے۔ اس کا دل جیسے کسی نے ٹھنڈی میں جکڑ لیا تھا۔

”قل..... قل..... قل..... تو کیا میرے باپ کا قتل میری ماں نے کیا تھا۔ میرا باپ طبیعتی موت نہیں مرا تھا۔ اسے میری ماں نے مارا تھا۔“ میری ماں قائل ہے۔

اود میرے خدایا..... یہ کیسی اذیت تاک حقیقت ہے۔ ماں کی محبت تو ایسی ہے کہ ایک بے زبان کو بھی اپنی اولاد کو زمانے کے سرد و گرم سے بچانے کی محبت و عقل دیتی ہے۔ کسی خطرے کے

باعث اولاد کو اپنے پروں میں چھپا لیتی ہے مگر اپنے بچوں پر کوئی آنچ نہیں آنے دیتی۔ یہ کیسی ماں تھی جس نے خود اپنے ہاتھوں اپنے بچوں کو بے سائبان کر دیا تھا۔ یہ عورت۔ ماں نکس ایک ڈان ہے جس نے پہلے اپنے شوہر کو کھانا پھر اپنی بیٹی کو لگلا۔ اسے میرے اللہ! میں اتنے عرصہ اپنے محبت کرنے والے باپ کے قاتلوں کے ساتھ رہتی رہی۔“ آنسو اس کے گالوں پر تواتر سے بہنے لگے۔ وہ ایک نئے دکھ اور نئے کرب سے آشنا ہو کر مانی بے آب کی طرح تڑپ رہی تھی۔ دل کو چیسے کسی نے تیز دھارا لے سے چیر دیا تھا۔

آنسوؤں کی دبیز چادر اس کی آنکھوں کے سامنے تھی جاری تھی۔ جی چاہ رہا تھا کہ وہ ان دونوں کے گلے بے رحمی سے خود اپنے ہاتھوں سے کھوٹ دے۔ اس سے پہلے کہ اس کا نام بھی قاتلوں کی فہرست میں آئے وہ یہاں سے چلی جانا چاہتی تھی۔ اس کے قدم کسی من بھر کے ہو رہے تھے، اس نے کچھ سوچ کر پاؤں گیٹ سے باہر نکھے، اس کا رخ شہر کے ریلوے اسٹیشن کی طرف تھا جہاں پر جانے کا اب سب کچھ نام آچکا تھا۔

اس سے بڑی کڑی سزا انسان کے لیے کوئی اور ہو ہی نہیں سکتی کہ وہ اپنے گناہوں کا اور اک ہونے پر دل کو چیر دینے والی اذیت سے دوچار ہوتا رہے۔ ان دونوں کی یہی سزا تھی کہ وہ تنہائی کا ہر نہیں۔ اپنے گناہوں کا بوجھ لیے دن رات سولی پر لٹے رہیں۔ احساس جرم بچپن سے پھیلائے انہیں ڈستار ہے، وہ تڑپتے رہیں اور اپنے ضمیر کے کٹھنوں میں کھڑے ہو کر اپنے کیے کا حساب دیتے رہیں۔





دادی جانے کیوں مجھے الف لیلیٰ کی شہزادی
کہہ کرتی تھیں۔ انہیں قصے سنانے کا بڑا شوق تھا اور
رہی میں، تو مجھے ان قصے کہانیوں سے ذرا بھر بھی
رضیت نہ تھی۔ قلم کی کھڑکی سے بالوں کے کچھے چھٹکی
لڑکی، مینڈک شہزادہ اور کبھی کبھی کہانی چکاؤڑوں کے
دیس سے سفر کرتی ہوئی جگنوؤں کے دیس جگنوہرنی
تھی۔ پتی چپتی اور بجز بجز بھڑکتی ہوئی تاری آگ
کے گرد سب دائرہ بنائے بیٹھے ہوتے تھے جیسے ماچس
کی ڈیبا میں بند ہونے اپنے مسکن سے باہر کسی جادو
کے اثر سے سمور ہوئے بیٹھے ہوں۔ اگر وہ ذرا سا بھی
جلے جلے یا انداز نشست بدلی تو دادی انہیں چٹکیوں
سے پکڑ پکڑ کر ماچس کی ڈیبا میں بند کرتی جا سکتی گی۔
اور وہ تو سدا کے فرماں بردار تھے۔ اس کتبے،
قبیلے میں صرف میں ہی ”پانی“ تھی جو کسی طرح بھی
دیو مالائی داستانوں کو سینے اور ان سے متفق ہونے کی
خود میں صلاحیت نہ پاتی تھی۔ تراخ تراخ لکڑیاں
چٹکتی تھیں، دھواں سلگتا، پل بھر کو شیلے کے ساتھ ساتھ
قصہ گو کی بھی زبان بلند ہوتی جاتی۔ اسرار بھری
حیرت۔

”راستوں میں انگارے بچھ گئے۔ شہزادے
کے گھوڑے کے سم انگاروں کی تپش سے باس
چھوڑنے لگے۔ مگر شہزادہ، شہزادی کی کھونج میں
آگ کا دریا پار کرتا گیا۔ اور آگ سے بہت آگے بیکر
کی لڑیوں کے ساتھ چکاؤڑیں لٹکی ہوئی تھیں اور
الودس کی آنکھیں لال شعلہ سی نظر آتی تھیں۔“ میری
آنکھیں لالین کی لو پر گڑے رہ کر تھک سی جاتی
تھیں۔

قصے سننے والے گزرتی رات کے بے خود
دینے والے لحوں کے زیر اثر دھیرے سے ادھر ادھر کو
لا جھکنے لگتے تھے۔ قصہ گو کی آواز بھی مدھم مدھم
ہوتی معدوم ہو جاتی تو میں سراٹھا کر دیکھتی تھی۔ قصہ گو
بھی مجھ کی چھال والی درنی پر لڑھکی ہوئی ملتی تھیں۔
نتیجہ ہمیشہ ان کے سینے پر دھری ہوئی تھی۔ آگ
ٹھنڈی ہو چکی ہوئی اور میں سوچتی کہ راکھ پھر ولوں۔
کوئی چنگاری، کوئی ننھا سا شعلہ میرے لیے بھی تو
بھڑکے۔

دادی کے قصے شروع میں مجھے بہت بھاتے
تھے۔ گھوڑے کے سموں سے مٹی اوجھڑتا، بھرے
بالوں والا شہزادہ اور اندھیری کوشی کی سلاخوں میں سر
دیے بیٹھی الہز شہزادی جس کے جوہن کو شہزادے کا
انتظار دیمک کی طرح کھا رہا تھا۔ دادی بھی نہیں
سمجھ سکتی تھیں۔ لڑکیوں کے آگے سوئی رکھ دیے
جائیں تو وہ کھیل کھیل میں، شرارت میں، ان موتیوں
کو لڑی میں پرو کر گلے کا ہار کر لیتی ہیں۔ میں اندھیری
کوٹھڑی کی شہزادی بن گئی جو کسی زمین ادھیرتے، گھوڑا
بھگاتے شہزادے کے انتظار میں ہے۔ اور وہ شہزادہ
؟؟؟

☆☆☆

تکلیوں کو عادت تھی سورج کے ساتھ ساتھ چلنے
کی۔ اور ہم اپنے اپنے دوپٹوں کو مل دینے سروسوں
کے کھیتوں میں اتر آتی تھیں۔ دنیا بھر کا لاڈلا سورج
ہمارے سروں کے اوپر سفر کرتا رہتا تھا۔ بچے،
قمریاں اور میل کنٹھ ہواؤں کے راز دار تھے۔ انہیں
کی چمک چمک سے گاک سم جاتے تھے۔ وہ بھی

ایک روشن دن تھا اور گھوڑا دوڑاتا، دھول اڑاتا وہ
شہزادہ سامنے تھا۔

”پھول مگر کو جانا ہے۔“ اس سوال نے مجھے گم
سم کر دیا تھا۔ اگر وہ شہزادہ تھا اور میرا ہی تھا تو اگلے
گاؤں کا پتا کیوں پوچھ رہا تھا؟

”ادھر کیوں جانا ہے؟“ میری اڑھنی کے
پھول بھاری ہو گئے جیسے کوہ سلیمان میرے کندھوں پر
اڑ آیا ہو۔

”میری ماسی ریتی ہے۔“ بالوں کے ہٹھکھوڑ
مٹی میں ڈوبے ہوئے تھے اور آنکھوں کی پلکوں پر گرد
جی جی۔

”ان کی کوئی بیٹی تو نہیں ہے۔“ کنواری
لڑکیوں کے سوال انہیں تا عمر شرمندہ کرتے رہتے
ہیں۔ مقابلہ زیر لب ہٹا تھا۔

”نہیں۔۔۔ اور مجھے اب تک کسی سے محبت بھی
نہیں ہوئی۔“ گھوڑے کو اڑھ لگاتا، گنگناتا ہوا وہ
آگے چل دیا۔ جب اڑھنی کے پھولوں اور دل کو
ایک ساتھ سنبھالنا پڑ جائے تو ایک چیز لازمی ہاتھوں
سے نکلتی ہے۔ سروسوں کے پھول تو میں صحیح سلامت گھر
لے آئی تھی مگر دل؟؟؟

دھلتی شام سے دادی نے ڈوٹی سے ساگ پھیلی
پر رکھ کر بچھا اور بغور مجھے دیکھا تھا۔

”جب لڑکیاں محنت اور دل سے ساگ بناتی
ہیں تو ساگ زیادہ سواد بھرا ہوتا ہے۔“ تھوم کا تڑکا
پیر سے حواسوں پر چڑھ گیا تھا اور رات سے قصہ گو کے
قیسے میں پہلی بار سوال ہوئے تھے۔ قصہ گو تلملائی
گئی۔ داستانوں میں بال برابر بھی رکاوٹ
آجائے تو داستانیں ساتھ چھوڑ دیتی ہیں۔ پرانی ہو
جائیں۔ قصہ گو کا تھا پیٹ کر رہ جاتے ہیں۔

”نانی۔۔۔ کیوں میرے قصوں میں تو سوالوں
کی دیوار کھڑی کر کے راہ روکتی ہے۔؟“ راہ تو
میرے رکے تھے۔ سوال تو میں نے کیے تھے اور
جو لب تو زعفران سے تھے۔ اور اب تک مجھے کسی سے

بھی محبت نہیں ہوئی۔“ دیواروں کی مٹی کا لپ لپس ہو
جاتا تھا۔ پتیلیاں فجر کے دھو میں دھلتی تھیں تو ساری
رات کی ٹھکن اترتی تھی۔ مصلے پر پھر پڑھتے میں
بل بل کر دعائیں مانگتی تھی۔

”کاش۔۔۔ گھوڑے کی باگ پکڑنے والا راستہ
بھول جائے۔“ میں کبھی نہیں جان پاتی تھی کہ دعائیں
راتے بھلاتی بھی ہیں یا نہیں۔ داوی میلے سے واپس
آئیں تو سچ کی ڈھیروں چوڑیاں لے آئیں۔

درجنوں چوڑیوں سے میں نے کھانیاں بھر لیں۔!!!
محبت بھی کج کی چوڑی ہو گئی۔ شور کرتی رہی،
میں نوزائیدہ بچے کی طرح تھک تھک کر سلائی رہی مگر
بے سود۔!!! ساووں کی جس بھری دد پھر کو پرانے
کنوئیں کے پاس وہ گھوڑا چراتا ہوا ملا تھا۔ سچ اور
محبت کے شور نے مجھے بہرہ کر دیا۔

”پھول مگر راستہ بھول گئے ہو۔۔۔؟“ گھاس
بولوں تلے روندتا وہ مقابل آ گیا تھا۔

”چاند مگر راہ یاد کر لیا ہے۔“
”ہائے۔۔۔ منزل تو کچھ اور ہی تھی تمہاری۔“

اب کیوں۔۔۔؟
”چاند مگر کی ناری کو دل دے بیٹھا ہوں۔“ ہوا
پتیلی کی پتلیوں کے ساتھ مل کر سیٹیاں بجاتی رہ گئی۔
”نام کیا ہے تمہارا۔۔۔؟“



”ناجی۔“
”تمہیں کسی نے بتایا ہے کبھی کہ تم کتنی خوب صورت ہو۔۔۔۔۔؟“ میں سوڑے کے پتے توڑتی مدھر ہنسی ہنسی تھی۔

”آہو جی۔۔۔۔۔ کئی بار بتایا ہے۔“ وہ کنویں کی منڈیر سے اندر کالے اندھیرے میں جھانک رہا تھا۔
”زبان کاٹ ڈالوں گا اس کی۔“ میرا ہاتھ میرے دل پر پڑا تھا۔

”کاہے جی۔۔۔۔۔ میری دادی بڑی قصے، کہانیوں کی شوقین ہیں۔۔۔۔۔ کوئی ہو جائیں گی۔“ شہزادہ قہقہے لگاتا گھوڑے کی باگ تھا سے دریا کے پار والے گاؤں چل دیا۔۔۔۔۔ جانے والے کی بانسری اب بھی پرانے کنویں کی منڈیر پر پڑی تھی۔!!!

بانسری کی دھن کے حرمیں، میں سپیرے کے ناگ کی مانند شام کو چھٹی چلی آئی تھی۔ وجود تڑپ اٹھتا تھا۔۔۔۔۔ سکون آپ حیات سانا یا ب ہو جاتا تھا۔ سوڑے کی شاخوں کے پار سے چاند کی لگا چھپی جاری رہتی تھی۔ وہ میرا ہاتھ پکڑے میری جگہ کی چوڑیاں گھما تارہا تھا۔

”تیرے ہاتھوں میں بھتی ان چوڑیوں سے بڑھ کر دنیا کی کوئی آواز خوب صورت نہیں لگتی۔“

”مہندی سے ہاتھوں کو رنگا کرو۔۔۔۔۔ مہندی تمہاری ہتھیلیوں پر بڑے بکے رنگ چھوڑتی ہے۔“
”جیسے اپنے گھر کی ملکہ بناؤں گا جہاں تیرا حکم چلے گا۔“ خوابوں کی سیرجیوں کے پائیدان میری دسترس میں تھے۔

”ہم دونوں کا اک چھوٹا سا گھر ہوگا۔۔۔۔۔ اس گھر

میں ایک اونچی کھڑی ہوگی جس سے میں بانس کی سیرجی لگا کر تمہیں دیکھا کر دوں گی۔ دیوار کے درختوں کے کتوں کے ساتھ ہماری بھیڑیں بندھی ہوں گی۔ تمہاری بانسری کی دھن سنتے ہی میں ساگ کی ہانڈی چھوڑ کر تمہاری راہ کی طرف بھاگوں گی۔“
میری آواز ساڑھ ساٹواں سر ہو گئی۔ اس کے ہاتھ

میرے بالوں میں تھے۔

”اور اگر تمہاری ہانڈی جل گئی تو۔۔۔۔۔؟“ وہ ہلکا تھا اور میں غصے سے پرے ہوئی تھی۔

”مذاق اڑا رہے ہو میرا۔۔۔۔۔“ وہ میرا ہاتھ کچھ کر قریب ہوا تھا۔

”تو لڑتی جھگڑتی بڑی سوئی لگتی ہے، فکر نہ کریں وہ جلی ہوئی ہانڈی شوق سے، ہنسی خوشی کھالوں گا۔“
مردوں کو کبھی خبر ہی نہیں ہوتی کہ ان کی محبت میں عورتیں کتنی ہانڈیاں جلا بھتی ہیں اور روٹیاں تو سے پرکالی کرتی ہیں۔ محبت کے منگ کو پہلے پہل قصہ گو نے پکڑا تھا۔

”ناجی تو کیسی ہو گئی ہے۔۔۔۔۔؟“ میں نے حمن میں گول گول گھومتے ہوئے اپنے آپ کو سوالیہ نظر سے دیکھا تھا۔

”کیسی ہو گئی ہوں۔۔۔۔۔؟“ دادی نے جیسے وہ سوال سنا ہی نہیں تھا۔ وہ اماں کا ہاتھ تھا سے کہہ رہی تھیں۔

”صغریٰ! ایسی جوان اولاد سے خوف کھایا کرو، صدقہ دیا کرو۔۔۔۔۔ بڑی آزمائش کا وقت ہوتا ہے۔“
اور میری نظر زمین پر پڑتے میرے سائے پر تھی اور اماں کی نظریں مجھ پر۔

”ارے چھوڑیں اماں! خواتواہ وہم مت پالا کریں۔۔۔۔۔ ناجی جتنی لڑکی پورے وسیب میں نہیں ہے۔۔۔۔۔ لڑکوں کی مائیں سرد آہیں بھر بھر دیکھتی ہیں۔۔۔۔۔ ناجی کو اس ویڑھے بھیجوں گی جن کے گھوڑوں کے بارخ ہوں گے۔“

نظریں پھر پھوڑتی ہیں۔۔۔۔۔ اور پیار کی نظر تو وجود سیاہ کرتی ہے۔۔۔۔۔ جوانی صدقہ چاہتی ہے،

آزمائش ہوتی ہے۔ مجھے میری نظر نے کالا کیا تھا یا پھر اماں کی نظر نے۔۔۔۔۔؟ یا اس رات نے۔۔۔۔۔؟؟؟

☆☆☆

اس سیاہ پوش رات کے اندھیرے نے مجھے اندھا کر دیا تھا۔ گدھوں نے مردار کو ج کھائے تھے

اور میری محبت بھی مردار ہو گئی تھی۔ دادی نے کبھی بھی تو وہ قصہ نہیں سنایا تھا کہ جس میں شہزادہ گدھ کا روپ دھار لیتا ہے۔۔۔۔۔ میرا گدھ میرے سامنے تھا۔

”یہ اچھا نہیں ہوتا شہاب۔“
”نہیں ناجی۔۔۔۔۔ تمہارا وجود میرا ہی تو ہے۔۔۔۔۔“

میں حق رکھتا ہوں۔

”مگر ابھی ہمارا کوئی شرعی رشتہ نہیں بنا۔۔۔۔۔ یہ منہا ہوتا ہے۔“ میں پیچھے اور پیچھے ہٹنے لگی تھی۔ وہ آگے اور آگے بڑھنے لگا تھا۔

”رشتہ بن جانے گا۔ تم فکر مت کرو۔“
”نہیں شہاب۔۔۔۔۔ میں نے گھر جانا ہے۔“

جینگر رونے لگے تھے۔ گیدڑوں کی آوازیں ماتم تھیں۔۔۔۔۔ میں نے اسے دھکا دیا تھا۔

”چھوڑو مجھے۔۔۔۔۔ تم نے مجھے محبت کے نام پر دھکا دیا ہے۔“ سوڑوں کی شاخوں سے جھلکا چاند بادلوں کی اوٹ میں جا چھپا۔۔۔۔۔ اور کوئی تارا ٹوٹا۔

میری اوڑھنی اندھے کنویں میں جا گری۔۔۔۔۔ میں اس رات راستوں کی دھول میں شگے سرگرتی پڑتی گھر آئی تھی۔ گھر کے حمن میں اوندھے منہ گر پڑی۔

رات کے پچھلے پہر ڈربے میں بند مرغیاں کر لائے تھی تھیں۔۔۔۔۔ ماچس کی ڈبیا کے بونے آگ کے الاؤ کے آس پاس لڑھک گئے تھے اور ان کی چادر گرتی لائین لے کر چوکھٹ میں کھڑی تھی۔ قصہ گو کا چہرہ لہجے کی مانند سفید تھا۔

”ناجی۔۔۔۔۔ یہ۔۔۔۔۔ رات کے آخری پہر شگے سر تو کہاں سے آ رہی ہے۔“ میں ان کے قدموں میں ڈھم سے گر پڑی۔

”دادی۔۔۔۔۔ شہزادہ گدھ بن گیا تھا۔“
میں نے اپنے آپ کو ”چپ سہیلی“ کر لیا۔
آواز گونگی ہو گئی اور زندگی خاموش۔۔۔۔۔ تب سے قصہ گو کے قصوں نے مجھے بے زار کر دیا۔ ہم لڑکیوں کو قصے اور حقیقت کا فرق کیوں نہیں پتا ہوتا۔۔۔۔۔ آج بھی ماچس کی ڈبیا کے بونے آگ کے الاؤ کے گرد بیٹھے ہوتے ہیں اور قصے سنتے ہیں۔۔۔۔۔ اور ”چپ سہیلی“

میں نے اپنے آپ کو ”چپ سہیلی“ کر لیا۔
آواز گونگی ہو گئی اور زندگی خاموش۔۔۔۔۔ تب سے قصہ گو کے قصوں نے مجھے بے زار کر دیا۔ ہم لڑکیوں کو قصے اور حقیقت کا فرق کیوں نہیں پتا ہوتا۔۔۔۔۔ آج بھی ماچس کی ڈبیا کے بونے آگ کے الاؤ کے گرد بیٹھے ہوتے ہیں اور قصے سنتے ہیں۔۔۔۔۔ اور ”چپ سہیلی“

دیوار کی طرف منہ کی لٹٹی رہتی ہے۔۔۔۔۔ فریب اور دھوکے سلیمانی ٹوٹی پٹن کر آتے ہیں، خبر ہی تو نہیں ہونے دیتے۔۔۔۔۔ اماں کو میری فکر ہے ہر روز میرا چہرہ ہاتھوں کے پیالے میں لے کر بیٹھ جاتی ہیں۔

”ناجی۔۔۔۔۔ تو بھتی کیوں نہیں؟“

”چپ سہیلیاں چپ کی وفادار ہوتی ہیں

اماں۔۔۔۔۔ اگر نہ ہوں تو پھر عیب شگے سر میٹروں میں پھرا کرتے ہیں۔“

”مجھے نظر لگی ہے۔“ میں یوں ہنسی تھی کہ مجھے رونا آ گیا تھا۔

”نظر لگتی تو ٹھیک تھا اماں۔۔۔۔۔ یہاں تو۔“

”مگر کیا۔۔۔۔۔؟“ میں حمن میں شگے پیر چلنے لگی۔

دو پٹا گھسٹا رہا۔ غرغروں کرتے کبوتر خے پاؤں سے دھاگے اٹھتے تھے، میری تب تک نظر پڑتی رہی جب تک وہ مجھے دھندلے نظر نہیں آنے لگے۔

دھندلا تو آتا کچھ تھا اگر وہ بھی ہوتا تو۔۔۔۔۔؟
اندھی رات، گدھ شہزادہ، سوڑے کے پار چھپتا حیا دار چاند، گیدڑوں کا ماتم۔۔۔۔۔ اور دھول اڑاتے راستوں میں شگے سر بھاگتی اماں کی لاٹھی ناجی۔۔۔۔۔ وہ

ناجی جو اس گھر میں جانے والی تھی جہاں مجھوروں کے بارخ تھے۔ گھوڑوں کے گروہ گزرنے لگے۔۔۔۔۔ زمین ادھڑتی رہی۔ دھول کی تھاپ، آوازیں شور۔۔۔۔۔ مسافروں کو روک کر کسی نے پوچھ لیا تھا۔

”کہاں جا رہی ہے رات۔۔۔۔۔؟“ میں کھڑکی میں کھڑی بالوں کے چھپے شہزادی بن گئی۔

”پھول مگر کو جا رہی ہے۔“ سر پٹ گھوڑا دوڑاتا گدھ شہزادہ آگے اور آگے کو جا رہا تھا۔ کھڑکی بند ہو گئی۔

شہزادی کے بال کٹ کر مٹی میں مٹی ہو گئے۔ قصہ شروع یا ختم۔۔۔۔۔؟ میں آگ کے الاؤ کے پاس اپنے بونے اٹھنے کیے انہیں قصہ سنا رہی ہوں۔۔۔۔۔!!!

”مسافر راست نہیں بھولا۔۔۔۔۔ مسافر نے پھول مگر ہی جانا تھا۔ دہاں اس کی ماسی رہتی تھی اور ماسی کی ایک بیٹی تھی تھی۔ جس سے مسافر کو محبت بھی تھی۔“

☆

مرحوم عزیز وہ اک شخص

وہ دونوں بازو کھڑکی میں نکالے ہتھیلیوں پر چہرہ رکھے سامنے گھر کو دیکھنے کے ساتھ سوچنے میں مصروف تھی۔ اسے یہ گھر اور اس گھر میں رہنے والے لوگ بہت پسند تھے۔ اس کا اپنا زیادہ وقت بھی اسی گھر میں گزرتا تھا، لیکن وہ جتنا بھی یہاں رہ لیتی آخر اسے لوٹ کر یہیں آنا تھا جو اس کا گھر تھا۔ اسی سوچ کے ساتھ ہی اس کی مسکراہٹ سمٹ گئی اور وہ برا سامند بنا کر کھڑکی سے پیچھے ہٹ گئی۔

پڑی پڑی کتابوں کو کھول کر وہ ایک بار پھر حساب کے ان سوالوں کو دیکھنے کی کوشش کرنے لگی جو اس

مکمل ٹافل



اور پاپا آنے والے ہیں۔“

”میں....؟“ زہرہ نے حیران ہو کر پوچھا۔
شرمہ نے ماتھے پر ہل ڈال کر اسے دیکھا۔
”کیوں نہیں کیا ہے؟“

”آئی! مجھے کچھ بنانا نہیں آتا۔“

”بنانا نہیں آتا تو سیکھو بھی میٹرک کی اسٹوڈنٹ ہو سوائے ادھر سے ادھر پھرنے کے اور بھی کچھ آتا ہے تمہیں۔ وہ زینت بھی نہیں آتی۔“
اس نے ان کے گھر کام کرنے والی عورت کا نام لیا۔ ”وہ نہ مجھے شوق نہیں تمہیں کہنے کا۔“

”تو آئی! آپ بنائیں۔“ اس نے ڈرتے ڈرتے کہا اور وہی ہوا وہ تجھے سے اکھڑ گئی۔

”بننا سکتی تو تمہارا احسان نہ لیتی، لیکن میں نے ابھی فیشل کے بعد اسٹیم لی ہے، چو لیے کے آگے نہیں

جاسکتی۔ تم نے نہیں بنانا نہ بناؤ۔ میں ماما کو بتا دوں گی اور پاپا کو تو تم جانتی ہو۔“

وہ کندھے اچکا کر یوں بولی جیسے گھر میں کھانا پکانے کی ذمہ داری صرف اسی کی ہے۔ وہ کتنی دیر بے بسی کے عالم میں وہیں کھڑی اسے دیکھتی رہی جو اپنی بات مکمل کرنے کے بعد بے نیازی سے اپنا کام کرنے میں مصروف ہو گئی تھی

وہ خاموشی سے بچن میں آگئی فریج کھول کر دیکھا۔ اس میں کوئی سبزی موجود نہیں تھی۔ صرف انڈے تھے، لیکن خالی انڈوں کا وہ کیا کر لے گی۔ وہ روہاسی ہو کر کینٹ کی طرف مڑی۔ ایک طرف کھانے کی فکر، دوسری طرف اسے اپنا ہوم ورک مکمل کرنا تھا۔ کل مس شمشاد کی کلاس میں ٹیسٹ تھا اور ان کی سخت گیری تو پورے اسکول میں مشہور تھی۔ اس کا دل تو ویسے بھی گنزد تھا۔ کوئی اونچی آواز میں بولتا تو وہ ڈر جاتی۔ اس نے ایک ایک کر کے مائیک ڈبے کھولے۔ مختلف دالیں تھیں۔ ایک ڈبے میں ایسے مسور کی دال نظر آ گئی۔ اسے یہی دال بنانی آتی تھی۔ اس نے جلدی سے آنسو صاف کر کے دال چڑھائی اور دوسرے چوبیسے پر

چاولوں کا پانی رکھا تب ہی شرمہ آ گئی۔

”کیا بنا رہی ہو؟“

”دال چاول۔۔۔۔۔“

شرمہ نے برا سا منہ بنایا۔ ”تم کچھ اور نہیں بنا سکتیں، چتا بھی ہے تمہیں مجھے دال چاول پسند نہیں، مجھے صرف یہی دال بنانی آتی ہے۔“
”تو شرم کرو، یہی دال بنانی آتی ہے، کچھ گھر کے کاموں پر بھی توجہ دو، سارا دن تو عفرائے گھر ٹھنسی رہتی ہو۔“ زہرہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔

چاولوں کا پانی ابل رہا تھا۔ چاول ڈالنے کے بعد اس نے دال کو تڑکا لگا لگا چاولوں سے پانی نکالنے کے لیے دھنکی اٹھائی تو دھنکی کو سج طرح نہ پکڑنے کی وجہ سے اس کا ہاتھ اچھا خاصا جل گیا۔ اس نے بجائے کوئی ٹیوب لگانے کے اپنا ہاتھ ٹل کے نیچے رکھ دیا، لیکن جلیں کسی صورت کم نہیں ہو رہی تھیں۔

دھنکے کو تانے کے لیے باہر آئی تو وہ موبائل لے کر اپنے کمرے کی طرف جا رہی تھی۔ وہ روٹی ہوئی اس کی پشت دیکھتی رہی اور پھر اپنے کمرے میں آ گئی۔ بیڈ پر اس کی کتابیں اور کاپیاں اسی طرح بکھری تھیں، لیکن اسے اتنی تکلف ہو رہی تھی کہ وہ کسی اور طرف دھیان لگاتی نہیں پا رہی تھی۔ جب اس سے درو برداشت نہیں ہوا تو اس نے عفرائے گھر کا نمبر ڈائل کیا، لیکن وہاں کوئی فون انڈ نہیں کر رہا تھا۔ وہ کھڑکی کے قریب آ کر کھڑی ہو گئی۔ سامنے والے گھر میں مکمل سناٹا تھا۔ تب ہی اسے صفورہ کی گاڑی آتی دکھائی دی۔ وہ دوپٹا اچھی طرح ہاتھ پر لپیٹ کر چہرہ داچھی طرح صاف کر کے نیچے اترتی۔ وہ اپنی لاؤنج میں داخل ہوئی تھیں کہ ان کی بچی نظر آئی۔ زہرہ پر بڑی داس کارویا رو یا سا چہرہ انہیں چونکا گیا۔ کتنی عجب نہیں کیا ہوا ہے؟ وہ ٹولڈر بیگ صوفے پر رکھ کر اس کی طرف بڑھیں تو اس نے دوپٹا کھول کر سرخ ہاتھ ان کے آگے کیا۔
”اومانی گاڑو! یہ کیا ہوا! انہوں نے پریشانی سے

اس کا ہاتھ تھاما تو اس کی آنکھوں میں ایک بار پھر آنسو آ گئے۔ اس کے مسلسل رونے اور خاموشی پر وہ صوفے پر بیٹھ کر اکتائے ہوئے لکھے میں بولیں۔

”ایک تو پہلے سارا دن خوار ہو کر آؤ اور آتے ہی کسی نہ کسی کی روٹی صورت دیکھنے کو ملتی ہے اب بول بھی جاؤ زہرہ! پہلے ہی میرے سر میں بہت درد ہے۔“
”ہاتھ جل گیا ہے۔“ وہ ہنسنے لگی۔
”کیسے؟“ وہ اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے بولیں۔

”چاول بناتے ہوئے۔“
”تمہیں کس نے کہا تھا بچن میں جا کر تجربے کرنے کو۔۔۔۔۔“
”زینت آئی نہیں آئی تھیں تو آپ نے کہا۔“

کچھ کھانے کو بنا لو۔“
اب کی بار صفورہ نے ایک نظر اس پر ڈالی اور اٹھ کر بیڑھیوں کی طرف بڑھ گئیں۔ انہوں نے تیزی سے ہنڈل گھمایا۔

آہٹ پر فون پر بات کرتی شرمہ نے ہڑ بڑا کر موبائل بند کر دیا اور ماں کو دیکھ کر اس کی ہڑ براہٹ اکتاہٹ میں بدل گئی۔

”ماما! میرا خیال ہے میں اتنی بڑی ہو گئی ہوں کہ آپ کو میری پرائیویسی کا خیال رکھنا چاہیے کم از کم تاک ہی کر لیا کریں۔“

صفورہ نے ماتھے پر ہل ڈال کر اس کے انداز دیکھے۔ ایسا تم کیا کر رہی تھیں کہ مجھے تمہاری پرائیویسی کا خیال رکھنا چاہیے تھا اور اگر تمہیں اپنے بڑے ہونے کا اتنا ہی احساس ہے تو گھر کے کام کرنا بھی سیکھو۔ کھانا بنانا تمہارا کام تھا نا کہ زہرہ کا۔ اس پر کیوں علم چاتی ہو دیکھو جا کر اس نے اپنا ہاتھ جلا لیا ہے۔

”انورہ ماما! شرمہ نے گود میں رکھا تکیہ بیڈ پر چٹا اور بیڈ سے نیچے اتر آئی۔
”اتنی تھکی چکی بھی نہیں، سولہ سال کی ہو گئی ہے۔ چاول نہیں ابال سکتی۔“

”اور تم اس سے چار سال بڑی ہو۔ تم نہیں چاول ابال سکتیں۔“

”پلیز ماما! میں بحث نہیں کرنا چاہتی، میری پڑھائی بہت لمبی ہے، میں پوزیشن ہولڈر ہوں۔ میں پڑھائی کے علاوہ کسی اور چیز پر کانٹر بیٹ نہیں کر سکتی، جبکہ آپ کی وہ کھلی پٹی ایورج اسٹوڈنٹ ہے۔ پڑھائی کے علاوہ اسے سو کام ہوتے ہیں خاص طور پر سامنے والے گھر میں وقت گزارنا۔ وہاں بڑی خوش رہتی ہے۔“

گھر آتے ہی اس کی شکل پر پینکار بر سے لگتی ہے۔ ذرا سا کام کیا کرنے کو کہہ دیا۔ اس نے شکایتوں کے انکار لگا دیے۔ ”وہ غصے سے بولنے لگی۔ صفورہ نے ہونٹ سمجھ کر خود کو کچھ سخت کہنے سے روکا۔

”جس کے بارے میں تم یوں جلی جلی سنارہی ہو، وہ تمہاری سگی ماں ہے۔ بہنوں میں تو اتنا اتفاق ہوتا ہے اور تم اس سے سو کنوں کی طرح مقابلہ کرتی ہو۔“
”ماما! مجھے اپنی اسائنمنٹ مکمل کرنی ہے۔ وہ

اپنی رائٹنگ ٹیبل سے فائل اٹھاتے ہوئے بولی، جس کا مطلب تھا آپ جاسکتی ہیں۔“ آئندہ خود کام کر سکتی ہو تو کرو۔ زہرہ کو کہنے کی ضرورت نہیں تھی۔ کہہ کر وہ رکی نہیں۔

”ہونہ۔۔۔۔۔“ شرمہ نے غصے سے ہنکارا بھرا۔
”اس بی جال کو تو میں دیکھ لوں گی۔ کیسے شکایتیں لگاتی ہے۔ شکل دیکھو تو معصومیت سے دس لوگوں کو دھوکا دے جائے اور ماما نے اس کی وجہ سے مجھے ڈانٹا۔“ شرمہ کو کسی طور پر یہ بات ہضم نہیں ہو رہی تھی۔

☆☆☆☆

”یہ کیا ہے؟“ وقار نے ڈوگلے کا دھکن اٹھا کر پہلے اندر جھانکا اور پھر تھچے سے شور بے میں تیرے مسور کے دانوں کو دیکھا۔

”تمہیں کیا نظر آ رہا ہے؟“ ان کے برعکس صفورہ بڑے اطمینان سے اپنی پلیٹ میں چاول نما ملغوبہ ڈال رہی تھیں۔

”کچھ میں نہیں آ رہا۔ اسی لیے تو پوچھ رہا ہوں۔ زینت نے کیا کوئی نئی ڈش ٹرائی کی ہے۔ ان کے الفاظ کے برعکس ان کی آنکھوں سے غصہ جھلک رہا تھا۔

”زینت آج نہیں آئی۔“ انہوں نے اب نیا لوں پر وہ شور مچا دیا اور ڈال کر کھانا شروع کر دیا تھا۔ ”تو یہ.....“ وقار نے اب بھی پلیٹ میں کچھ نہیں ڈالا تھا۔

”یہ زہرہ نے بنائے ہیں۔“

”زہرہ نے.....“ وہ حیران ہو کر بولے۔

”شمرہ کہاں تھی، وہ بانی۔“

”اس کو کچھ بتانا نہیں آتا۔“ وہ کھاتے ہوئے بولیں۔

”ظاہری بات ہے جیسی ماں ویسی بیٹی۔ تمہیں کچھ بتانا آتا ہوتا تو انہیں کھاتی ناساری عمر گزرتی۔ باہر کا اور نوکروں کے ہاتھ کا کھاتے ہوئے۔ کچھ تو یاد نہیں پڑتا، ابھی تم نے کچھ بنایا ہو، بے چاری اماں مرحومہ جی یہ ہی خواہش لیے دنیا سے گزر گئیں۔“

صفورہ کا پلیٹ میں چلا چھوڑ گیا۔ انہوں نے ایک جلتی نظر سامنے پیٹھ اپنے بے حس شوہر پر ڈالی۔

”اور ساری عمر ہوگی مجھے مشین کی طرح کام کرتے ہوئے جب سے تم سے شادی کی ہے، ایک دن بھی سکون کا سانس نصیب نہیں ہوا۔ پہلے تمہاری اماں مرحومہ نے زندگی کا دائرہ تنگ کر رکھا تھا اور اب تم

ان کی کی پوری کر رہے ہو اور یہ جو تم ہولوں اور نوکروں کے کھانوں کی بات کر رہے ہو۔ شکر کر دے بھی ملتے ہیں، تو کس کی وجہ سے..... میری وجہ سے، میں اگر صبح سے

شام تک کام نہ کروں تو تم لوگ یوں عیش نہیں کر سکتے۔ تم نے آج تک کیا، کیا ہے سوائے باتیں کرنے اور طفر کرنے کے اپنی اماں مرحومہ کی طرح۔“

وہ جو اتنی دیر سے اسے محل کا مظاہرہ کر رہی تھیں۔ صبر کا دامن چھوٹ گیا تھا۔

”اپنی زبان کو گام دو صفورہ!“ وقار نے غصے

سے پلیٹ کو پیچھے دھکیلا۔

”ختم ہو گئیں باتیں یا کچھ اور ہے بولنے کو اور جن مٹیوں کی بات کر رہے ہو۔ وہ تمہاری بھی ہیں، میں ایسا کرتی ہوں، چاہ چھوڑ دیتی ہوں اور گھر بیٹھ کر ان کی کو لنگ پر دھیان دیتی ہوں۔ تم کہیں کام

ڈھونڈ لو اور پر مہینے ساٹھ ستر ہزار میرے ہاتھ پر رکھ دیا کرو، میں اپنی زبان کو گام دے دوں گی۔“

”تمہیں بڑا مان ہے اپنے کمانے کا۔“ وقار دانت پیس کر بولے۔

”کیوں نہیں ہونا چاہیے؟“ جوابا وہ ابرو چاک کر بولیں۔

”تو وہ صبر کا کڑوا ٹھونٹ پی کر رہ گئے۔“

”زندگی عذاب ہوگی ہے، تم جیسی بد زبان عورت سے شادی کر کے۔“

”تو کر لیتی تھی تا اپنی اس گنوار کزن سے شادی، جس سے شادی کروانے کی خواہش دل میں لیے تمہاری اماں مرحومہ چل بسیں۔“ وہ طنز یہ انداز میں ہنستے ہوئے بولیں۔

”ہاں کر لیتا..... اگر تم پر نظر نہ پڑی ہوتی۔ شکل دیکھ کر یہ تو چاہ نہیں چلتا کہ منہ کے اندر کتنی گز بھر لی

زبان ہے۔“

”اور واقعی شکل کے ساتھ میٹھی زبان دیکھ کر یہ پتا نہیں چلتا۔ یہ زبان کتنا زہر اگل سکتی ہے۔“ جوابا وہ بھی دو ہندو بولیں۔

”میں بحث نہیں کر سکتا تم سے.....“ وہ بار مانتے ہوئے بولے۔

”تو مت کرو۔ میں نے کب تمہیں دعوت دی تھی؟“ وہ اب بیٹیش اٹھا کر ٹرائی میں رکھتے ہوئے بولیں۔

”مجھے سخت بھوک لگی ہے۔“ آخر ان سے صبر نہ ہو سکا تو انہیں کہنا پڑا۔

”انداز کچھ نہیں سوائے اس وال چاول کے۔“

”میں پڑاؤ کر کے لگا ہوں۔“

صفورہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ کافی رات ہو چکی تھی اور صبح انہیں پینک بھی جانا تھا۔ انہوں نے پہلی میری پر قدم رکھا تھا جب وقار کی آواز سنا دی۔

”ہزار روپے دیتی جاؤ۔“ صفورہ نے ایک افسوس بھری نظر اس بے حس انسان پر ڈالی جس سے اس نے ابھی محبت کی بھی اور سیر حیاں چڑھ گئیں۔

اپنے کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے ان کے ذہن زہرہ کے کمرے کے باہر دکھ گئے۔ انہوں نے آہستگی سے دروازہ کھولا۔ کمرے میں مکمل خاموشی تھی۔

وہ اس کے دروازے پر چھنے آئی تھیں، لیکن وہ شاید سوئی تھی۔ وہ بند ہوئی آنکھوں کے ساتھ مڑی تھیں۔

دروازہ بند ہوتے ہی زہرہ نے مڑ کر دیکھا اور اس کے آنسو پھر رواں ہو گئے۔ ایک تو بھوک، دوسرا ارد کی وجہ سے اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ کافی دیر تک جب اسے سکون نہیں آیا تو وہ دروازہ کھول کر دے

باہر باہر نکلی۔ اس نے اوپر سے نیچے جھانکا جہاں لی لی لاؤنچ کی تیز روشنی میں سب نظر آ رہا تھا۔ لارج بڑا کا باکس کھلا تھا۔ وقار اور شمرہ کسی مودوی پر تہمرہ کرتے ہوئے بڑا کھا رہے تھے۔

زہرہ نے بڑے دکھ سے اس منظر کو دیکھا۔ بھوک تو وہ بھی تھی، لیکن کسی کو وہ یاد بھی نہیں تھی۔ کھانا تو دور کی بات پاپا نے ایک دفعہ بھی اس کا جلا ہاتھ

نہیں دیکھا۔ وہ جو بچن میں کچھ کھانے کے لیے جاری تھی۔ لڑکھڑاتے قدموں سے واپس لوٹ گئی۔

☆☆☆

صبح جب وہ تیار ہو کر پیچھے اتری۔ ماما چاچکی تھیں۔ بچن سے برتن دھونے کی آواز آ رہی تھی۔ ڈانٹک ٹیبل پر اس کا ناشتا رکھا تھا۔ تو سٹھنڈے

جو چکے تھے لیکن وہ رات کی بھوک تھی۔ اس نے اکرے ہوئے تو س پر جم لگایا۔ ابھی اس نے بشکل ایک قوس کھا کر دو ٹھونٹ دودھ پیا تھا کہ اس کی

اسکول دین آ گئی۔ وین میں بیٹھنے سے پہلے اس نے عفرہ کے کمرے کی طرف دیکھا۔ ان کے پورچ میں گاڑی کھنسی تھی جس کا مطلب تھا عفرہ جا چکی ہے۔

وین میں موجود لڑکیوں نے چور نظروں سے اس کی سوچی ہوئی لال آنکھوں کو دیکھا، لیکن کسی نے اس سے نہیں پوچھا نہ بلایا کیونکہ ایک تو وہ دے بھی خاموش طبع تھی۔ دوسرا وہ اپنے احساس کتری کو لائق میں چھپانے کی کوشش کرتی تھی۔ عفرہ کے علاوہ اس کی کوئی دوست نہیں تھی۔ جب وہ اسکول گیٹ کے اندر داخل ہوئی۔ عفرہ پہلے سے درخت کے نیچے

خصوصی جگہ پر کھڑی اس کی منتظر تھی۔

”تم ٹھیک ہو، کیا ہوا ہے؟“ اس نے حیرت اور پریشانی سے زہرہ کی سوچی ہوئی لال آنکھیں دیکھیں۔

”کچھ نہیں۔“ وہ نظریں چراتے ہوئے بولی۔ عفرہ نے اس کا ہاتھ تھاما، تو درد کے مارے اس کی سسکی نکلی گئی۔ عفرہ نے حیرت سے اس کا چہرہ دیکھا اور ہاتھ

پر نظر پڑے ہی اس منہ سے ”او میرے خدا“ لگا تھا۔ زہرہ نے آگلیں ایک بار پھر آنسوؤں سے بھرنے لگیں۔

یہ کیسے ہوا؟ اس نے افسوس سے اس کا ہاتھ پکڑا جہاں بڑے بڑے چھالے بنے تھے۔

”کھانا بناتے ہوئے جل گیا۔“

”تم کیوں کھانا بنا رہی تھیں بانی سب کہاں تھے؟“ عفرہ کے سوال پر وہ خاموش رہی تھی۔

گھنٹی بج گئی تھی۔ جیڑیہ انارٹ ہو گیا تھا۔ زہرہ کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔

”عفرہ!“ اس نے کا پتلی ہوئی آواز میں عفرہ کو پکارا۔

”میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی میں نے میٹ کی تیاری نہیں کی اور ہوم ورک بھی نہیں کیا۔“

اس کی بات سن کر عفرہ ابھی پریشان ہو گئی۔ ”تم چلو..... میں تمہاری مہیپ کر دوں گی، تم میرے پیچھے والی چیئر پر بیٹھنا۔“ وہ اس کو سمجھاتی ہوئی آگے بڑھنے لگی۔

کو کچن چھپر ملتے ہی سب تیزی سے شروع ہو گئے، صرف وہی خالی خالی نظروں سے کو کچن چھپر کو گھور رہی تھی اور چند منٹوں بعد ہی اس شمشاد کی

گھوڑی کھنسی تھی جس کا مطلب تھا عفرہ جا چکی ہے۔

وین میں موجود لڑکیوں نے چور نظروں سے اس کی سوچی ہوئی لال آنکھوں کو دیکھا، لیکن کسی نے اس سے نہیں پوچھا نہ بلایا کیونکہ ایک تو وہ دے بھی خاموش طبع تھی۔ دوسرا وہ اپنے احساس کتری کو لائق میں چھپانے کی کوشش کرتی تھی۔ عفرہ کے علاوہ اس کی کوئی دوست نہیں تھی۔ جب وہ اسکول گیٹ کے اندر داخل ہوئی۔ عفرہ پہلے سے درخت کے نیچے

خصوصی جگہ پر کھڑی اس کی منتظر تھی۔

عقاب کی نظروں نے اسے تازہ کیا تھا۔

”زہرہ اسٹینڈ اپ.....“ ان کی دھاڑی آواز پر سب لڑکیوں نے سر اٹھا کر پہلے مس ششاد کو اور پھر زہرہ کو دیکھا۔ جس کا چہرہ بالکل سفید پڑ گیا تھا۔

”کیا کر رہی تھیں تم؟“ وہ اس کے سین سر پر آ کر کھڑی ہو گئیں اور جیسے کے انداز میں اس کی آنسو شیت اٹھائی جو بالکل خالی تھی۔

”یہ کیا ہے؟“ انہوں نے پچھ کر اس کی آنکھوں کے سامنے لہرایا۔ ”آدھا گھٹنہ ہونے کو ہے اور تم نے ایک سوال بھی حل نہیں کیا اور بار بار عفرہ کے پیچہ کی طرف کیا دیکھ رہی ہو۔“

”میں کچھ پوچھ رہی ہوں؟“ انہوں نے انگلی زور سے اس کے سر پر بجاتی۔

”ٹیسٹ کی تیاری کی بھی ہے یا نہیں؟“

اب کی بار اس نے سر ہٹی میں ہلایا۔

عفرہ اسے لکھنا مشکل ہو گیا تھا۔ وہ ایک دم اشی تھی۔ ”میم! کچھ نیکی کل سے زہرہ کی طبیعت خراب ہے۔ اس کا ہاتھ جل گیا تھا۔ اس وجہ سے وہ تیاری نہیں کر سکی۔“

”عفرہ! کیا میں نے آپ سے کچھ پوچھا؟ جو آپ اس کی دکان کرنے کھڑی ہو گئی ہیں۔ ہر ٹیسٹ میں اس کا رویہ ایسا ہی ہوتا ہے۔ اب کی بار اس کی

کسیلین مجھے پرنسپل تک لے کر جانی پڑے گی۔“

ان کے کہنے پر عفرہ نے مجبور نظر روتی ہوئی زہرہ پر ڈالی اور برسوں سے پہلے کل کرنے لگی۔

”اور تم زہرہ ٹیسٹ آؤٹ، میری کلاس سے باہر نکل جاؤ۔“

”میم!“ وہ روتے ہوئے اتنا ہی بول سکی۔

”جو میں نے کہا ہے، دیا ہی کرو، ورنہ میں اس سے بھی زیادہ سخت مزادے سکتی ہوں۔“ زہرہ جھکے سر کے ساتھ باہر نکل کر دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑی ہوئی۔

اتنی ذلت..... اسکول کا ہر آٹا جاتا بچہ اسے

دیکھ رہا تھا۔ کچھ تو خاموشی سے گزر رہے تھے اور کچھ کے چہرے کی آواز اسے صاف سنائی دے رہی تھی۔

”تم میرے ساتھ چلو۔“ چھٹی کے وقت عفرہ نے اسے کہا تو وہ خالی خالی نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

لاؤنج میں داخل ہوتے ہی عفرہ نے لاؤنج آواز میں سلام کیا تھا۔

”آگئی میری عزت!“ صائمہ آتی بولتی ہوئی کچن سے نکلیں اور ساتھ ہی ان کی نظر زہرہ پر پڑی۔

”ارے زہرہ بھی آئی ہے۔“ وہ کہتے ہوئے آگے بڑھیں۔

”کیا ہوا زہرہ! طبیعت ٹھیک ہے؟“

”نہیں ممما! اس کی طبیعت بالکل ٹھیک نہیں۔ یہ اس کا ہاتھ دیکھیں۔“ عفرہ نے اس کا جلا ہوا ہاتھ اونچا کیا۔

”اومیرے خدا..... کیا، کیا تم نے بیٹا۔ کچھ لگا یا بھی یا نہیں؟“ وہ اس کا دوسرا ہاتھ تھام کر اسے صوفے تک لے آئیں۔

”کوئی کنگ کا شوق پڑھا یا میڈم کو بندہ پوچھے بی بی اگر پکنا نہیں آتا تو پکنا لینے کی ضرورت کیا ہے۔“ صائمہ اس کا مرجھایا ہوا چہرہ دیکھ کر کچھ بول ہی نہیں سکیں۔

”بیٹا ازمنت پکانے نہیں آئی تھی؟“ انہوں نے اسے بازوؤں کے گھیرے میں لے کر پوچھا۔

”نہیں.....“

”شرم کہاں تھی؟“

”آپ نے کہا تھا پکانے کو۔“

”ہوں.....“ انہوں نے سمجھ کر سر ہلایا۔

”لیکن زہرہ! آگ ایک خطرناک چیز ہے۔“

خدا خواستہ زیادہ جل جاتا تو..... تم لاما کا انتظار کر لیتیں۔“

”اگر کھانا نہ بناتی تو آبی غصہ کرتیں، پھر پایا۔“

وہ کہہ کر رکی۔ ”سب بن گیا تھا، پتا نہیں یہ کچھ

”ایسا۔“

”چلو کوئی بات نہیں۔ ایسا ہو جاتا ہے۔“ انہوں نے اسے تسلی دی۔ اور ساتھ ہی انہوں نے اسے اپنے کو آواز دی۔

”جی ممما!“ وہ شاید پڑھ رہا تھا۔ کتاب ہاتھ میں لیے باہر آ گیا۔

”یہ دیکھو، زہرہ کا ہاتھ کس بری طرح ڈھکی ہے۔“ اس نے ذرا سا آگے ہو کر دیکھا اور پھر چمک کر بھٹکا۔

”تو بڑی ای کیا..... کیا ہاتھ کے ساتھ؟“ اس نے ہاتھ پکڑ کر غور سے جائزہ لیا، پورے ہاتھ پر پانی کے بلبلے سے بہتے تھے۔

”کچھ لگایا تھا ہاتھ پر.....“ وہ ہاتھ غور سے دیکھتا ہوا بولا۔

”نہیں درد ہو رہا تھا، تو میں نے ہاتھ پانی کے پیچھے رکھ دیا۔“ فخر نے بے ساختہ ماں کو دیکھا۔

”ہاں بن لیا۔ تم اب تھمرے بعد میں کرنا پہلے کوئی دوا لگا دو۔ مجھے تو لگ رہا ہے بخار بھی ہو رہا ہے، آنکھیں دیکھو، کیسی ہو رہی ہیں۔“

وہ کتاب میز پر رکھ کر اپنے کمرے کی طرف مڑ گیا۔ جب واپس آیا اس کے ہاتھ میں ٹیوب تھی۔

”سیدھا کرو ہاتھ۔“ دوا لگنے سے پہلے ہی زہرہ نے آنکھیں زور سے میچ لیں۔

”یہ برتال ہے آنکھیں نہیں، فخر نے مسکرا کر اس کی بند آنکھوں کو دیکھا۔

”بھائی آپ ڈاکٹر بن رہے ہیں۔ ہیں نہیں۔“ اس لیے ذرا سوچ سمجھ کر دوا لگ دیتا۔ یہ نہ ہو میری

جیاری دوست کا ہاتھ خراب ہو جائے۔“

”تمہاری بیماری دوست نے ہاتھ خراب کرنے میں خود کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ اب تم میری ڈاکٹری کو بدنام نہ کرو۔“ اس نے سر ہم لگاتے ہوئے کہا۔

☆☆☆

وہ جب لاؤنج میں داخل ہوئی نہایت صوفے سے ٹیک لگائے اونگھ رہی تھی۔ دروازہ کھلنے پر وہ چونک کر سیدھی ہوئی۔

”بے بی!“ آج اتنی دیر کر دی۔ کب سے انتظار کر رہی تھی! اسے دیکھ کر وہ کھڑی ہو گئی۔ ”کھانا لگاؤں۔“

”نہیں مجھے بھوک نہیں۔ میں سونے جا رہی ہوں۔ آپ کو اگر کوئی کام نہیں تو آپ بھی آرام کر لیں۔“ وہ کہہ کر سیڑھیاں چڑھ گئی۔

کمرے میں آ کر ٹیگ رکھ کر وہ بیڈ پر چٹ لیٹ گئی تھی۔

جلا ہوا ہاتھ بازو تک اتنا زنی ہو چکا تھا کہ اسے ہلانا دو بھر ہو گیا تھا۔ درد برداشت کرتے ہوئے پتا نہیں کب اس کی آنکھ لگ گئی تھی۔ دوبارہ

اس کی آنکھ کراہنے کے ساتھ کھلی ہوئے ہاتھ کی طرف کروٹ بدلے سو رہی تھی۔ وہ بکشل سیدھی ہوئی۔ کمرے میں گھپ اندھیرا تھا۔ پتا نہیں رات کا

کون سا چہرہ تھا۔ بند دروازہ اس کے باؤں میں موجود اسکول شوز اور یونیفارم بتا رہے تھے کہ کوئی اس کے کمرے میں نہیں آیا۔ اپنی بے فکری اسے ایک بار

پھر دلا گئی، لیکن وہ اٹھ نہیں سکی اس میں ہمت ہی نہیں تھی۔

☆☆☆

وہ ابھی بینک پہنچی تھیں۔ اپنی سیٹ پر بیٹھ کر انہوں نے کیپوٹر آن کیا۔ جب ان کے فون پر کال آئی تھی۔ انہوں نے ایک سرسری نظر ڈال کر فون

دوبارہ ٹیبل پر رکھ دیا، لیکن جب فون منسلک تیسری دنگا یا تو انہیں کال ریسیو کرنی پڑی۔

ان کی جیلو کے جواب میں جب انہیں بتایا گیا کہ فون کہاں سے آیا ہے۔ وہ ان کے لیے حیران

کن تھا، لیکن اس کے بعد جب انہیں آنے کا کہا گیا تو وہ ان کے لیے پریشان کن تھا۔ فون رکھنے کے بعد وہ کئی دیر غائب دماغی سے کیپوٹر اسکرین کر

کے بعد وہ کئی دیر غائب دماغی سے کیپوٹر اسکرین کر

کے بعد وہ کئی دیر غائب دماغی سے کیپوٹر اسکرین کر

دیکھتی رہیں! اب ان کے لیے کام پر توجہ قرار رکھنا ممکن نہ تھا۔ وہ اپنی کولیگ کو ایمر جنسی کا کہہ کر اٹھ گئیں۔ ان کی کار کا زہرہ کے اسکول کی طرف تھا۔

”السلام علیکم؟“ کمرے میں داخل ہوتے ہی انہوں نے سلام کیا تو پرنسپل صاحبہ انہیں دیکھ کر مسکرا دیں۔

”وعلیکم السلام مسز وقار! جلیز آئیں۔“

”خیریت مسز یونس! آپ نے مجھے اتنی ایمر جنسی میں بلایا۔ کوئی پرابلم ہے؟“ ان کے سوال پر مسز یونس نے گھانٹھا کر بات شروع کی۔

”پرابلم تو ہے مسز وقار! اگر چھوٹی موٹی بات ہوتی تو میں آپ کو کال نہ کرتی۔ میں پچھلے کئی سالوں سے آپ کو جانتی ہوں۔ شرہ آپ کی بیٹی ہمارے اسکول کی بریلیٹ اسٹوڈنٹ رہ چکی ہے۔ حتیٰ کہ بورڈ میں پوزیشن لے کر اس نے ہمارے اسکول کا نام روشن کیا ہے لیکن افسوس۔“

وہ کہہ کر رکیں۔ ساتھ ہی صفورہ کے دل کی دھڑکن تیز ہوئی۔ ”جیسی تو حقائق ہمیں زہرہ سے تھیں، مجھے بہت افسوس سے کہنا پڑ رہا ہے۔ وہ بالکل شرہ سے مختلف ہے۔ ہر روز بچہ اس کی کچلیں لے کر آ رہے ہوتے ہیں۔“

”کیا اس کے بی بیویر میں کوئی پرابلم ہے؟“ صفورہ کو اپنی آواز بشکل سنا دی۔

”بی بیویر بھی ایک پرابلم ہے، لیکن یہ نہیں کہ وہ واکسٹ ہو جاتی ہے، وہ بہت کواہٹ ہے اتنی کواہٹ کہ کلاس میں اس کا ہونا نہ ہونا ایک برابر ہے۔ کسی ایکٹیوٹی میں وہ حصہ نہیں لیتی۔ جب بھی ٹیسٹ ہوتا ہے اس کے مارکس آڈٹ اسٹینڈنگ نہیں ہوتے۔ پہلے تو پھر نارمل مارکس تھے۔ اب تو نارمل رزلٹ بھی نہیں ملتا۔ چھوٹی چھوٹی بات پر وہ بہم کر دینا شروع کر دیتی ہے۔ کلاس میں وہ کسی سے بات نہیں کرتی، سوائے عفر اے۔ شاید وہی اس کی ایک فرینڈ ہے۔ میں یہ بھی نہیں کہہ سکتی کہ آپ کے

گھر میں کچھ پرابلم ہے ورنہ شرہ بھی اس سے متاثر ہوتی۔ پھر کیا وجہ ہے اگر آپ ہم سے کچھ شیئر کریں تو شاید ہم کچھ ہیلپ کر سکیں۔ وہ حیران و پریشان تھیں۔ زہرہ شرہ سے بہت مختلف تھی، لیکن پڑھائی میں وہ اتنی پیچھے ہے، یہ تو ان کے وہم و گمان میں نہیں تھا۔ ان کے چہرے پر ایک رنگ آ رہا تھا اور ایک چارہ تھا۔

”آپ پریشان نہ ہوں مسز وقار! ان کے چہرے پر اتار چڑھاؤ دیکھ کر پرنسپل نے انہیں تسلی دی کہ ”سب بچے ایک جیسے نہیں ہوتے۔ میں یہ بات سمجھتی ہوں، لیکن میں جانتی ہوں آپ زہرہ پر زیادہ توجہ دیں۔ ہم بھی کوشش کریں گے، لیکن پرنسپل کا رول بچہ سے زیادہ ہوتا ہے۔“

انہوں نے بشکل سرانجام میں بلایا۔

”اب دیکھیے! آج بھی ٹیسٹ تھا، وہ نہیں آئی۔“ اب کے انہوں نے چونک کر پرنسپل کو دیکھا۔

”اس طرح فرار کا راستہ اختیار کر کے وہ خود کو نقصان پہنچا رہی ہے۔“

”جی..... میں زہرہ پر پورا دھیان دوں گی۔ آپ کا بہت شکریہ..... آپ نے اتنا کٹھن شوکیا۔“

”یہ تو ہمارا فرض ہے مسز وقار! وہ ان سے کھڑے ہو کر ہاتھ ملاتے ہوئے بولیں۔

گاڑی تک آتے آتے ان کی ہمت جواب دینے لگی تھی۔ وہ اتنی لاپرواہ تھیں کہ انہیں یہ تک پتا نہیں چلا کہ زہرہ اسکول گئی ہے یا نہیں، اس کی لائٹ میں کیا ہو رہا ہے۔ ان کی بیٹی سائیکو پینٹنٹی جاری ہے۔ انہوں نے کار میں بیٹھ کر فون کر کے اپنے نہ آنے کا بتایا اور گاڑی گھر کی طرف موڑ لی۔ ان کو یوں اچانک دیکھ کر زہنت حیران ہوئی تھی۔

”بابی! آپ اس وقت۔“

”ہاں۔“ انہوں نے بیک صوفے پر رکھا۔

”شرہ کہاں ہے؟“

”وہ تو کالج گئی ہے۔“

”اور زہرہ.....“

”وہ اپنے کمرے میں ہے۔“

”وہ اسکول کیوں نہیں گئی۔“ انہوں نے ماتھے پر ہل ڈال کر پوچھا۔

”میں تو دو دفعہ اٹھانے گئی تھی، پر وہ نہیں اٹھی۔“

”اس نے ناشتا کیا۔“

”نہیں..... کل رات سے کچھ نہیں کھایا۔ کل دوپہر بھی کھانے سے منع کر دیا تھا۔ کل سے تو وہ کمرے سے ہی نہیں نکلی۔“

”اور تم مجھے ابھی بتا رہی ہو؟“ انہوں نے غصے سے اسے دیکھا، وہ بے چاری بوکھا کر رہ گئی۔

وہ تیزی سے سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اس کے کمرے میں پہنچیں۔ دروازہ کھولتے ہی انہیں جھٹکا لگا تھا۔ وہ یونیفارم میں جوتوں سمیت بیڈ پر آڑی ترچھی لیٹی تھی۔ ان کے دل کو جیسے دھچکا لگا وہ بھاگنے کے انداز میں اس کی طرف بڑھیں۔ انہوں نے اسے پکڑ کر سیدھا کرنا چاہا اور انہیں لگا جیسے انہوں نے آگ کو چھو لیا ہو۔ وہ بخار میں تپ رہی تھی اور بخار کی شدت اتنی تھی کہ اس کا چہرہ دھبہ دھبہ تھا۔ وہ دہلیز سے زہنت کو پکارنے لگیں۔

”زہرہ بیٹا! آنکھیں کھولو۔“ وہ اس کا چہرہ چھو بیٹھا نے لگیں۔

”وہ کب سے یوں پڑی ہے اور کسی نے اسے دیکھا تک نہیں۔“ وہ اب زہنت پر چلانے لگیں، جس کے ہاتھ پاؤں زہرہ کی حالت دیکھ کر پھول گئے تھے۔

”زہرہ! میری جان آنکھیں کھولو۔“ وہ اب اس کا گرم ہاتھ جوڑتے ہوئے رو پڑی تھیں۔

بابی! شاید بخار زیادہ ہونے کی وجہ سے وہ بے ہوش ہے۔ آپ ڈاکٹر کو بلا لیں۔“ زہنت نے ہی انہیں ہوش دلایا تھا۔ وہ تیزی سے نیچے کی طرف بھاگیں، ڈاکٹر کو فون کرنے کے لیے۔

”بخار کافی تیز ہے۔“ اکمل صاحب نے سیدھا ہوتے ہوئے انہیں بتایا۔

”کوئی پریشانی والی بات تو نہیں۔“ صفورہ کی نظر میں مسلسل اس کے سرخ چہرے پر تھیں۔

”اگر آج رات بخار اتر جاتا ہے تو ٹھیک ہے، ورنہ ہسپتال میں ایڈمٹ کروانا پڑے گا۔“ صفورہ نے پریشانی سے ڈاکٹر کو دیکھا۔

”کوئی ذہنی دباؤ یا پریشانی ہے جو بخار اتنی شدت اختیار کر گیا ہے اور ہاتھ دیکھا ہے آپ نے، کتنا جلا ہوا ہے۔“ وہ ان کے نیلی ڈاکٹر گھٹے۔ زہرہ کی حالت دیکھ کر انہیں بھی دکھ ہوا تھا۔

”بہر حال انکلیشن میں نے لگا دیا ہے، آپ پانی کی گیلی پیالیاں اس کے ماتھے پر رکھتی رہیں۔“

ڈاکٹر کے باہر نکلتے ہی شرہ اندر داخل ہوئی تھی۔ ”خیریت ماما! ڈاکٹر اٹکل کیوں آئے تھے۔“

”زہرہ کو کافی تیز بخار ہے۔“ وہ تھکے ہوئے انداز میں بولیں۔

”اچھا کب سے.....؟“ وہ حیران ہوئی۔

”پچھلے۔“ وہ دھیمی آواز میں بولیں۔

”پتا بھی کیسے چلتا، گھر میں نظر کب آتی ہے۔“ وہ منہ بڑھا کر کے بولی۔ صفورہ اس وقت اتنی پریشان اور تھکی ہوئی تھیں کہ اسے ایک نظر دیکھ کر رو گئیں۔

”زہنت آئی! کھانا لگا دیں۔ بہت بھوک لگی ہے۔“ وہ بچن کی طرف ہانک لگا کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔



”ہائی! آپ کے لیے کھانا لگاؤں۔“

”نہیں زینت! امیرا دل نہیں چاہ رہا۔ میں زہرہ کے کمرے میں جا رہی ہوں۔ تم چھڑی ہٹا کر زہرہ کے کمرے میں لے آؤ۔“ وہ دھیرے سے اس کے پاس جا کر لیٹ گئیں اور کئی دیر تک اس کا چہرہ دیکھتی رہیں۔

”کہاں ہو گئی ان سے غلطی؟“ وہ ایک کہنی کے سہارے اٹھتے ہوئے اسے دیکھنے لگیں۔

اس کو دیکھ کر انہیں ہمیشہ اپنی ماں کا چہرہ یاد آتا تھا۔ وہ بھی اتنی خوب صورت اتنی پاکیزہ لگتی تھیں۔ وہ اپنا ہاتھ اس کے چہرے پر پھیرنے لگیں اور آئینوں کے گالوں کو بھگوانے لگے کوئی پچھتاوا سادل میں جا گئے لگا۔ انہوں نے سر تکیے پر رکھ دیا۔

☆☆☆

وہ چھ سال کی تھی جب اس کی ماں فاطمہ چھبیس سال کی عمر میں پیوہ ہو گئیں۔ حسن اور بھرپور جوانی، کتنے ہی ہاتھ ان کی طرف بڑھنے لگے۔ لیکن فاطمہ نے ساری زندگی اس کے لیے وقف کر دی۔ اس کی ہر چھوٹی بڑی خواہش پوری کی۔ وہ ہر ضد مناسبتی تھی۔ جانتی تھی وہ ماں کی کمزوری ہے۔ اس نے ضد کر کے یونیورسٹی میں داخلہ لیا اور انہی اے اے کرتے ہی اسے چاہ ل گئی۔ وہ اتنی ضدی تھی۔ ماں نے کچھ کہنا ہی چھوڑ دیا۔ ماں کی ایک ہی فکر تھی ان کی زندگی میں اس کا گھر بس جائے، لیکن ان کا لایا ہوا کوئی رشتہ اس کے معیار پر پورا نہیں اترتا تھا اور اسے پروا بھی نہیں تھی۔ وہ بہت اچھا کمائی تھی۔ اس کے ارد گرد کے لوگ اس کی خوب صورتی کو سراہتے تھے۔ اسے یقین تھا اسے اپنے معیار کے مطابق ضرور ملے گا۔ پھر بینک میں اس کی ملاقات وقار سے ہوئی۔ وہ بینک کا کلائنٹ تھا۔ آہستہ آہستہ ان کی ملاقاتیں دوستی میں بدلنے لگیں۔ صفورہ جانتی تھی۔ وقار اسے بہت پسند کرتا ہے۔ پسند تو وہ بھی کرنے لگی تھی، لیکن اسے وقار کی جانب سے پہل کا انتظار تھا۔ ایک خوب صورت شام وقار نے اسے پردپور

کردیا۔ وقار کو لفظوں سے کھینا آتا تھا۔ وہ وقار کے صحر میں اتنا کھینکی تھی کہ حقیقت سے مکمل نظر میں چرائے ہوئے تھی۔ اسے لگتا تھا ہر بار کی طرح اس کی ماں یہ ضد بھی پوری کر دے گی، لیکن اس بار ایسا نہیں ہوا۔ ماں کے انکار پر وہ کئی دیر کچھ بول ہی نہیں سکی۔

”لیکن کیوں امی؟ آخر وہ غصے سے بولی نہ کیا برائی ہے وقار میں؟“

”اگر تم سے یہ پوچھوں کیا اچھائی ہے وقار میں؟“

”امی! کیا یہ کم ہے، وہ مجھے چاہتا ہے۔“

”چاہت سے پیٹ نہیں بھرتا۔“ وہ اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے بولیں۔

”وہ ماسٹرز ہے امی! آج نہیں تو کل اسے چاہ ل جائے گی اور اگر نہ بھی لٹی، تو میں چاہ کر رہی ہوں نا، میں سب ہینڈل کر لوں گی۔“

فاطمہ نے اس کی بھری نظروں سے اپنی سمجھدار بیٹی کو دیکھا۔

”چاہ کے علاوہ بھی بہت سی باتیں ہیں۔ اس کا بیک گراؤنڈ، ایک ماں اور مل چکی ہوں میں صفورہ! تم ان لوگوں کے ساتھ گزارا نہیں کر سکتیں۔ ابھی تو تمہیں محبت میں سب بہت آسان لگ رہا ہے، لیکن کچھ عرصے بعد جب محبت کا بھوت اترے گا اور مسائل کا ایک انبار تمہارے سامنے ہوگا، تو یہ محبت ہی تمہیں بوجھ لگے گی۔ تم پچھتاؤ گی اور میں تمہیں اس پچھتاوے سے بچانا چاہتی ہوں۔“

”میں نہیں پچھتاؤں گی اور اگر پچھتاؤں گی تو آپ کے پاس نہیں آؤں گی۔“

وہ بدلتا چہرے سے بولی، تو فاطمہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ان کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر اسے ملال ہوا تو بے ساختہ ان کی طرف بڑھی اور دوڑاؤں ان کے قدموں میں پیٹھ لگائی۔

”ای چلیز! مجھے کی کوشش کریں۔ میں اور وقار ایک دوسرے کے بغیر نہیں رہ سکتے۔ میں جانتی ہوں۔ آپ اپنی مخالفت کیوں کر رہی ہیں، کیونکہ

آپ کو صفیہ خالہ کا بیٹا پسند ہے، لیکن مجھے وہ پسند نہیں۔ زندگی مجھے گزاری ہے، اگر میں خوش نہیں رہی تو آپ بھی خوش نہیں رہیں گی۔“

”صفورہ! میں جانتے ہو جتنے تمہیں کنوئیں میں کودنے کی اجازت نہیں دے سکتی۔ اب چاہے تم جو بھی کہو لو! کرلو۔“ اب کے وہ سخت لہجے میں بولیں۔

”ٹھیک ہے۔ آپ کی مرضی ہے۔“ وہ کہہ کر رکی نہیں۔ فاطمہ نے افسردگی سے اسے جاتے دیکھا۔

ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا وہ کبھی ان کی مرضی کے خلاف جا سکتی ہے، لیکن کچھ دن بعد وہ شادی کر کے خار کے ساتھ ان کے سامنے بیٹھی تھی، وہ تو جیسے سکے میں آ گئیں۔ صفورہ کا خیال تھا وہ انہیں منالے گی، لیکن اس بار اس کی ماں نے اپنا دل سخت کر لیا تھا۔ وہ اپنی زندگی میں خوش تھی۔ وقار اس کا بہت خیال رکھتا تھا، لیکن ان خوشیوں میں ایک کمی تھی، ماں کی خوشی۔ وہ روز جاتی اور بیٹھ کر آ جاتی۔

پھر شرہ ہوئی، اسے لگا وہ اسے اب محاف کر دیں گی، لیکن ایسا نہ ہوا۔ وہ بہت بوڑھی ہو گئی تھیں۔ اس نے چاہا۔ وہ انہیں ساتھ لے آئے، لیکن وہ بھی اس کی ماں تھیں اسی کی طرح ضدی۔

اس کی جہاں دیدہ ماں نے جو پہلے کہا تھا۔ وہ اب بوز رہا تھا۔ وقار ایک سال تو ٹھیک رہا، لیکن پھر اپنے اصلی رنگ میں آ گیا۔ ابھی چاہ کرنا، کبھی چھوڑ کر بیٹھ جاتا اور بینک سے جب وہ تنگی ہادی گھر لوٹتی تو وقار کی ماں الگ سے طعنوں کی تلوار تیز کیے بیٹھی ہوتیں۔ وہ تھک رہی تھی۔

ایسے میں چار سال بعد اسے پتا چلا وہ ایک بار پھر امید سے ہے۔ وقار نے صاف کہہ دیا اسے کچھ نہیں چاہیے۔

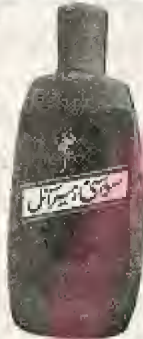
وہ ہمیشہ کی طرح ماں کے پاس گئی شام کو۔ وہ اب بھی اس سے بات نہیں کرتی تھیں۔

”میں پرکھت ہوں امی اور وقار چاہتا ہے یہ بچا اس دنیا میں نہ آئے۔“

بیوٹی بکس کا تیار کردہ

سوہنی ہیر آئل

SOHNI HAIR OIL



- کرتے ہوئے بالوں کو روکتا ہے
- بے بال لگاتا ہے۔
- بالوں کو مضبوط اور چمکدار بناتا ہے۔
- مردوں، عورتوں اور بچوں کے لیے
- یکساں مفید۔
- ہر موسم میں استعمال کیا جاسکتا ہے۔

قیمت 150/- روپے

سوہنی ہیر آئل 12 سی سی بکس کا مرکب ہے اور اس کی چماری کے مراحل بہت مشکل ہیں لہذا ہر چماری میں ہمارا ہے یہ ہمارے میں

ماں کو دوسرے طرح میں دیکھیں کہ وہ بھی جانتی ہے ہمارا اسکا ہے ایک بکس کی قیمت صرف 150/- روپے ہے اور دوسرے طرح کے آؤٹنگ

کر رہے ہیں اس سے بھلائی، رجسٹری سے بھلائی کے آؤٹنگ حساب سے لگائی۔

- 2 بکسوں کے لیے 350/- روپے
- 3 بکسوں کے لیے 500/- روپے
- 6 بکسوں کے لیے 1000/- روپے

نوٹ: اس میں ایک طرح اور بیکنگ چار بکس شامل ہیں۔

میں آخر بھیجے کے لئے ہمارا پتہ:

بیوٹی بکس، 53-اویز گریب، ایکٹ، ریکٹر لور، ایم اے جی، روڈ، کراچی

لنسنی خریدنے والے حضرات منوہنی، ہلنر آف ان جگہوں سے حاصل کریں

بیوٹی بکس، 53-اویز گریب، ایکٹ، ریکٹر لور، ایم اے جی، روڈ، کراچی

مکتبہ عمران ڈا جیسٹ، 37-اویز گریب، کراچی

فون نمبر: 32735021

وہ جو دوسری طرف منہ کیے بیٹھی تھیں، بے ساختہ گھومیں۔ ”تم پہلے ہی اللہ تعالیٰ کے بہت سے احکام کی حکم عدولی کر چکی ہو۔ اب یہ گناہ نہ کرنا۔“ چار سال بعد انہوں نے اس سے بات کی تھی اور اسی وقت وہ بچہ ان کے لیے اہم ہو گیا تھا، جس کی خبر سنتے ہی اس کی ماں کا دل نرم ہو گیا تھا۔

”اگر میں اس بچے کو جنم دوں تو آپ مجھے معاف کر دیں گی؟“ وہ ایک دم اٹھ کر ان کے قدموں میں بیٹھ گئی۔ وہ کچھ دیر اس کا چہرہ دیکھتی رہیں۔

”تم نے مجھے بہت دکھ دیا ہے صفورہ! ماں ہوں نا۔ مٹی نہیں بددعا نہیں دے سکتی ہاں اس بچے کے صدمہ میں نہیں معاف کرتی ہوں۔ لیکن وعدہ کرو، اس کی پرورش ایسے کر دو گی جیسے میں تمہاری چاہتی تھی تاکہ مرنے کے بعد مجھے سکون ہو۔“ اور وہ ان کے سینے پر سر رکھ کر بلک بلک کر رو دی تھی۔

☆☆☆

ان کی آنکھ کسی احساس سے کھلی تھی۔ انہوں نے چونک کر دیکھا۔ زہرہ اٹھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ”زہرہ!“ انہوں نے تیزی سے اسے کندھوں سے اٹھا لیا۔

”کچھ چاہیے تھا بیٹا!“

”پانی!“ اس ایک لفظ سے بھی اس کی فقاہت جھٹک رہی تھی۔

”تم لیٹو، میں لاتی ہوں۔“

وہ ایک دم تیزی سے اٹھیں۔ نیچے ٹی وی چل رہا تھا۔ ریوٹ وقار کے ہاتھ میں تھا اور سامنے چائے کے ساتھ ٹکٹ رکھے تھے، جبکہ دوسری طرف شمرہ ایک ہاتھ میں جوس کا گلاس لیے دوسرے سے موبائل تھا بے مہر و فک تھی۔ انہیں غصہ تو بہت آیا، پر ضبط کرتی ہوئی بیچن کی طرف بڑھ گئیں۔ زینت جگن کی صفائی کر رہی تھی۔

”چھوڑی بیٹی زینت!“

”جی ہاں! زہرہ بے بی اٹھ گئی، طبیعت ٹھیک ہے اب۔۔۔۔۔؟“

”ہاں ابھی اٹھی ہے۔ وہ۔۔۔۔۔ میں۔“ ہاتھ چلاتے ہوئے بولیں۔

زینت نے ان کا تھکا ہوا چہرہ دیکھا۔

”آپ چلیں۔۔۔۔۔ میں آپ کے لیے چائے کے ساتھ کچھ لے کر آتی ہوں، آپ نے بھی سارا دن کچھ نہیں کھایا۔“

”شکریہ۔“ وہ احسان مندی سے کہتے ہوئے مڑیں۔

”ارے بیگم کہاں غائب ہو، جب سے آیا ہوں نظر ہی نہیں آ رہیں۔“ انہوں نے ٹی وی سے نظریں ہٹا کر انہیں دیکھا۔

”زہرہ کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ اس کے پاس ہوں۔“

”کیوں، اسے کیا ہوا؟“ بڑا سرسری انداز تھا۔

”تیز بخار ہے۔“ وہ کہتے ہوئے جگ لیے میز چیلوں کی طرف بڑھنے لگیں۔

”زہرہ کی بیسٹ فرینڈ کا تین مرتبہ فون آچکا ہے۔“ شمرہ نے طنزیہ انداز میں انہیں اطلاع دی تھی۔

”ہم سے زیادہ تو اسے فکر لگ رہی تھی۔“ اب وہ ہنستے ہوئے باپ کو بتا رہی تھی۔ وہ کچھ کے بغیر اوپر آئیں۔ زہرہ بیدار اون سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔

”اب کسی طبیعت سے بیٹا!“

”ٹھیک ہوں ماما!“ وہ تیزی آواز میں بولی۔

”بیٹا اتنی طبیعت خراب تھی، کم از کم ماما کو بتانا تھا نا!“ زہرہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ تب ہی زینت اندر داخل ہوئی۔

”کچھ دیر دیکھ کر اس کے منہ کا ذائقہ اور خراب ہو گیا تھا۔“

”تھوڑا سا کھانا پڑے گا زہرہ! کیونکہ دو آئی

لینی ہے۔“ صفورہ نے سچے سچ اس کے منہ کی طرف

دیکھا تو اسے مجبوراً کھانا پڑا۔

تھوڑا سا کھانے کے بعد اس نے منع کر دیا تھا۔

”اب میری بیٹی جلدی سے ٹھیک ہو جائے۔“

اسکول کا کتنا حرج ہو رہا ہے۔

”ماما! مجھے اسکول نہیں جانا۔“

”صفورہ نے حیرت سے اسے دیکھا۔“ کیوں بیٹا؟“

”مجھے سے پڑھا نہیں جاتا۔“ اب کی بار اس کی آواز بھر گئی تھی، تو صفورہ نے بے ساختہ اسے اپنے بازو کے گھیرے میں لیا تھا۔

”زہرہ میری جان! یہ کیا بات ہوئی، اگر ٹیسٹ اچھا نہیں ہوا تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ اسکول چھوڑ دیا جائے۔“

تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں تھی، تم ٹیسٹ کی

جاری نہیں کر سکتیں، نیچرل کی بات ہے۔“

”نہیں ماما۔۔۔۔۔ یہ نیچرل نہیں۔ میں کچھ نہیں

کر سکتی، نہ مجھے اسکول میں کوئی پسند کرتا ہے اور نہ گھر

میں۔۔۔۔۔ میں شمرہ آئی کی طرح اٹھتی بیٹھتی نہیں،

اسکول میں مجھے شمرہ آئی سے کمپیر کرتے ہیں

اور گھر میں بھی مجھے کوئی پیار نہیں کرتا۔ جب میں

چھوٹی تھی تو آئی کہتی تھیں کہ بابا مجھے اسپتال سے

اٹھا کر لائے ہیں۔ مجھے غصہ آتا تھا۔ میں روئی تھی، مگر

اب مجھے وہ ٹھیک لگتا ہے، کیونکہ سب ان سے پیار

کرتے ہیں۔ بابا نے بھی مجھے پیار نہیں کیا۔ ان کی ہر

بات کا خیال رکھتے ہیں۔ گفت لاتے ہیں اور مجھے۔۔۔۔۔“

وہ کہتے ہوئے رو پڑی اور اس کے یوں

رونے پر صفورہ نے تڑپ کر اسے سینے سے لگا لیا تھا۔

”زہرہ! تم سے کسی نے کہا، تم سے کوئی پیار

نہیں کرتا۔ میں کرتی ہوں، تم مجھے دنیا کی ہر چیز سے

زیادہ عزیز ہو۔“ وہ اب اس کا چہرہ چومنے لگی تھیں۔

”اور شمرہ تو مذاق کرتی ہے اور بابا کی نیچرل ایسی

سبب۔۔۔۔۔ ورنہ وہ بھی تمہیں بہت پیار کرتے ہیں۔ اور تم

سب کچھ کر سکتی ہو، کیونکہ تم شمرہ سے زیادہ لائق ہو۔“

ان کے کہنے پر زہرہ نے بھری ہوئی آنکھوں

سے آنسو دیکھا۔

”میری جان کبھی ایسا نہ کہنا کہ کوئی تمہیں پیار

نہیں کرتا۔ تم میری جان ہو۔“ وہ دونوں ہاتھوں سے

اس کے آنسو صاف کرتے ہوئے بولیں۔

”نہیں آئندہ جو بھی پراہلم ہو، تم مجھے بتاؤ۔“

”ماما! ازال ڈیر پڑ پڑ فور یو!“

”میں تم سے بہت پیار کرتی ہوں زہرہ۔“ وہ ایسے سینے

سے لگائے سرگوشی کے انداز میں بار بار ہراری تھیں۔

☆☆☆

وہ بالوں میں برش کر رہی تھیں۔ لیکن ان کا

دھیان کہیں اور ہی تھا اور وقار گاہے بگاہے ان پر نظر

ڈال رہے تھے۔ آخر ان سے رہا نہ گیا تو وہ بول

پڑے۔

”کیا بات ہے، دیکھ رہا ہوں کل سے پریشان

ہو۔“

”ہاں!“ وہ گہرا سانس لے کر بولیں۔ ”زہرہ

کی وجہ سے وہ بہت حساس ہے اور اسی عادت کی وجہ

سے بہت سی پراہلمز ہو رہی ہیں۔ وہ دن بہ دن

کمپلیکس کا شکار ہو رہی ہے۔“

”کون سی بات ہے، وہ شروع سے ایسی ہے۔“

صفورہ تیزی سے چلیں۔ ”وہ شروع سے ایسی

نہیں، اسے یوں بنانے والے ہم ہیں، جب بچے کو

گھر سے توجہ اور محبت نہ ملے تو وہ کمپلیکسڈ ہو جاتا

ہے۔ کبھی تم نے اس سے پیار سے بات کی جیسے تم

شمرہ سے کرتے ہو، اس کے لاڈ اٹھائے، جیسے تم شمرہ

کے اٹھاتے ہو، تمہارا یہ سلوک دیکھ کر شمرہ بھی اس

سے وہی سلوک کرتی ہے۔ اپنے ہی گھر میں وہ خود کو

غیر محسوس کرتی ہے۔“

وقار نے بے زاری سے انہیں دیکھا۔ ”اب

میں ہر وقت تو اسے ساتھ چکا کر نہیں رکھ سکتا۔“

”اس کی دل جوئی تو کر سکتے ہو؟“

وقار نے ٹی وی آف کر کے ریوٹ رکھ دیا۔

”تم یہ بات کیوں نہیں مان لیتیں صفورہ کہ زہرہ شمرہ

سے بہت مختلف ہے۔ شمرہ ہر لحاظ سے اس سے بہتر

ہے اور زہرہ ہر لحاظ سے پیچھے۔“

”اور تم یہ کیوں نہیں مان لیتے کہ اس کے ذمہ دار ہم ہیں، وہ ہماری سگی بیٹی ہے۔ وقار اسے ہماری توجہ اور محبت کی ضرورت ہے۔“ آخر میں ان کا لہجہ التجائیہ ہو گیا تھا۔

”تو میں نے کب منع کیا ہے تم دو اسے توجہ اور محبت۔ میرے پاس اتنا نام نہیں کہ میں ہر وقت اسے سمجھاؤں پڑھاؤں۔ میٹرک کی اسٹوڈنٹ ہے کوئی ننھی بچی نہیں۔“ یہ کہہ کر وہ لیٹ گئے تھے جس کا مطلب موضوع ختم ہوا اور صفورہ کو ان کی بے بسی دیکھ کر ایک بار پھر اپنے انتخاب پر افسوس ہوا تھا۔

وہ اندر آئی تو سامنے ہی عفر اور زہرہ بیٹھی تھیں۔ زہرہ کے چہرے پر مسکراہٹ تھی جسے دیکھتے ہی ان کی ساری تھکن اڑن چھو ہو گئی تھی۔

”السلام علیکم آئی!“ ان پر نظر پڑتے ہی عفر کھڑی ہو گئی۔
”وعلیکم السلام بیٹا! کیسی“ ہوا وہ اسے پیار کرتی ہوئی ان دونوں کے قریب بیٹھ گئیں۔
”میں ٹھیک ہوں آئی، ممانے زہرہ کے لیے سوپ بنایا تھا۔ سوچا دے بھی آؤں اور اُٹھی آؤں۔“
”اوہ امیری طرف سے اپنی ماما کو بہت شکریہ کہنا۔“ وہ ممنونیت سے بولیں۔
”میں اس سے یہ پوچھ رہی تھی اسکول کب آئے گی؟“

کل سے ان شاء اللہ آئے گی۔“ جو اب صفورہ نے دیا تھا۔

ان کو زہرہ کے گریڈز کی فکر تھی گریڈز اچھے ہوں گے تو اچھے کالج میں داخل ملے گا۔ وہ کسی میل ٹیچر کو گھر نہیں بلانا چاہتی تھیں کیونکہ گھر میں کوئی نہیں ہوتا تھا اور وہ لیٹ آئی تھیں۔

آئی!“ وہ سوچ میں تھیں جب عفر کی آواز پر چونکیں۔

”میں زہرہ سے کہہ رہی تھی۔ ہمارے گھر آ جا یا کرو۔ ہم کہاں اسٹڈی کر لیا کریں گے۔ مجھے جب کچھ میں نہیں آتا میں فخر بھائی یا فاطمہ بھائی

سے سمجھ لیتی ہوں۔“

”اس سے اچھی بات اور کیا ہو سکتی ہے جیسے بے ساختہ خوش ہو کر بولیں۔ وہ اسے سارا سے ان لوگوں کو جانتی تھیں۔ ان کے سر سے جیسے بہت بڑا بوجھ ہٹا تھا۔

☆☆☆

یہ کوئی تیسری دفعہ تھا جب وہ ایک سوال کو پوچھا تھا اور اب کی بار اس کا لہجہ اونچا ہو گیا تھا اور اس نے زہری ریکوئیسٹ کی انکار نہیں کر سکا۔ لیکن ایک کی آنکھوں میں بیانی اٹکھا ہو گیا تھا۔ سامنے کتاب دھندلائی تھی۔ عفر نے چور نظروں سے زہری کا سرخ چہرہ دیکھا۔

”سہاں دماغ نام کی کوئی چیز ہے یا خالی ناراضی جیسا سرے کر گھوم رہی ہو۔ فاطمہ نے چین کی ٹوکی اس کے سر پر ماری تو آنسو گالوں سے پھسلے ہوئے کتاب پر جا کر۔“

”چلو! وہ جی بھر کر بد مزہ ہوا۔“ ایک تو بات پر رونے بیٹھ جاتی ہو۔“

اب کے اس نے سر کا رخ اپنی بہن کی طرف کیا جو خاموشی سے اپنا سوال حل کر رہی تھی۔ آئی نے خود مجھ سے بات نہ کی ہوئی تو میں تمہاری ذمہ داری نہ لیتا۔“

”اور اگر ممانے مجھے مجبور نہ کیا ہوتا تو میں مرکز بھائی یوں آپ کے سامنے نہ بیٹھی ہوتی۔ وہ یہ جہاں صرف دل میں کہہ سکی۔ اسے کچھ عرصہ پہلے اندازہ ہوا تھا کہ وہ اچھی خاصی لائق اسٹوڈنٹ ہے۔ لیکن ماما فخر بھائی نے پڑھانا شروع کیا تھا۔ امتحان نزدیک ہے اور فخر بھائی کو اپنے ضروری کام کی وجہ سے اسلام آباد جانا پڑ گیا تھا تو مجبوراً یہی فاطمہ کو دینی پڑ گئی تھی۔ خود تیرا ان تھی۔ فاطمہ جب بھی کچھ سمجھتا تو اس کے اوپر سے گزر جاتا جبکہ وہی سوال عفر کو سمجھنے آتا۔ اب وہ روئی نہ تو کیا کرئی اوپر سے اسے فاطمہ سخت خوف آتا تھا۔ جب وہ گھر ہوتا تو عفر کے لاکر بلانے پر بھی وہ نہیں جاتی تھی اور اگر اتفاقاً سامنا ہو جاتا تو یوں بھاگتی جیسے کسی بھوت کو دیکھ لیا ہو اور جب

ہی کی جگہ فاطمہ نے سنبھالی تو اس نے اگلے دن جانے بہت آنا کافی کی، لیکن ممانے کوئی رعایت دینے کو نہیں تھیں۔ انہیں ہر حال میں اس کے اچھے مارکس سے تھے۔ سو مجبور اس کو فاطمہ کو چھیلنا پڑا تھا۔

اور کچھ ایسا ہی خیال فاطمہ کا تھا۔ اس نے تو خلاف کہہ دیا تھا کہ وہ زہرہ کو نہیں پڑھا سکتا، لیکن یہ کوئی جتنی دوست ماما اور بابا کے بعد جب صفورہ رات بھر کی جتنی ریونیٹ کی انکار نہیں کر سکا۔ لیکن ایک کی آنکھوں میں بیانی اٹکھا ہو گیا تھا۔ سامنے کتاب دھندلائی تھی۔ عفر نے چور نظروں سے زہری کا سرخ چہرہ دیکھا۔

”سہاں دماغ نام کی کوئی چیز ہے یا خالی ناراضی جیسا سرے کر گھوم رہی ہوئی اندر داخل ہو گئیں۔ زہرہ پر نظر پڑا تو اس نے اس کی طرف بڑھیں۔“

”ایک تو بات پر رونے بیٹھ جاتی ہو۔“
”ایک تو بات پر رونے بیٹھ جاتی ہو۔“
”ایک تو بات پر رونے بیٹھ جاتی ہو۔“
”ایک تو بات پر رونے بیٹھ جاتی ہو۔“

”یہ جو آپ کو بتا رہی ہے۔ کیا مجھے نہیں بتا سکتی تھی۔ یہ کچھ میں نہیں آ رہا، چھر بن کر بیٹھی ہے۔ آپ کو کیا لگتا ہے میرا وقت فالتو ہے، جو میں اس پر ضائع کر رہا ہوں۔“

اس کے غصیلے انداز پر زہرہ ایک دم صائمہ کے ساتھ لگ کر رونے لگی۔ صائمہ کی ملامت بھری نظروں نے فاطمہ کو اور اشتعال دلایا تھا۔

”یہ دیکھ رہی ہیں آپ..... بجائے اپنی غلطی ممانے کے بول رو رہی ہے۔ جیسے میں نے کوئی پہاڑ اس کے سر پر پھینک دیا ہو۔ مجھے تو آپ معاف رہیں اور آئندہ نیچے تم نظر مت آنا۔“

آخر میں اس کے وارن کرنے کا انداز زہرہ سمجھ کر رو گئی تھی۔

”بیٹا تم پریشان مت ہو، کل پر سون فخر آ رہا ہے، وہ پڑھائے گا۔ تم دونوں کو اگر اس کے پاس نام نہ ہوا تو میں ٹیوٹر کا بندوبست کر دوں گی، چلو شاباش۔“ انہوں نے اس کے آنسو صاف کیے اور کھڑی ہو گئیں۔

اگلے دن فخر کے آنے پر اس نے شکر ادا کیا تھا۔ پیپرز کے شروع ہوتے ہی اس نے دن رات ایک کر دیئے لیکن جب پیپرز ختم ہوئے تو اس کی تھکن پر اس کی خوشی حاوی تھی۔ کیونکہ پیپرز اس کی امید سے زیادہ اچھے ہوئے تھے اور اس سے زیادہ خوشی صفورہ کو تھی۔ وہ دل سے عفر کی فیملی کی احسان مند تھیں جنہوں نے ان کی بیٹی کا مستقبل تاریک ہونے نہیں دیا تھا۔

پیپرز کے بعد جب فراغت ملی تو وہ بوریت کا شکار ہونے لگی تھی۔

وہ صبح سے ہی دی دیکھ دیکھ کر پور ہو گئی تھی۔ سب اپنے اپنے کاموں پر تھے زینت آج بھی نہیں آئی تھی آج چچن میں سب کچھ تھا، لیکن انوس اسے کچھ بتانا نہیں آتا تھا۔ وہ بریل پر جام لگا کر وہی کھانے لگی تب ہی فون کی بیل پر اس نے بے زاری سے فون اٹھایا۔

کیا کر رہی ہو؟ دوسری طرف عفر کی چپکتی آواز سنائی دی۔

”کرنا کیا ہے، کبھیاں مار رہی ہوں۔“ اس کی بات سن کر وہ تہقید لگا کر اس پر پڑی۔

”کبھیاں ہی ماری ہیں تو یہاں آ جاؤ، اسٹلے مارتے ہیں۔“

”اوکے..... ماما کو فون کر کے بتا دوں تو آتی ہوں۔“ وہ گیٹ لاک کر کے عفر کے گیٹ کی طرف بڑھی، لیکن گیٹ سے اندر داخل ہوتے ہی اس کے قدم جم گئے، وہاں تو میلہ لگا تھا۔ اس کا دل چاہا فوراً مڑ جائے، لیکن انوس سب کی ہی نظر اس پر پڑ چکی تھی۔ سب سے پہلے عفر اس کی طرف بڑھی تو مجبوراً اسے اندر کی طرف بڑھنا پڑا۔

”تمہارا ہی انتظار کر رہی تھی۔“ وہ اس کے گلے لگتے ہوئے بولی۔
 ”یتنا نہیں سکتی تھیں، تمہاری خالہ آئی ہوئی ہیں۔“ وہ ناراضی سے اس کا چہرہ دیکھ کر بولی۔
 ”کیا فرق پڑتا ہے یہاں وہ ہیں تم نہیں۔“ وہ اس کا ہاتھ تھام کر اسے آگے لے آئی۔ وہ سلام کر کے بیٹھ گئی۔

”بیٹا! چائے ڈالو تمہارے لیے۔“
 ”نہیں! آئی! صائے نے حیران ہو کر اسے دیکھا۔
 ”تمہیں تو چائے بہت پسند ہے۔“
 ”مما! اس نے کھانا نہیں کھایا۔ پہلے کھائے گی، پھر چائے پے گی۔“
 ”کیوں بیٹا، گھر کھانا نہیں کھایا؟ بظاہر بڑی میٹھی زبان میں یہ سوال عفرہ کی خالہ بتول نے کیا تھا۔
 ”نہیں! آئی! آج زینت آئی نہیں آئیں تو کچھ پکا نہیں۔“
 ”تو لو کی تم خود کچھ بنا لیتیں۔“
 ”وہ آئی! اچھے کچھ اتنا خاص بنا نہیں آتا۔“

وہ سر جھکا کر شرمندگی سے بولی۔
 ”خیر نے اشارے سے ماں کو خالہ کو روکنے کو کہا۔
 ”اتنی بڑی ہوئی ہو۔ ابھی تک کچھ بنا نہیں آتا۔ تمہاری ماں نے بھی تمہیں ٹوکا نہیں، خیرہ گھر میں ہوئی کب ہے۔ ورنہ دو من ہے۔ بڑی رہتی ہوگی! لیکن لڑکی تمہیں خود پکھنا چاہیے۔ اب میری طیبہ اور درو کو دیکھو ماشاء اللہ سارے کھانے پکا لیتی ہیں۔ یہ ردو تو تمہارے ہنسی ہے برسا گھر سنبھال لیتی ہے۔“
 ”خالہ! یہ آپ کون سی باتیں لے رہی ہیں۔ ابھی وہ چھوٹی ہے۔ پڑھائی بھی نھت ہے۔ اس دوران کاموں کے لیے وقت نکالنا مشکل ہو جاتا ہے۔“
 ”خیر نے اس کا سر پر پڑتا چہرہ دیکھ کر خالہ کی تقریر کو لگام دینے کی کوشش کی۔
 ”بھئی جو بھی کہہ لو میرا تو خیال ہے لڑکی جتنا بھی پڑھ لے کرنا تو اسے ہانڈی چولہا ہے۔“
 ”خالہ!.....!“

”خیرا یہ چائے کا کپ ڈرا دیتا۔“ صائے خیر کو خبر دینے سے روکا تھا۔
 ”چلو زہرہ اٹھو اندر چلے ہیں۔“ عفرہ ناراضی سے خالہ کو دیکھ کر زہرہ سے کہا تھا۔
 ”آپ کہاں جا رہے ہیں؟“ وہ جھڑپ کرنے کے لیے سر جھکائے چل رہی تھی۔ عفرہ کے کہنے پر بے ساختہ سر اٹھایا۔ سامنے دروازہ فاطمہ کھڑے تھے اس کے چہرے کو دونوں نے چونک کر دیکھا تھا۔ وہ دوبارہ سر جھکا کر آگے نکل گئی اور کچن میں آ کر شیلٹ کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئی۔
 ”ایک یہ رہا جب بھی آئی ہے فاطمہ بھائی سے چپک جاتی ہے۔ لاڈو کی فرمائشیں ختم نہیں ہوتیں۔ اتنی عجیب ہے اور ماما سے بھونٹانے کا سوچے ہوئے ہیں اور بھائی.....“ اس نے افسوس سے سر جھکا کر پھر اس پر نظر پڑتے ہی چونک گئی۔
 ”زہرہ! تمہیں کیا ہوا۔ اور رو کیوں رہی ہو؟“ ایک دم اس کے قریب آئی۔ ”مجھے پتا ہے تمہیں خالہ کی باتیں بری لگی ہیں نا۔“
 ”تب ہی خیر اندر آیا تھا۔ زہرہ نے تیزی سے اپنے آنسو صاف کئے۔ ”مجھے اپنے ہی پتا تھا۔ اندر ہی نہیں دیکھنے کو ملے گا۔“ آئی یا زہرہ! یہ تو ہے خالہ کی عادت کا۔ انور کیا کرو اور جہاں تک کھانا بنانے کی بات ہے تو یہ ایک آرٹ ہے جو سیکھنا اچھی بات ہے۔ عفرہ، ماما سے کچھ نہ کہہ سکتی رہتی ہے۔ ہم بھی ماما کے پاس آ جایا کرو اور چھوٹی چھوٹی باتوں پر دل برا نہیں کرتے لڑ لڑ کر!“ خیر نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا تو وہ مسکرا دی۔ ”اور وہ تم نے سنا نہیں شوہر کے دل میں اترنے کا راستہ معدے سے ہو کر گزرتا ہے۔“ خیر نے شرارتی انداز پر جہاں وہ شرارتی تھی۔ وہیں عفرہ اٹھ کھلا کر بیٹھی تھی۔ وہ باہر نکلا تو فاطمہ کچن کی دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑا تھا۔
 ”بڑے زہیدہ آیا والے مشورے دیے جا رہے تھے۔“
 ”تم کیا یہاں کھڑے میری جاسوسی کر رہے تھے۔“

”بھئی میری نیت تو نہیں تھی! لیکن جس طرح تم کھڑے ہو گئے تو میرا شک کرنا پڑا تھا۔“
 ”کیوں نہیں کرو تمہارا کوئی چکر ہے؟“ فاطمہ نے اس کے قریب ہو کر پوچھا۔
 ”فاطمہ! مجھ سے مار کھاؤ گے۔ وہ بہت چھوٹی ہے۔ عفرہ کی طرح..... بچپن سے آئی ہے، انسیت ہے اس سے اور تم فضول انسان، ہر ایک کو اپنی طرح پر لٹا کر دیکھ لیا کرو۔“
 ”انسیت کیوں ہے؟“ وہ اب بھی باز نہ آیا۔
 ”سر نہ کھاؤ اور جا کر اپنی ہونے والی مگتیر کو برکراؤ۔“
 ”مشورے کا شکر ہے اور آپ کی بھی ہونے والی مگتیر آپ کی آمد کی منتظر ہیں اور آپ کی ہونے والی سانس یعنی ہماری خالہ صاحبہ کو آپ کا یوں اٹھ کر اس چھوٹی لڑکی کے پیچھے چانا ایک آنکھ نہیں بھایا۔“
 ”لہذا کی ناراضی کی تم پر دلا کرو۔ میرا مستقبل میں ایسا کوئی ارادہ نہیں۔“ اب کچھ کوئی سنجیدگی سے بولا۔
 ”کیا مطلب.....!“ فاطمہ نے چونک کر اسے دیکھا۔
 ”کچھ نہیں۔“ وہ کہہ کر باہر نکل گیا۔ جبکہ فاطمہ کتنی دیر وہیں کھڑا ہر سوچ انداز میں اسے دیکھتا رہا۔
 ”آئی کیا بنا رہی ہیں۔“ وہ تیزی سے کچن میں داخل ہوئی۔
 ”بے بی چکن گوشت بنا رہی ہوں! کیونکہ خیرہ اور درو صاحب کو من پسند نہیں۔“ وہ ہنسا بھونٹتے ہوئے بولی۔
 ”آئی! کیا آپ مجھے کھا سکتی ہیں؟“ زینت نے سنے کچھ حیران ہو کر اسے دیکھا۔
 ”بے بی! آپ کو کیا ضرورت ہے، جب میں ہوں۔“
 ”نہیں! آئی! لڑکیوں کو سب کام آئے چاہئیں۔“
 وہ بڑی سمجھ داری سے بولی تو زینت مسکرا دی۔
 ”پھر اس کی رودی روٹیں بن گئی جو گھر میں پتیاؤہ نوٹ بک میں نوٹ کرتی جاتی اور اب وہ خود پکانے لگی۔ آج اس نے یون لیس چکن بنایا تھا اور بڑے اہتمام سے ڈانٹنگ ٹیبل سجایا۔ شرہ کو اندر آتے دیکھ

کر اس نے بے اختیار خوشی سے اسے آواز دی تھی۔
 ”آئی! یہاں آئیں۔“
 ”کیا ہے زہرہ! وہ وہیں کھڑی بے زاری سے بولی۔
 ”آئی! میں نے نئی ڈش بنائی ہے، آپ کھا کر بتائیں کسی نئی ہے۔“
 ”ریش! تمہیں کس نے مشورہ دیا ہے یہ اٹلے سیدھے کام کرنے کا، جب زینت آئی ہیں اور مجھے نہیں کھانا۔ یہ عجیب و غریب کھانا۔ اب کے اس نے قریب آ کر ڈش میں بچے یون لیس چکن کو دیکھ کر کہا۔
 ”زینت آئی میرے لیے ایک دو سیٹھ وچ تیار کر کے میرے کمرے میں دے جائیں۔“
 زہرہ نے ہونٹ چبا کر آنکھوں میں آئے آنسوؤں کو روکا۔ پاس کھڑی زینت کو بے اختیار اس پر ترس آیا جو صبح سے پکان ہو رہی تھی۔
 ”آئی! کیا یہ اچھا نہیں بنا۔“ وہ بڑی بے چارگی سے پوچھ رہی تھی۔
 ”نہیں بیٹا! میں نے پکھا تھا۔ بہت مزے کا تھا۔ مجھے تو یہ بنانا بھی نہیں آتا۔ میں تو حیران ہوں بے بی نے یہ ڈش کہاں سے سیکھی۔“ انہوں نے اس کا دل خوش کرنے کی کوشش کی، لیکن جب اپنے دل دکھا دیں تو غیروں کی باتیں مرہم کا کام نہیں کر سکتیں۔
 ”آئی! کھانا اٹھالیں۔“ وہ بڑی دل گرفتگی سے بولی۔
 ”بے بی! تم تو کچھ کھالو صبح سے کچھ نہیں کھایا۔“
 ”نہیں! آئی! مجھے بھوک نہیں۔“ زینت نے بڑے افسوس سے اسے جاتے دیکھا۔
 وہ لاؤنج میں چپکی بیٹھی کدو فون بج اٹھا، آنے والا فون عفرہ کا تھا۔
 ”ہائے!“ اس کی ہیلو کے جواب میں عفرہ کی چپکتی آواز سنائی دی۔
 ”کیسا بنا، پھر آج کھانا؟“
 ”جائیں۔“ اس کے پوچھنے پر وہ روٹی آواز میں بولی۔

”کیوں..... کیا ہوا؟“

”میں صبح سے بیمار ہی ہوں، لیکن کسی نے چکھا تک نہیں۔“

”او.....“ عفر ا کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔
”اچھا تو اس میں اداس ہونے والی کیا بات ہے۔ میں ہوں نا۔ میں نے ابھی کھانا نہیں کھایا، ڈونگا اٹھاؤ اور سیدھی میری طرف آ جاؤ۔“

”میں آرہی ہوں۔“ وہ ایک دم خوش ہو کر بولی۔
”زینت آنی! میں عفر ا کی طرف جارہی ہوں۔“ وہ ڈونگا اٹھا کر جاتے ہوئے بولی۔ زینت نے مسکرا کر اسے جاتے ہوئے دیکھا۔ لیکن لاؤنج میں داخل ہوتے ہی اس کے قدم سست پڑ گئے۔ وہاں عفر ا کی خالہ اپنی دو عدد بیٹیوں کے ساتھ موجود تھیں۔

”آؤ بیٹا! ارک کیوں گئیں؟“ عفر ا کے پاپا کے کہنے پر اس نے جھک کر ڈونگا ٹیبل پر رکھا اور خود سائیز والے ٹیبل پر بجرم کی طرح بیٹھ گئی۔ سب تھوڑا تھوڑا چکن پلیٹ میں ڈال رہے تھے اور اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔

”واہ بھی زہرہ! کمال کر دیا تم نے، بیٹا بہت مزے کا بنایا ہے۔“ اس نے جھکے سے نظریں اٹھا کر سفیان ا نکلی کو دیکھا۔

”واقعی زہرہ بہت اچھا بنا ہے۔“ صائمہ آنٹی نے بھی اسے داد دی تھی۔

”بڑی اچھی خوشبو آ رہی ہے۔“ تب ہی باہر سے بولنا خواضر اور اس کے پیچھے فاطمہ اندر داخل ہوا تھا۔

”زہرہ چکن بنا کر لائی ہے۔“

”اچھا بھی، پھر تو ضرور کھانا چاہیے۔“ فخر کے کہنے پر اس کی خالہ، صبا اور والد نے ایک دم اسے دیکھا تھا، جبکہ فاطمہ دی لگا کر بیٹھ گیا، جہاں فٹ بال بیچ آ رہا تھا۔

”تم بھی لونا فاطمہ؟“ فخر نے کھاتے ہوئے اسے دیکھا۔

”مجھے بھوک نہیں۔“

”پر ابھی تو تم مجھے کہہ رہے تھے بڑی بھوک لگی

ہے۔“ فخر کے کہنے پر زہرہ کی غیر ارادی نظر فاطمہ کی طرف اٹھی تھی اور اسی وقت اس نے بھی اس کی طرف دیکھا تھا۔ صرف ایک لمبے لگا تنا زہرہ نے نظریں جھکا کر نہیں لیکن اگلا لمحہ حیران کن تھا۔ فاطمہ اٹھ کر ٹیبل پر آیا، وہ اب پلیٹ میں چکن نکال رہا تھا۔ زہرہ کی گھبراہٹ میں مزید اضافہ ہو گیا۔ اسے افسوس ہوا تھا، اس نے اس کی طرف دیکھا ہی کیوں اور اگر وہ دیکھتا تو وہ اس کی نظروں کا ٹکڑو کیسے پڑھ گیا اور اگر پڑھتا تو دور کیوں کیا۔ وہ اپنی سوچوں میں اتنی گم تھی کہ عفر ا کے گھٹنا بلانے پر چونک کر سیدھی ہوئی۔

”پاپا بلا رہے ہیں۔“
”جی انگل!“ وہ ایک دم ندوب ہو کر کھڑی ہو گئی۔
”یہ تمہارا انعام۔“ انہوں نے والٹ سے ہزار کا نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔
”نہیں انگل!“ وہ بوکھلا کر دو قدم پیچھے ہٹی۔
”انعام کو منیع نہیں کرتے بیٹا اور پھر اتنا اچھا کھانا بنانے پر انعام تو بیٹا ہے۔ عفر ا کو بھی ایسے ہی دیتا ہوں اور تم میرے لیے بالکل عفر ا کی طرح ہو۔“ لاؤنج سے باہر نکلتے ہی کب سے رکے اس کے آنسو ہا ہر آ گئے، پیچھے آنی عفر ا ایک دم حیران رہ گئی۔
”کیا ہوا زہرہ! کیا پاپا کی کوئی بات تمہیں بری لگی۔“
”نہیں عفر ا! تم نہیں جانتیں، یہ ایک نوٹ میرے لیے کتنا قیمتی ہے۔ یہاں مارکسی نے مجھے سراہا ہے۔“ کہتے ہوئے اس کی آواز بھرا گئی تھی۔

عفر ا نے اسے ساتھ لگا لیا۔ تم بالکل پاگل ہو زہرہ! اتنا چھوٹا سا تمہارا دل ہے میں تمہاری دوست بنیں سب کچھ ہوں۔ میرے سب گھر والے تم سے بہت چار کرتے ہیں، تم بھی جانتی ہو۔“ اس نے الگ ہو کر پوچھا تو وہ مسکرا کر سیدھی ہوئی تو نظر نیچے کھڑے فاطمہ پر پڑی تو وہ تیزی سے اللہ حافظ مٹی ہوئی باہر نکل گئی۔

☆☆☆

”زینت! یہ کس نے بنایا؟“ پاپا چکن کے ساتھ رکھی ڈش میں موجود بون لیس چکن دیکھ کر

انہوں نے حیران ہو کر پوچھا، کیونکہ وہ جانتی تھیں۔ زینت ایسے کھانے نہیں بنا سکتی۔
”بے بی نے بنایا ہے اور یہ سلاو دیکھیں، کتنا پیارا ہے اور یہ سلاو کتنا کھائیں، کتنے مزے کا ہے۔“
”واقعی!“ وہ تو حیرت کے مارے کچھ بول ہی نہیں سکیں۔

”پر برا ہوا، آج اتنی خوشی سے بچی ٹیبل تیار کر کے بیٹھی تھی، زینتہ نے کھانا، بلکہ جھڑک دیا اور وہ دم کو وقار بھائی نے بھی منع کر دیا۔ بچی کا دل برا ہو گیا۔ وہ تو بھلا ہوسا منے والوں کا۔ عفر ا نے بلایا۔ وہاں سے آئی تو خوش تھی۔“

عفورہ کا مسکراتا چہرہ شجیدہ ہو گیا۔ ”آپ زہرہ کو بلالائیں۔“ کہہ کر انہوں نے ڈیسر سارا چکن اپنی پلیٹ میں ڈالا۔

”آپ نے بلایا ماما؟“

”جی میری جان، یہ سب میری گزریا نے بنایا ہے۔“ انہوں نے اس کا بازو پکڑ کر اسے اپنے سامنے کیا۔

”جی ماما!“ وہ شجیدگی سے بولی۔
”اتنا مزے کا، مجھے تو یقین نہیں آ رہا، بلکہ اتنی خوشی ہو رہی ہے، بتا نہیں سکتی۔“ انہوں نے نوالہ منہ میں لیتے ہوئے ہنستا ہوا۔ اب کی بار زہرہ کے چہرے کے تاثرات مختلف تھے۔
”آپ کو اچھا لگا ماما!“

”بہت اچھا میری جان۔“ ان کے کہنے پر وہ ان کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گئی۔

”تم نے خود میٹ نہیں کیا۔“
”نہیں۔“ وہ منہ بنا کر بولی۔

”تم نے اپنا کسی نے بھی میرا کھانا ٹیسٹ نہیں کیا۔“
”تو کیا ہوا، ماما تو کھادی ہیں نا۔“ عفورہ نے نوالہ بنا کر اس کے منہ میں ڈالا۔ اب وہ ایک نوالہ اپنے اور دوسرا اس کے منہ میں ڈال رہی تھیں۔ اور وہ عفورہ کو سارے دن کی روٹلا سنا رہی تھی اور وہ مسکراتے ہوئے اسے سن رہی تھیں۔

”میرے بچے کو یہ شوق پیدا کیسے ہوا؟“
انہوں نے کھانا اس وقت ختم کیا جب انہیں یقین ہو گیا کہ زہرہ کا پیٹ پھر چکا ہے۔

”ماما میں فخری تھی نا اور عفر ا کو کوٹنگ کا شوق ہے تو اس کے ساتھ میں بھی سیکھنے لگی اور۔“ پھر وہ بات کرتے کرتے رک گئی، تو عفورہ چونکیں۔

”اور کیا بیٹا؟“ انہوں نے نرمی سے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ بھیرا۔

”عفر ا کی خالہ بہت عجیب ہیں، جب انہیں بتا چلا کہ مجھے کھانا بنانا نہیں آتا تو انہوں نے آپ کے حلق بہت فصول باتیں کیں۔ مجھے بالکل اچھی نہیں لگیں۔“

عفورہ نے نہیں پوچھا، وہ کیا باتیں تھیں۔
”ہوں“ انہوں نے ہنکرا کر بھرا۔ ”زینت میرے لیے چائے لے آتا۔“ وہ اسے بازو کے گھیرے میں لے کر لاؤنج میں آ گئیں۔

”ماما آج انگل سفیان نے مجھے ایک ہزار روپے دیے انعام، یہ دیکھیں۔“ وہ اب بھی ایک ہزار کا نوٹ جیب میں رکھے بیٹھی تھی۔

عفورہ نے غور سے اس کے چہرے کی خوشی دیکھی۔ ”ماما! پاپا نے بھی یوں مجھے پیار نہیں کیا اور نہ ہی گفت دیا۔“ یہ کہتے ہوئے اس کا چہرہ اداس ہو گیا تھا۔
”زہرہ بیٹا! میں نے اس دن بھی آپ سے کہا تھا۔ ماما! میں نا، آپ کو کچھ بھی چاہیے۔ ماما سے کہو۔ آپ کی ہر بات میں پوری کردی۔“

وہ اس کا سر چومتے ہوئے بولیں۔ انہیں وقار پر غصہ آ رہا تھا۔ ایک انسان اپنی ہی اولاد میں اتنا فرق کیسے کر سکتا ہے۔

”تمہیں کچھ چاہیے زہرہ، تمہارا رزلٹ آؤٹ ہونے والا ہے اور مجھے یقین ہے رزلٹ بہت اچھا ہوگا، میں نے تمہارے لیے گفت سوچا ہے، لیکن اب گفت تمہاری مرضی کا ہوگا۔“

”رنگی ماما!“ اس کی آنکھیں چپکنے لگیں اور اگر وہ مہنگا ہوتا تو۔“
”تو بھی۔“ وہ مسکرا کر بولیں۔ وہ جلدی سے

لیپ ٹاپ لے آئی۔ وہ اب انہیں اسکرین دکھا رہی تھی۔ جہاں ایک خوب صورت اور نفیس پینٹرٹ بنا تھا جس کے آخر میں ایک مولی لنگ رہا تھا۔

”ماما! مجھے یہ بہت پسند ہے۔“

”تو میری بیٹی کو یہ ہی ملے گا۔“

”ماما!“ وہ پہلے حیران ہوئی اور پھر ایک دم ان کے گلے لگ گئی۔

☆☆☆

اس کا رزلٹ آؤٹ ہوا، جو اس کی امید سے بھی زیادہ اچھا تھا۔ اس کے نمبر عفرائے بھی زیادہ تھے، لیکن عفرائے خود سے زیادہ اس کی کامیابی پر خوش تھی۔ اب بے صبری سے شام کا انتظار تھا۔ جب ماما آئیں، لیکن وہ اس کی توقع کے برعکس اس کے فون کے آدھے گھنٹے بعد ہی گھر میں تھیں۔ آتے ہی انہوں نے گلے لگا کر اسے بے تحاشا پیار کیا تھا، لیکن اسے سب سے زیادہ خوشی تب ہوئی جب وقار نے بھی اسے گلے لگا کر پیار کیا۔ پاس کھڑی ٹرہ کو محبت کا یہ مظاہرہ کچھ بھایا نہیں تھا۔

”کیا ہو گیا ہے پاپا! آپ لوگ تو ایسے خوش ہو رہے ہیں، جیسے اس نے پورے پنجاب میں ناپ کیا ہو۔ ٹاپ تو ہر سال میں کرتی ہوں، پر ماما کا ایسا جوش میری دفعہ تو دیکھنے کو نہیں ملتا۔“

”بھئی تم تو میری پرس ہوں، پر زہرہ نے بھی اسے گریڈ لے کر کمال کر دیا ہے۔ زینت! وہ مٹھائی لاؤ جو میں خاص اپنی بیٹی کی پسند کی لانی ہوں۔“

”جی ہاں! ابھی لائی۔“ زینت نور امڑی تھی۔

”دیکھو تمہارا گفت بھی آ گیا ہے۔“ صفورہ کے کہنے پر مگرانی ہوئی ان کی طرف بڑھی۔

”اوہ بونی مل ماما! یہ تو بالکل ویسا ہے۔“ اس نے ہاتھ سے مولی کو چھوا۔

”دکھاؤ۔“ اس کا اشتیاق دیکھ کر ٹرہ بھی اٹھی۔

”ماما! آپ نے بھی مجھے تو ایسا گفت نہیں دیا۔“ اس نے پینڈو کو دیکھنے کے بعد عجیبہ نظروں سے ماما کو دیکھا۔

”تم نے اپنی کامیابی پر جو مانگا، میں نے وہ دیا۔ اب جو زہرہ نے مانگا وہ اسے ملے گا۔“

حسد کے مارے ٹرہ کا چہرہ سخت ہو گیا تھا۔ لیکن یہ اب مجھے پسند آ گیا ہے۔ یہ میں لوں گی۔ آپ زہرہ کو اس کے بدلے کچھ اور دے دیں۔“

وہ ایک دم ڈبا بند کرتے ہوئے بولی اور پینڈو پر بھی زہرہ کی نظریں ایک پل کو ساکت ہوئیں۔ اس نے ماں کی طرف دیکھا، جو ابھی ہوئی نظروں سے ٹرہ کو دیکھ رہی تھیں۔

”اگر یہ کوئی مذاق ہے ٹرہ تو بہت فضول ہے۔“

”میں سیریس ہوں۔“

”یہ مجھے وہ ٹرہ!“ اب کے صفورہ سختی سے بولیں۔

”پاپا! ماما سے کہیں نا، زہرہ کو دوسرا لا دیں۔ مجھے یہ بہت اچھا لگے۔“ ہمیشہ کی طرح وہ زہرہ کی خوشی میں بھٹک ڈال چکی تھی۔ زہرہ بالکل ساکت اپنی جگہ پر کھڑی تھی۔

”بالکل نہیں۔ یہ زہرہ کا ہے۔“ انہوں نے اس کے ہاتھ سے ڈبا لیتا چاہا تو اس نے بازو پیچھے کی طرف موڑ لیا۔

”پاپا!“ ٹرہ روہا سی ہو کر وقار سے لگ گئی۔

”چھوڑو صفورہ! اسے پسند آیا ہے تو اسے دے دو۔“ انہوں نے ٹرہ کو بازوؤں کے گھیرے میں لیتے ہوئے کہا۔

”نہیں، تم بھی حد کرتے ہو وقار جو جس کا ہے اس کو ہی ملنا چاہیے، کیا بھی زہرہ نے ٹرہ کی چیز کے لیے یوں ضد کی ہے۔ وہ بھی کسی چیز کی ڈیمانڈ کرتی ہے اور تب ہی اس کو وہ چیز پسند آ جاتی ہے۔ لیکن اب نہیں۔“ انہوں نے زبردستی وہ ڈبا اس کے ہاتھ سے چھینا۔

”مجھے پتا ہے۔ آپ کو زہرہ سے محبت ہے، کبھی کبھی تو مجھے لگتا ہے آپ میری سوتیلی ماں ہیں، اگر پاپا کا پیار نہ ہوتا تو میں بھی آپ کے ساتھ نہ رہتی۔ کہنے کے ساتھ اس نے نیپل پر پڑی کرشل کی کئی نفیس چیزیں کوٹوڑ ڈالا تھا۔

”ٹرہ! حد میں رہو۔“ اب کے صفورہ حلق کے بل چلائیں۔

”ٹرہ!“ وقار نے بھی سختی سے اس کا نام کیا۔ زہرہ تو جیسے ساکت ہو کر رہ گئی تھی۔ مٹھائی کی پلیٹ تھا سے زینت بھی حیران پریشان تھی۔

”تم میری بہن نہیں دکن ہو۔ تم ہو کیا، ڈر پوک کا پیکس۔“ جس سے کوئی پیار نہیں کرتا۔

”وہ آگے بھی کچھ کہنا چاہتی تھی، لیکن صفورہ کا پیٹنر اسے جب کروا گیا تھا۔ اس نے حیرت سے ماں کو دیکھا، جس کا چہرہ غصے کے مارے سرخ ہو گیا تھا۔

”صفورہ!“ اب کی بار وقار غصے میں آگے بڑھے۔

”تمہاری ہمت کیسے ہوئی، میری بیٹی کو ہاتھ لگانے کی، کیا غلط کہا اس نے کیا زہرہ کا ٹرہ سے کوئی مقابلہ ہے؟ میری بیٹی اس قافلے ہے، سب اسے پسند کرتے ہیں۔ اسے کسی کی ضرورت نہیں، چلو ٹرہ!“ وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر باہر نکل گئے۔ صفورہ وہیں سر تمام کر بیٹھ گئی تھیں۔

ٹرہ نے بھوک ہڑتال کر دی تھی، لیکن صفورہ نے کوئی پروا نہیں کی اور رات کو صفورہ اور وقار کے درمیان ایک بڑا جھگڑا ہوا تھا، جس کی وجہ یقیناً وہ ہی تھی، ان کے لڑنے کی آوازیں اس کے کمرے تک صاف آرہی تھیں اور وہ ساری رات اس نے روتے ہوئے گزار دی تھی۔ صبح صفورہ کے بینگ جاتے ہی وہ ٹرہ کے کمرے میں آ گئی۔ وہ کوئی سووی دیکھ رہی تھی۔ اسے دیکھ کر اس نے منہ موڑ لیا۔

”آہی! یہ میں آپ کے لیے لائی ہوں۔ یہ آپ کا ہے۔“

”مجھے کوئی ضرورت نہیں، تم رکھو اپنی بھیک اپنے پاس۔“

”آہی! پلیز سواری اور یہ رکھ لیں۔“ وہ اس کی منت کر رہی تھی۔

اور کچھ آنا کافی کرنے کے بعد اس نے بہت احسان کرتے ہوئے وہ پیڈیٹ کھ لیا تھا اور جب صفورہ کو پتا چلا تو انہوں نے غصے سے اسے ہی ڈانٹ

☆☆☆

دیا۔ وہ سر جھکا کر سختی سے کہتی رہی۔ انہیں اس پر بے تحاشا ترس آیا تھا۔ انہوں نے اسے گلے لگا لیا۔

کالج میں ایڈمیشن سے پہلے صفورہ نے اسے ویسا لاکٹ ہوا دیا تھا، لیکن وہ اب بھی ٹرہ سے باز رہی تھیں، مگر اسے اس بات کی کوئی پروا نہیں تھی۔ ٹرہ اور پاپا چاہتے تھے وہ ٹرہ کے کالج میں ایڈمیشن لے، لیکن اس نے انکار کر دیا، کیونکہ اب وہ خود کو سمجھتا چاہتی تھی۔ منوانا چاہتی تھی، وہ اور عفرائے ہی کالج میں تھے تو کالج لائف بہت اچھی گزر رہی تھی۔

اس دن فرسٹ ایئر کے فائل پیپر کی رول نمبر سلب لینے جانا تھا۔ وہ جوں ہی تیار ہو کر گیٹ سے باہر نکلی۔ باہر کھڑے فاطمہ کو دیکھ کر اس کے قدم وہیں رک سے گئے تھے۔ کل تک تو اسے یہ ہی پتا تھا۔ فخر بھائی انہیں لے کر جانے والے تھے۔

”زہرہ!“ اسے بت بنا دیکھ کر عفرائے کو اسے آواز دینی پڑی تھی۔ تو مجبوراً وہ من من کے قدم اٹھائی گاڑی کی طرف بڑھنے لگی۔

سفر کے دوران وہ بالکل خاموش تھی۔ جیکے عفرائے مسلسل فاطمہ کے ساتھ باتوں میں مصروف تھی۔ کالج آتے ہی کب سے رکا ہوا سانس اس نے بحال کیا تھا۔

”تمہیں کیا ہوا، اتنا مت کیوں سو جا ہوا ہے؟“

”فخر بھائی کیوں نہیں آئے۔“ عفرائے کے سوال کے جواب میں اس نے تیزی سے پوچھا۔

”تو تم اس لیے چپ چپیں؟“ عفرائے پہلے حیران ہوئی اور پھر سوس سے سر ہلایا۔

”انتا پیڈم اور پیارا میرا بھائی ہے، تمہیں آخر براہیم کیا ہے ان سے۔“

”پیڈم اور پیارے بڑے تمہارے لیے ہوں گے۔ میرے لیے تو وہ خوف ناک سے جن ہیں، جن کی بڑی بڑی آنکھوں سے ہر وقت انگارے اور منہ سے لاد لکٹا رہتا ہے۔“ وہ کالوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولی۔

”اب ایسا بھی کچھ نہیں، بس تھوڑے سے غصے والے ہیں۔“

”ہاں بس تھوڑے سے ہی۔“ زہرہ منہ میڑھا کر کے بولی۔ جب وہ دونوں باہر آئیں تو وہ ان کے انتظار میں ہی کھڑا تھا۔
 ”کتنی دیر لگا دی۔ بتا یا تو تھا مجھے اپنے کام سے بھی نکلتا ہے۔“ وہ اسے انکڑ کر کے عفرائے گہرا ہاتھا۔
 ”سوری بھائی ارش ہی بہت تھا اور آپ نے جس آدمی کا حوالہ دیا تھا وہ ملائی نہیں۔“ وہ اب بھی پیچھے خاموشی سے ان دونوں بہن بھائی کی باتیں سن رہی تھی۔

”بھائی بہت بھوک لگی ہے۔“ وہ جتنی جلدی اس سفر سے نجات چاہتی تھی، عفرائے گھر سے اتنے بڑھتے جا رہے تھے، فاطمہ نے کچھ کے بغیر گاڑی ایک برگر کارنر پر روکی۔ وہ تین برگر اور کوک کا آرڈر دے کر واپس آگیا، جبکہ وہ غصے سے عفرائے گھر سے تھی۔
 لڑکا تین پلیٹ لے کر آیا۔ فاطمہ نے ایک عفرائے کو کھائی، دوسری اپنی گود میں رکھی اور تیسری پیچھے کی طرف گھمائی، جب کہ وہ بولیں ہی بتائی تھی رہی۔
 ”اب پکڑو گی بھی یا نہیں۔“ وہ سرگھا کر اسے گھورتے ہوئے بولا۔

”مجھے بھوک نہیں۔“ وہ منمناتی ہوئی آواز میں بولی۔
 ”تو پہلے بولنا تھا۔ حرام کے پیسے نہیں ہیں میرے کھانا ہے تو کھاؤ، ورنہ باہر پھینک دو۔“
 اس نے تیزی سے پلیٹ اس کے ہاتھ سے لے لی، مبادا وہ اس کے سر پر ہی نہ چھوڑ دے۔
 ویسے بھی اسے شروع سے ہی اس کا سر بہت پسند تھا۔ کوئی بھی چیز مارنے کے لیے چاہے وہ پھنر ہو، بین ہو یا انگلی، وہ چھوٹے چھوٹے نوالے کیے لگی۔

مشکل سے اس نے آدھا برگر کھایا ہوگا اور وہ خود بہن، بھائی فارغ بھی ہو گئے تھے۔ فاطمہ نے ہارن دے کر اس لڑکے کو بل لانے کو کہا۔ جب وہ پلیٹ واپس کر رہے تھے، اس نے ڈر کے مارے پوری کی پوری کوک اسے تھادی۔ فاطمہ نے تھر تھری نظروں سے اسے گھورا۔ جو بادہ گھبرا کر سر جھکا گئی۔

یونیورسٹی میں آج سارا دن تھکا دینے والا تھا۔ اس کا ارادہ بھی تان کے سونے کا تھا، لیکن لاؤنچ کا دروازہ کھولتے ہی شرہ کی چپتی چٹکھاتی آواز نے اس کا استقبال کیا تھا۔ اس نے تختی سے آنکھیں میچ کر انہیں کھولا اور گہرا سانس لے کر اندر داخل ہوئی۔
 ”جو اولاد اپنے ماں، باپ کا کہنا نہیں مانتی، ان کے تجربے کو جھٹلاتی ہے، وہ ہمیشہ ذلیل و خوار ہی ہوتی ہے۔“ صفورہ نے غصیل نظر میں شرہ کے چہرے پر جھانکتے ہوئے کہا۔

”اوپلیز..... بچپن سے یہ ڈائلاگ سنتی آرہی ہوں، مجھے ان باتوں سے کوئی فرق نہیں پڑتا، میں صرف یہ جانتی ہوں، زندگی میری ہے، اسے کس طرح گزارنا ہے، یہ حق صرف میرا ہے۔“
 ”اگر ایسا ہے تو تجھ سے کیوں بات کر رہی ہو۔ جو تمہارا دل کرتا ہے کرو۔“

”تو آپ کا مطلب ہے آپ عدیل کی فیملی سے نہیں ملیں گی۔“
 ”بالکل ٹھیک سمجھی ہو تم۔“ شرہ کتنی دیر غصے اور بے بسی سے صفورہ کا چہرہ دیکھتی رہی۔

”بہت بچھتا میں گی آپ۔“ اس کا انداز دھمکی لے ہوئے تھا۔ دروازے میں کھڑی زہرہ نے گھبرا کر صفورہ کا چہرہ دیکھا، لیکن ان کا چہرہ بالکل ساٹ تھا۔

وہ کتنی دیر وہیں کھڑی رہی، یہاں تک کہ صفورہ اور شرہ دونوں اپنے کمروں میں چلے گئے تھے۔

☆☆☆

صبح اس کی آنکھ عفرائے فون سے کھلتی تھی۔ آج ان کی یونیورسٹی میں کنکشن تھا اور وہ اسے تیار ہونے کا کہہ رہی تھی۔ کل گھر میں جو بے مزگی ہوئی تھی اس کے بعد اس کا دل بہت خراب تھا۔ وہ اٹھ کر نیچے آگئی۔ اس کا ارادہ عفرائے کو منع کرنے کا تھا۔

”تم تیار نہیں ہو میں۔“ اسے یوں آتا دیکھ کر صفورہ نے پوچھا۔

”ماما میرا دل نہیں چاہ رہا، سوچ رہی ہوں عفرائے

کو منع کروں۔“
 ”کیوں منع کرنا ہے یہ تمہارا یونیورسٹی میں آخری سال ہے۔ یہ دن دوبارہ بھی لوٹ کر واپس نہیں آتے، جتنا ہو سکے اسے انجوائے کرو اور مجھے یہ بھی پتا ہے تم کیوں منع کر رہی ہو، تم جس کی وجہ سے اپنا دل خراب کر رہی ہو، اس کی تو جوتی کو بھی پروا نہیں۔ سو اس کے لیے تمہیں اپنا دن خراب کرنے کی ضرورت نہیں۔ چلو جاؤ شاہاش، اچھی طرح تیار ہو کر آؤ۔ صفورہ کے چکارنے پر وہ گہرا سانس لے کر کھڑی ہو گئی۔

جب وہ تیار ہو کر نیچے اتری صفورہ، زینت کے ساتھ بات کر رہی تھیں، ان دونوں کی نظریں بے اختیار اس کی طرف اٹھیں اور پھر جیسے اس کے چہرے پر رک گئیں۔

”بھائی یہ ہماری بے بی ہے۔“ زینت نے شرارتی انداز میں اسے دیکھا۔

”ہاں زینت یہ خوب صورت لڑکی ہماری زہرہ ہی ہے۔“ صفورہ کے چار کرنے پر وہ جھینپ کر سر جھکا گئی تھی۔ وہ پنک فرائک اور پاجامے میں کھلے بالوں اور ہلکے میک اپ کے ساتھ داخلی بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔ وہ تیز تیز چلتی عفرائے کیٹ کی طرف بڑھی اور لاؤنچ میں داخل ہوتے ہی اس نے بلند آواز میں سلام کیا تھا۔

”ارے واہ..... کیا بات ہے زہرہ آج تو بہت پیاری لگ رہی ہو۔“ ٹی وی دیکھتی صائمہ نے بھی ستائشی انداز میں اسے دیکھا تھا۔

آنٹی عفرائے تیار ہے۔“ ہلکی سی مسکراہٹ کے بعد اس نے عفرائے کا پوچھا تھا۔

”جاؤ بیٹا، دیکھ لو اپنے کمرے میں ہے۔“ وہ تیزی سے عفرائے کے کمرے کی طرف بڑھی۔

”ارے زہرہ۔“

”اوپلیز عفرائے، اب تم کچھ مت کہنا، جلدی کرو، میں دیر ہو رہی ہے۔“ کہنے کے ساتھ وہ آئینے کے سامنے جا کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے غور سے اپنا چہرہ دیکھا۔ ”ہلکی سی لب اسٹک، آئی لائنز اور مسکارے

کے علاوہ کوئی شے اس کے منہ پر نہیں تھی، پھر سب کو وہ خوب صورت کیوں لگ رہی تھی۔
 ”میں منہ دھونے جا رہی ہوں۔“ آخر کار اس نے حتمی فیصلہ کیا۔

”بکومت پہلے ہی کوئی میک اپ نہیں کیا اور یہ سے جو دو تین لائٹیں کھینچی ہیں انہیں بھی دھونے جا رہی ہو تم یونیورسٹی کنکشن میں جا رہی ہو، کسی کے انسوس پر نہیں۔“ عفرائے اپنی جمل والی سینڈل کے اسٹریپ بند کرتے ہوئے بولی۔

”اور یہ لوتھوڑی لب اسٹک ڈارک کر اور یہ پرفیوم بھی چھڑک لو ماسی بول۔“ یہ کہہ کر وہ خود واش روم میں گھس گئی۔ زہرہ نے ایک دفعہ لب اسٹک کو دیکھا اور پھر سرٹلی میں ہلکا کر واپس رکھ دی۔ ابھی اس نے پرفیوم کا ڈھکن کھولا ہی تھا کہ پیچھے سے دروازہ کھلنے کی آواز آئی تھی۔ اس نے تیزی سے آئینے میں دیکھا اور اس میں جو عکس نظر آیا وہ حقیقت تھا یا الوژن..... بہر حال اس کے ہاتھ سے پرفیوم کی بوتل چھٹ کر ماربل کے فرش پر گر کے چٹنا چور ہو گئی۔

”کیا ہوں۔“ آواز پر گھبرائی ہوئی عفرابا رنگی۔
 ٹوٹی ہوئی بوتل سے ہوتی ہوئی نظریں سبک ت کھڑی زہرہ پر گئیں۔ جس کی آنکھیں یوں کھلی تھیں جیسے کوئی بھوتہ دیکھ لیا ہو۔ فاطمہ ہکا بھکا راگنار داخل ہو۔

”سوری مجھے پتا نہیں تھا تمہارے علاوہ بھی کمرے میں کوئی اور ہے۔“ وہ عفرائے کے گہرا ہاتھا۔
 ”اس لو کے بھائی، یہ زہرہ ہے، غیر لوتھوڑی ہے اور تم زہرا دے ایسے کیوں گھور رہی ہو، پچھانا نہیں، یہ فاطمہ بھائی ہیں۔“ عفرائے کہنے پر اس نے تھوک نکل کر نظریں جھکا لیں۔

”پچھانا نہ ہوتا تو یہ حال نہ ہوتا۔“ فاطمہ نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔

”یہ ابھی بھی ویسی ہی ہے، حواس بانست، جبکہ تم تو بڑی لڑکی نہیں کر رہی تھیں، زہرہ ایسی ہو گئی ہے، ویسی ہو گئی ہے، میں سمجھا پتا نہیں ان چار سالوں میں میرے پیچھے کون سا انقلاب آگیا ہے۔ یہ

چہرے پر مسکراہٹ لے آئیں، لیکن اگلے ہی پل ان پر غصے سے گھورتی نظریں حاوی ہو جاتیں، اسے صبح کا انتظار تھا، جب وہ عفرائے سب شیر نہ کرتی۔

☆☆☆

وہ بچن میں داخل ہوئی تو فاطمہ پہلے سے موجود تھا۔ اس نے کچھ حیران ہو کر گھڑی کی طرف دیکھا، جہاں صبح کے ساتھ نچ رہے تھے۔
”السلام علیکم بھائی۔“
”علیکم السلام۔“

”آج آپ اتنی جلدی اٹھ گئے۔“

”ہاں آنکھ جلدی کھل گئی۔“ وہ جواب دے کر دوبارہ چائے پینے لگا۔ عفرائے بنجور اپنے بھائی کا چہرہ دیکھا اور پانی کا گلاس لے کر اس کے سامنے کر سی پر بیٹھ گئی۔

”آپ کچھ پریشان ہیں بھائی۔“ فاطمہ نے نظریں اٹھا کر عفرائے کو دیکھا اور کپ ٹیبل پر رکھ دیا۔
”پریشان تو نہیں، پر کچھ سوچ رہا ہوں۔“ عفرائے نے ابرو اچکائے۔

”اگر آپ مناسب سمجھیں تو مجھ سے اپنا مسئلہ شیئر کر سکتے ہیں۔“ اب کی بار فاطمہ مسکرا دیا تھا۔
”ویسے میرا مسئلہ حل بھی تم ہی کر سکتی ہو۔“
”اچھا۔“ اب کی بار عفرائے کچھ پرجوش ہو کر آگے کو بٹھکی۔

”تمہیں اپنی سہیلی کیسی لگتی ہے۔“
”زہرہ کی بات کر رہے ہیں۔“ وہ کچھ الجھ کر پوچھنے لگی۔

”ظاہری بات ہے، ایک ہی تو تمہاری سہیلی ہے۔“
”بھائی آپ کو پتا تو ہے، میری اگر کوئی بہن ہوتی تو بالکل زہرہ جیسی ہوتی۔“

”اتنی اچھی ہے کہ تم اسے دوست بہن کے علاوہ کوئی درجہ دے سکو۔“ اس نے کچھ الجھ کر فاطمہ کو دیکھا۔
”میں بھی نہیں بھائی۔“

”اگر وہ تمہاری بھابھی بن جائے تو؟“
”آپ کا مطلب ہے فخر بھائی۔“ وہ غوشی سے

بولی۔ فاطمہ نے ماتھے پر ہل ڈال کر اسے دیکھا۔
”بات میں کر رہا ہوں یا فخر؟“
”آپ بھائی؟“ اب کی بار عفرائے حیرت کی شدت سے اتنا ہی کہہ سکی۔

”کیوں، مجھے کیا ہوا ہے؟“ اس کی اتنی حیرانی فاطمہ کو ایک آنکھ نہیں بھائی تھی۔
”لیکن بھائی اب کو تو زہرہ بالکل پسند نہیں تھی۔“
”یہ تم سے کس نے کہا؟“ وہ زہرہ لب مسکراتے ہوئے پوچھنے لگا۔

”یہ کوئی کہنے والی بات ہے آپ کا اپنی بیوہ بتاتا ہے ہمارے گھر میں صرف آپ ہیں جو اس سے روڈ ہیں اور آپ کو دیکھ کر تو اس کی جان نکل جاتی ہے۔“ فاطمہ کی مسکراہٹ گہری ہو گئی تھی۔
”سو چواس کو ڈرانے میں کتنا حرا آئے گا۔“

”بھائی۔“ وہ ہرمانتے ہوئے بولی۔ ”میری دوست اس قابل ہے کہ اس سے پیار کیا جائے نہ کہ اسے ڈرایا جائے۔“
”اچھا۔“ وہ ابرو اچکا کر بولا۔

”یہ بتائیں آپ نے ماما، پاپا یا بھائی سے بات کی؟“
”نہیں۔۔۔۔۔۔ پہلے تم سے کر رہا ہوں۔“

”لیکن بھائی، ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی، آپ کو تو وہ بالکل پسند نہیں تھی، تو یہ اچانک بات شادی تک کیسے پہنچ گئی۔“ وہ ابھی تک وہیں اٹکی تھی۔
”میں نے بھی کہا، وہ مجھے پسند نہیں۔“ وہ الزنا اسی سے سوال کرنے لگا۔

”ہاں یہ اور بات ہے کہ اچانک بات شادی تک پہنچ گئی، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں شروع سے اس پر نظر رکھے بیٹھا تھا۔“

”اب آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں۔“ اس نے مسکرا کر فاطمہ کو دیکھا۔
”اپنی دوست کی مرضی پوچھو۔“ وہ کپ خالی کر چکا تھا۔

”مرضی پوچھنے کی کیا ضرورت ہے، میں کہوں

جی تو وہ نہ تھوڑی کرے گی۔“ فاطمہ نے انہوس سے سر ہلایا۔
”بات یہاں تم سے شادی کرنے کی نہیں، مجھ سے شادی کرنے کی ہو رہی ہے، ہو سکتا ہے وہ کسی اور کو پسند کرتی ہو۔“ عفرائے سر بے ساختہ نیچی میں ہلا۔
”میں بچپن سے جانتی ہوں اسے اور دھوے سے کہہ سکتی ہوں وہ پسند وسند سے بہت دور ہے، وہ تو لوگوں سے دس فٹ کے فاصلے پر ہی راستہ بدل لیتی ہے۔“ عفرائے کے لہجے میں یقین ہی یقین تھا۔

”ہاں۔۔۔۔۔۔ وہ آپ سے ڈرتی ضرور ہے، لیکن میں اسے ٹکس کر لوں گی، کیونکہ اب مجھے لگ رہا ہے آپ کے ساتھ اس کے علاوہ کوئی اور اچھا ہی نہیں لگ سکتا، پتا نہیں یہ خیال مجھے کیوں نہیں آیا۔“ آخر میں وہ اپنے سر پر ہاتھ مار کر بولی۔

”نہیں بیٹا عقل عقل کی بات ہے۔“ فاطمہ اسے چراتے ہوئے کھڑا ہو گیا۔
”اب میں سونے جا رہا ہوں۔“ وہ اٹھڑائی لیتے ہوئے بولا۔

”اور میرا کام جلدی ہو جانا چاہیے۔“
”بڑی جلدی ہے، ابھی تو فخر بھائی کا نمبر پہلے ہے۔“
”تم میرا تو کام کرو، اس کا جب دل چاہے گا کرے لگا۔“

”اچھا بھائی کتنے بے صبر ہے ہو رہے ہیں، آج ہی چلی جاؤں گی۔“ اس کی ایک ہی رٹ سے چڑ کر وہ منہ پھلا کر بولی تو وہ مسکراتا ہوا بچن سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

دروازہ کھلنے پر اس نے کھل ہٹا کر دیکھا اور عفرائے کو دیکھ کر وہ جھٹ سے اٹھ بیٹھی تھی۔ ”خیریت تم اتنی صبح؟“

”گھڑی دیکھو محترمہ صبح کے گیارہ بج رہے ہیں اور میں تو صبح سات بجے ہی آنا چاہ رہی تھی، بڑی مشکل سے اس وقت تک خود کو روک رہا ہے۔“

”کیوں کیا ہوا، سب ٹھیک ہے۔“ پہلے وہ جھجکی اور پھر مختصر نظروں سے عفرائے کا چہرہ دیکھنے لگی۔

یقیناً فاطمہ نے عفرائے کو سب بتا دیا ہوگا۔
”تم بڑی کھلی نکلیں ہو، اتنا کچھ ہو گیا اور تم نے مجھے خبر تک نہیں ہونے دی۔“ وہی ہوا جس کا اسے ڈر تھا۔
”یقیناً کرو عفرائے اس میں میرا کوئی قصور نہیں، مجھے تو پتا ہی نہیں وہ پچھلے ایک سال سے مجھے قائل کر رہا ہے اور یوں اچانک مجھے پر پوز کر دے گا۔“
”نہیں۔“ عفرائے حیران ہوئی۔ ”بھائی نے کل تمہیں پر پوز بھی کر دیا، یہ تو انہوں نے مجھے بتایا ہی نہیں۔“

”تم کس کی بات کر رہی ہو۔“ زہرہ نے حیران ہو کر پوچھا۔

”فاطمہ بھائی کی اور کس کی۔“

”پاگل ہو گئی ہو، فاطمہ بھائی سچ میں کہاں سے آ گئے؟ میں تو زہرہ ہیبت اصغر کی بات کر رہی ہوں۔“

”کیا۔“ اب کی بار فاطمہ کی باری عفرائے کی تھی۔

”یہ زہرہ ہیبت اصغر سچ میں کہاں سے آ گیا اور اس نے تمہیں کب پر پوز کیا؟“ زہرہ نے ایک لمحہ رک کر سوچا اور پھر کل جو ہوا تھا سب عفرائے کو بتا دیا۔

”ہوں تب ہی میں سوچوں بھائی کو کیا ہوا ہے۔“

اس کی سرگوشی پر زہرہ کے کان کھڑے ہو گئے تھے۔
”کیا کہا فاطمہ بھائی نے۔“

”انہوں نے کہا تم سے پوچھ کر آؤں، وہ تم سے شادی کرنا چاہتے ہیں، تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں۔“ اس کی بات سن کر زہرہ کو ایک دم سست سا ہو گیا تھا۔ اس سے زیادہ انہوں نے بات اس کی بائیس سالہ زندگی میں کبھی نہیں ہوئی تھی۔

”فاطمہ بھائی۔۔۔۔۔۔ نہیں۔“ زہرہ کا سر نیچی میں ہلا۔
”کیا نہیں؟“ عفرائے نے پوری آنکھیں کھول کر اسے دیکھا۔

”تم میرے بھائی کو نہ کر رہی ہو، اس زہرہ ہیبت اصغر کے لیے، مطلب مجھے ہی اس بات کا۔“
”عفرائے پلیز۔“ وہ بے بسی سے بولی۔

”کیا پلیز؟ تم میرے سامنے میرے بھائی کو رنجیت کر رہی ہو۔“

”عفرائے میں نے نہ کہا؟“ اس کا غصیلہ انداز

دیکھ کر وہ بے ساختہ بولی۔
 ”یعنی تم بھی بھائی کو پسند کرتی ہو۔“
 ”اب میں نے ایسا بھی کچھ نہیں کہا۔ اب کے وہ نظریں چرا کر بولی۔
 ”اور ایسا کہنا بھی مت، ورنہ تم مجھے کھو دو گی۔“
 ”عفرا۔“ زہرہ نے ساختہ بولی تھی۔ اس کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا تھا، جسے دیکھ کر عفرا کھلکھلا کر ہنس پڑی تھی۔
 ”مجھے پتا ہے، تم مجھ سے بہت پیار کرتی ہو۔“
 ”لیکن عفرا فاطر بھائی مجھ سے وہ کیوں ایسا کہہ رہے ہیں، تم جانتی ہو کہ وہ میرے ساتھ کیسے ہیں۔“
 ”ضروری نہیں جو دکھائی دے وہی سچ ہو پسند کرنے کے لیے ایک لمحہ کافی ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے وہ کچھ ان کی زندگی میں آ گیا ہو، تم خوش نہیں، ہم اسے کھڑے ہیں گے۔“
 ”ہم تو اسے کھڑے نہیں گے، لیکن فاطر بھائی۔“
 اس کی سولی دین لگی تھی۔

”یاد رہے کہ ہم کرنا چھوڑ دو اور آئی سے پوچھو، پھر مجھے فون پر بتا دو، میں ماما اور پاپا کے ساتھ پہنچ جاؤں گی، وہاں کا جوڑا لے کر۔“ کہنے کے ساتھ عفرا نے اسے گلے لگا لیا۔ زہرہ کے ہونٹوں پر آنے والی مسکراہٹ بے ساختہ تھی، لیکن اگلے ہی لمحے اس کی مسکراہٹ سبک ہو گئی تھی۔

”عفرا! وہ ذہیب وہ بھی اپنے چہرے کو لے کر آج یا کل آ جائے گا۔“
 ”تم منع کر دو گی تو وہ کیسے آئے گا۔“ زہرہ کچھ بولنے لگی تھی، لیکن پھر کچھ سوچ کر خاموش ہو گئی۔ عفرا کے جانے کے بعد وہ کئی دیر ابھی بیٹھی رہی۔ فاطر اس سے شادی کرنا چاہتا ہے، یہ بہت حیران کن تھا۔
 ”تو کیا وہ اس لیے اتنے غصے میں تھا کہ اس نے ذہیب کو سب کہتے سن لیا تھا، تو کیا وہ اسے پسند کرتا ہے، لیکن کب سے اسے تو بہت سوچنے پر بھی کچھ ایسا یاد نہیں آ رہا جو خاص ہو۔ کتنے ہی سوال اس کے گرد گھوم رہے تھے، جس کا جواب فاطر ہی دے سکتا تھا۔ وہ عفرا سے بات کرنے کے لیے اس کے

کمرے کی طرف بڑھ رہی تھی، جب اندر ٹھہرے کمرے سے زور زور سے چیخنے کی آواز آنے لگی۔ وہ بے ساختہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی۔
 ”لیس آئی، آپ کی بیٹی لاڈلی جس کی مثالیں دیتے، آپ نہیں مانتی تھیں۔ مجھ پر تو آپ نے ہمیشہ شک کیا، اس کے بارے میں آپ کیا کہیں گی، اپنے کانوں سے سن کر آرہی ہوں۔ عفرا، فاطر کے پیغام، بلکہ ہمیں محبت کے پیغام پہنچائی ہے۔ بتائیں کب سے ان کی لوانا سوری چل رہی تھی۔ تب ہی تو یہ بھائی بھائی وہاں جاتی ہے۔ ایک بات سن لیں، ماما اگر زہرہ کی شادی فاطر کے ساتھ ہوئی تو میں ہمیشہ کے لیے یہ گھر چھوڑ دوں گی، اگر مجھے میری پسند نہیں مل سکتی تو میں کسی اور کو بھی خوش نہیں رہنے دوں گی۔“
 ”بس چپ کر جاؤ زہرہ۔“ عفرا دونوں کانوں پر ہاتھ رکھ کر چلائی تھیں۔
 ”تم بتاؤ زہرہ، کیا شہرہ ٹھیک کہہ رہی ہے؟“
 زہرہ نے ڈرتے ڈرتے ماں کا چہرہ دیکھا، جن کی آنکھیں بے حد سرخ ہو رہی تھیں۔
 ”ماما ایسی کوئی بات نہیں۔“
 ”جھوٹ مت بولو، کیا عفرا نے تم سے نہیں کہا کہ فاطر تم سے شادی کرنا چاہتا ہے اور تم نے بھی منع نہیں کیا۔“
 ”تو اس کا کیا مطلب ہے۔“
 ”زہرہ بولو کچھ۔“ عفرا بچ کر بولیں۔
 ”ماما۔۔۔۔۔۔ اب کے وہ رو پڑی تھی۔
 ”میرا یقین کر لیں میرا کوئی جکڑ نہیں۔“
 ”اگر کوئی بات نہیں تو عفرا نے تم سے ہی کیوں بات کی، وہ ماما، پاپا سے بھی کہہ سکتی تھی۔“ شہرہ پوری طرح اسے اس گھبر چکی تھی اور وہ اتنی لیڈوڑ ہو گئی تھی کہ اپنے حق میں کچھ کہہ ہی نہیں پا رہی تھی۔
 دروازے پر دستک ہوئی اور ساتھ ہی زہرہ اندر داخل ہو گئی تھی۔
 ”ماما جی باہر کچھ مہمان آئے ہیں۔“
 ”کون ہے۔“ اس وقت وہ جو کوئی تھا عفرا کو

اس کی مداخلت گراں گزری تھی۔
 ”وہ بے نی کا پوچھ رہے تھے۔“ زہرہ نے چونک کر زہرہ کو دیکھا، جبکہ شہرہ کے چہرے پر طنز یہ مسکراہٹ آئی تھی۔
 ”لیس آپ کی لاڈلی کا ایک اور رشتہ آ گیا، اسے کہتے ہیں، چچی، رتم۔“ اور وہاں ڈرامٹک روم میں ذہیب کے ساتھ اس کے پیرس کو دیکھ کر زہرہ کو چکر آ گئے تھے۔ ایک ہی دن میں اتنے مسئلے اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ ان لوگوں نے بڑی چابوت سے زہرہ کا رشتہ مانگا تھا، جبکہ عفرا بڑی سہولت سے ان سے ٹھوڑا وقت مانگا تھا۔ لیکن ان کے جاتے ہی عفرا کا باری ایکشن زہرہ کے لیے بہت عجیب تھا۔
 ”کم از کم زہرہ تم سے مجھے یہ امید نہیں تھی، کیا بولی ورتی جانا اس وجہ سے تھا اور عفرا کے گھر بار بار جانا فاطر کی وجہ سے تم جاتی ہو آج تمہاری وجہ سے میں خود کو کتنا بے بس محسوس کر رہی ہوں، کیا میں نے تمہاری ایسی تربیت کی تھی۔“
 ”ماما پلیز! ایسے مت بولیں میں نے آپ کی تربیت پر کبھی کوئی حرف نہیں آنے دیا، نہ تو میں نے فاطر بھائی کے بارے میں ایسا سوچا تھا اور نہ ذہیب کے بارے میں، میں تو خود ان دونوں پر پوزٹر رجیمان ہوں۔“
 ”تم یہ بات سن لو زہرہ پہلے شادی شہرہ کی ہوگی، پھر تمہاری۔“
 ”ماما۔“ وہ بے بسی سے بولی تو انہوں نے ہاتھ اٹھا کر اسے بولنے سے روک دیا۔
 ”جہاں اتنا کچھ تم کہتی ہو، وہاں یہ بھی بتا دو ان دونوں میں سے کس کو ہاں کہتی ہے۔“ زہرہ نے سر جھکا دیا۔
 ”جس کو آپ کا دل کرتا ہے ماما مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“ اس نے پہلے بھی کبھی بحث نہیں کی تھی، اب بھی وہ ہار کر بولی۔
 ”ماما آپ پلیز کول ڈاؤن ہو جائیں، انسان سے غلطی ہو جاتی ہے، اس بے چاری سے بھی

اس کی مداخلت گراں گزری تھی۔
 ”وہ بے نی کا پوچھ رہے تھے۔“ زہرہ نے چونک کر زہرہ کو دیکھا، جبکہ شہرہ کے چہرے پر طنز یہ مسکراہٹ آئی تھی۔
 ”لیس آپ کی لاڈلی کا ایک اور رشتہ آ گیا، اسے کہتے ہیں، چچی، رتم۔“ اور وہاں ڈرامٹک روم میں ذہیب کے ساتھ اس کے پیرس کو دیکھ کر زہرہ کو چکر آ گئے تھے۔ ایک ہی دن میں اتنے مسئلے اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ ان لوگوں نے بڑی چابوت سے زہرہ کا رشتہ مانگا تھا، جبکہ عفرا بڑی سہولت سے ان سے ٹھوڑا وقت مانگا تھا۔ لیکن ان کے جاتے ہی عفرا کا باری ایکشن زہرہ کے لیے بہت عجیب تھا۔
 ”کم از کم زہرہ تم سے مجھے یہ امید نہیں تھی، کیا بولی ورتی جانا اس وجہ سے تھا اور عفرا کے گھر بار بار جانا فاطر کی وجہ سے تم جاتی ہو آج تمہاری وجہ سے میں خود کو کتنا بے بس محسوس کر رہی ہوں، کیا میں نے تمہاری ایسی تربیت کی تھی۔“
 ”ماما پلیز! ایسے مت بولیں میں نے آپ کی تربیت پر کبھی کوئی حرف نہیں آنے دیا، نہ تو میں نے فاطر بھائی کے بارے میں ایسا سوچا تھا اور نہ ذہیب کے بارے میں، میں تو خود ان دونوں پر پوزٹر رجیمان ہوں۔“
 ”تم یہ بات سن لو زہرہ پہلے شادی شہرہ کی ہوگی، پھر تمہاری۔“
 ”ماما۔“ وہ بے بسی سے بولی تو انہوں نے ہاتھ اٹھا کر اسے بولنے سے روک دیا۔
 ”جہاں اتنا کچھ تم کہتی ہو، وہاں یہ بھی بتا دو ان دونوں میں سے کس کو ہاں کہتی ہے۔“ زہرہ نے سر جھکا دیا۔
 ”جس کو آپ کا دل کرتا ہے ماما مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“ اس نے پہلے بھی کبھی بحث نہیں کی تھی، اب بھی وہ ہار کر بولی۔
 ”ماما آپ پلیز کول ڈاؤن ہو جائیں، انسان سے غلطی ہو جاتی ہے، اس بے چاری سے بھی

ہو گئی۔“ اس نے بڑی خاموش نظر شہرہ پر ڈالی جو صفورہ کا ہاتھ پکڑ کر اسے دلاسا دے رہی تھی۔ وہ اسی خاموشی سے وہاں سے ہٹ گئی تھی۔ وہ کتنی دیر تک اس کے پیچھے بغیر سامنے دیوار کو دیکھتی رہی۔ وہ رو رہی تھی۔
 بچپن سے لے کر اب تک اس نے ہمیشہ کوشش کی تھی، اس کی وجہ سے کبھی کسی کو تکلیف نہ ہو، خاص طور پر اس کی ماں کو، اس نے ہمیشہ عام لڑکیوں سے ہٹ کر خود کو رکھا۔ اپنے ارد گرد ہمیشہ اونچی دیوار بنا کر رکھی، جس کو کوئی پار نہ کر سکے، لیکن آج اس کی غلطی نہ ہوتے ہوئے بھی وہ قصور وار نظر آئی تھی۔ دروازہ کھلنے پر اس نے آس بھری نظریں اٹھائی تھیں، لیکن دروازے میں کھڑی شہرہ کو دیکھ کر مایوس ہو کر واپس جھکا لی۔
 ”مجھے پتا تھا، تم یوں ہی بیٹھی رو رہی ہو گی۔“
 وہ کہتے ہوئے اس کے ساتھ بیٹھ گئی۔
 ”کی ہو۔۔۔۔۔۔ دو دو پرو پوزر تمہارے انتظار میں بیٹھے ہیں۔“ زہرہ کچھ کہے بغیر یوں ہی سر جھکائے بیٹھی رہی۔

”ماما بے چاری کو آج بہت افسوس ہوا تم پر، بڑی مایوس بیٹھی تھیں۔ میں نے انہیں کہہ دیا کہ تمہاری کسی میں الزوائسٹ نہیں ہے۔ وہ کسی کو بھی اپنی پسند سے ہاں کہہ سکتی ہیں۔ انہوں نے فاطر کا نام لیا تھا، وہ کہہ کر رگ گئی، جبکہ زہرہ اس کے اگلے جملے کی منتظر تھی۔
 ”لیکن میں نے منع کر دیا، کیونکہ مجھے پتا ہے، تم اسے پسند نہیں کرتیں۔“ زہرہ نے اب کی بار نظریں اٹھا کر شہرہ کا چہرہ دیکھا، وہ اسے ہی دیکھ رہی تھی۔
 ”میں نے ٹھیک کیا نا۔ وہ اب ذہیب کی فانی کو ہاں کر دیں گی، پھر تمہاری منگی ہوگی، مزہ آئے گا۔“ شہرہ نے کہہ کر خود ہی اپنی بات کا مزہ لیا، وہ جو اٹھ کر سامنے دیوار کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی تھی، دوبارہ اس کے پاس آئی۔
 ”لیکن زہرہ تم عفرا کو نہ کیسے کر دو گی۔“ اس کے پاس اب بھی خاموشی تھی۔
 ”کچھ پوچھا ہے تم سے۔“ اب کے شہرہ کے تاثرات ایک دم سخت ہوئے تھے۔

”ماما خود ہی اسے منع کر دیں گی۔“ مجبوراً زہرہ کو جواب دینا پڑا تھا۔

”ماما نہیں، تم منع کر دو گی جاکر، وہ بھی فاطر کے منہ پر۔“

”آئی۔“ وہ دھک سے بہن کا چہرہ دیکھنے لگی۔

”کیوں..... تمہیں دکھ ہوگا..... نہیں تمہارا واقعی اس کے ساتھ چکر تو نہیں تھا۔“

”خدا کے لیے آئی چپ کر جائیں۔“ وہ ضبط کرتے کرتے بھی رو پڑی تھی۔

”اگر چکر نہیں تھا تو پھر رو کیوں رہی ہو، تمہیں تو خوش ہونا چاہیے، میں نے تمہاری جان چھڑوا دی۔“

”آپ نے مجھے ماما کی نظروں میں گرا دیا، اب عفر اور فاطر بھائی کی نظروں میں بھی گرانا چاہتی ہیں۔“

”میں صرف یہ چاہتی ہوں، تم جاکر فاطر سے کہو کہ تم اسے سخت ناپسند کرتی ہو اور اس کو راضی کرو کہ وہ مجھ سے شادی کر لے۔“ زہرہ کو اپنی بہن کی ذاتی حالت پر شک گزرا تھا۔

”آپ کو پتا ہے، آپ کیا کہہ رہی ہیں۔“

”مجھے پتا ہے، میں کیا کہہ رہی ہوں اور تم فاطر سے کہو کہ وہ مجھ سے شادی کرے اور تمہیں اس سے کوئی فرق نہیں پڑنا چاہیے، کیونکہ زہیب بھی کسی سے کم نہیں، دوسرا وہ نہیں پسند کرتا ہے۔“

”میں ایسا کچھ نہیں کروں گی آئی۔“ اب کے وہ آنسو صاف کرتی ہوئی غصے میں بولی۔

”اچھا.....“ زہرہ کا انداز چیلنج کرتا ہوا تھا کہہ کر وہ ہاتھ روم میں گھس گئی۔ واپسی میں اس کے ہاتھ میں تیزاب کی بوتل تھی۔

”یہ دیکھ رہی ہو، یہ کیا ہے ایسڈ۔“ زہرہ نے بوتل کا ڈھکن کھول کر آگے کیا اور زہرہ بے اختیار پانچ قدم پیچھے ہٹی تھی۔ زہرہ سے کچھ بعید نہیں تھا۔ وہ بڑی اس کی طرف اچھال دیتی۔

”آئی پلیز..... کیا کر رہی ہیں، اسے بند کریں۔“ وہ دہشت زدہ ہو کر چلائی اور اسے اپنی طرف بڑھتا دیکھ کر وہ دروازے کی طرف دوڑی۔

تھی۔ اس سے پہلے وہ بینڈل گھماتی، شرہ اس کا بازو دبوچ چکی تھی۔

”آئی چھوڑیں مجھے۔“ وہ بے ساختہ چلائی تھی۔

”پہلے تم بتاؤ تم اسے منع کر دو گی نا۔“

”ہاں آئی میں منع کر دوں گی۔“ وہ بازو چھڑاتے ہوئے بولی۔

”اور تم اسے مناؤ گی بھی کہ وہ مجھ سے شادی کرے۔“ اب کی بازو زہرہ کچھ بول نہیں سکی، تو شرہ نے بوتل کو پھر ہوا میں لہرا۔

”آئی..... میں کروں گی پلیز اس بوتل کو بند کر دیں۔“ شرہ کے چہرے پر بڑی گہری مسکراہٹ آئی تھی۔

”کھاؤ میری قسم۔“

”آئی آپ کی قسم۔“ وہ روتے ہوئے بولی تو شرہ نے اس کا بازو چھوڑ دیا۔ وہ سکتی ہوئی دیوار سے جا لگی۔ شرہ ہستے ہوئے باہر نکل گئی تھی، جبکہ زہرہ کے رونے کی رفتار میں اضافہ ہو گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

زندگی میں پہلی بار تھا جب وہ اتنا سوچے ہوئے عفر کے گھر کی طرف بڑھ رہی تھی۔ گیٹ سے داخل ہوتے ہی اس نے گہرا سانس لے کر آنسوؤں کو نینے کی کوشش کی تھی۔ اسے فاطر سے بات کرنی تھی، لیکن کیسے یہ وہ نہیں جانتی تھی۔ اس سے پہلے وہ لاؤنج میں داخل ہوئی وہ اسے باہر آتا دکھائی دیا اور اس کے قریب آ کر رک گیا۔ اس کی نظریں اس کی آنکھوں پر پڑیں جو سوچی ہوئی تھیں۔

”مجھے آپ سے بات کرنی ہے۔“

”اچھا.....“ وہ حیران ہوا۔

”یقیناً کوئی خاص بات ہوگی جو تمہیں کرنے کے لیے خود آنا پڑا۔“ وہ زہرہ پر مسکراتے ہوئے بولا۔

”میرا ایک پریوینڈل آیا ہے گھر میں، سب کو پسند ہے، اسے ہفتے ماما نے انہیں ایجنٹ کے لیے بلایا ہے۔“ یہ کہہ کر وہ کئی دیر اس کے جوتوں کو دیکھتی رہی، لیکن جب خاموشی طویل ہونے لگی تو اسے سر

اٹھا پڑا۔ وہ اس کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا، بلکہ لان میں گئے پھولوں کو دیکھ رہا تھا۔

”میں بہت عام سی لڑکی ہوں، جو آپ جیسے شخص کے بالکل قائل نہیں، آپ کے لیے آپ جیسی لڑکی ہونی چاہیے، ہر لحاظ سے فریکٹ آپ ان سے شادی کر کے بہت خوش رہیں گے۔“ اتنا سب بولنے کے لیے جتنی ہمت اس کو درکار تھی، یہ صرف وہی جانتی تھی، لیکن متبادل کھڑا شخص کوئی روئل ہی نہیں ہے رہا تھا۔ اسے برا بھلا کہے، کہہ دے کہ وہ واقعی اس لائق نہیں کہ اس سے شادی کی جائے۔

”اپنے گھر والوں میں تم بھی شامل ہو۔“ فاطر کی طرف سے سوال آیا تھا۔ وہ خاموش رہی تھی۔

”کچھ پوچھا ہے میں نے۔“ اب کہ وہ اتنی زور سے بولا کہ وہ اپنی جگہ پر ٹپ سی گئی، اس کی ساری ہمت ڈگمگائی تھی۔ اس کا سر اثبات میں ہلاتھا۔

”یہ وہی ہے نا جو تم سے اظہار محبت کر رہا تھا۔“ وہ وہ قدم کا فاصلہ طے کر کے بالکل اس کے مقابل آ کر کھڑا ہو گیا۔ زہرہ بے ساختہ پیچھے ہٹی تھی۔

”آپ آئی سے شادی کریں۔“ وہ اب ہنسکتی ہوئی آواز میں بولی۔

”اپنا مشورہ اپنے پاس رکھو تم کون ہوتی ہو یہ فیصلہ کرنے والی کہ مجھے کیا کرنا چاہیے یا کیا نہیں۔“ وہ کہہ کر تیزی سے باہر کی طرف بڑھا۔

”بات سنیں فاطر بھائی پلیز آئی ہے۔“ وہ جو اس کے پیچھے بھاگی تھی، اس کے ایک دم رکنے سے بری طرح اس سے ٹکرائی تھی کہ درد کی شدت سے وہ بے ساختہ اپنا ماتھا سہلانے لگی۔

”آج تو تم نے مجھ سے یہ بات کر لی، آئندہ میں تمہارے منہ سے اپنا نام بھی نہیں سننا چاہتا اور آج کے بعد میرے سامنے مت آنا، ورنہ بہت برا ہوگا۔“ وہ چلا گیا تھا اور خود اس کا ضبط ختم ہو گیا تھا۔ اس نے روتے ہوئے مڑ کر دیکھا۔ لاؤنج کے دروازے میں عفر اکھڑی تھی۔ اس کی دوست اس کی ہم راز، وہ تو اس کی تکلیف سمجھ گئی تھی، یہ بھی تصور

کر کے وہ اس کی طرف بڑھی، لیکن تین قدم کے فاصلے پر اس کے پیروں کو جیسے زمین نے جکڑ لیا تھا۔ عفر اندر چلی گئی تھی اور اپنے پیچھے اس نے زور سے دروازہ بند کیا تھا اور وہ بند دروازہ اسے کسی پھٹری طرح اپنے وجود پر لگتا محسوس ہوا تھا۔

”تم نے فاطر سے بات کی تھی۔“ رات کو جب وہ اپنے کمرے میں آئی تو شرہ بھی اس کے پیچھے آئی تھی۔ وہ ایک دم گھبرا کر کھڑی ہوئی اور سہم کر شرہ کو دیکھا، جس کی نظریں اس کے چہرے کا جائزہ لے رہی تھیں۔

”جی۔“

”تو کیا کہا اس نے۔“ شرہ ایک دم تیزی سے اس کے قریب آئی۔ وہ..... وہ..... وہ ہکا بکا بولی۔

”وہ کہہ رہے تھے وہ سوچ کر جواب دیں گے۔“ اس نے شرہ کے چہرے کو سخت ہوتے دیکھا تھا۔ زہرہ نے تھوکر ٹھک کر اپنے حلق کو تر کیا۔

”لیکن آئی..... میں نے فاطر بھائی سے کہا آپ بہت خوب صورت ہیں، بالکل ان کی ہی طرح فریکٹ ہیں، آپ دونوں ایک ساتھ اچھے لگیں گے۔“ وہ روانی کے ساتھ بولی تھی تو شرہ کے کہنے تاثرات معمول پر آئے۔

”ہوں۔“ وہ مسکرائی۔

☆☆☆

”عفر! پلیز رکو..... صرف ایک بار میری بات سن لو۔“ آج ایک ہفتہ ہو گیا تھا اسے عفر کے پیچھے بھاگنے ہوئے۔

”عفر! اب کے اس نے تقریباً بھاگتے ہوئے اس کا بازو تھام لیا تھا۔

”پلیز! میری بات سن لو۔“ اب کے زہرہ آنکھوں میں آنسو لیے نئی انداز میں بولی۔

”ابھی بھی کچھ سننے کو باقی رہ گیا ہے، تم نے جو میرے بھائی کو سنایا وہ کافی نہیں تھا۔“

”میں نے ایسا کچھ نہیں کہا۔“

”کچھ تو اللہ کا خوف کھاؤ زہرہ، میں نے خود اپنے کانوں سے سنا جو تم نے کہا۔ میں نے تمہارے

یارے میں کیا دعوے کیے تھے اور تم نے کیا کیا، اگر تمہیں زوہیب ہی پسند تھا تو مجھے اس وقت کہہ دیتیں، اتنا قاشا بنوانے کی کیا ضرورت تھی، شکر ہے میں نے مہما، پایا سے کوئی بات نہیں کی۔

”پلیز عفراتم تو مجھ سے ناراض نہ ہو، میں مجبور ہوں۔“ اس کے آنسو گالوں پر بہہ رہے تھے، عفرات نے بے ساختہ نظر چرائی تھی۔

”کیا مجبوری ہے، کیا تم مجھے بتانا پسند کرو گی۔“ اب کے عفرانے پورا رخ اس کی طرف موڑا تو وہ سر جھکا کر رہ گئی، عفرانے ہنکارا بھرا۔

”کچھ ہوگا تو کہو گی نا۔ بہت ہی افسوس کی بات ہے، زہرہ بہت افسوس کی۔“ اس کی ساری باتیں زہرہ نے کل سے اپنی سنی کی تھیں۔

”کل میری مٹنی ہے، تم آؤ گی نا۔“ زہرہ نے اس کا ہاتھ تھام کے کہا، عفرات کو تو جیسے کسی نے سوئی چھو دی تھی۔

”تمہیں شرم نہیں آ رہی زہرہ۔“ عفرات کا سارا چہرہ لال ہو گیا تھا۔

”عفرات تمہارے سوا کوئی میرے قریب نہیں آتا۔ یہ بات بھول کیوں نہیں جانتیں، ہم پہلے جیسے نہیں ہو سکتے؟“

”نہیں بالکل نہیں۔“ عفرانے غصے سے اس کا ہاتھ جھٹکا تھا۔

”بہت فرق آ گیا ہے، صرف دو دن بھاری اشعارہ سالہ دوستی پر بھاری ہیں۔ میرے بھائی نے زندگی میں پہلی بار کسی لڑکی کا نام لیا تھا۔ میرا وہ بھائی جو مجھے بے حد پیارا ہے اور جو اس قابل ہے کہ ہر لڑکی اس جیسے شریک حیات کی تمنا کرتی ہے، تم نے اسے رنجیکٹ کیا، اس زوہیب کے لیے وہ میرے بھائی کے پاسنگ بھی نہیں، ایک بات یاد رکھنا زہرہ، ہمارا دل دکھا کر تم خوش نہیں رہو گی۔“

”عفرات۔“ زہرہ تڑپ کر بولی، لیکن وہ تیز تیز چلتی اس کی نظروں سے اوجھل ہوئی تھی۔

”ماشاء اللہ میری بیٹی تو بہت خوب صورت

لگ رہی ہے، کسی کی نظر نہ لگے۔“ صفورہ نے اس کا ہاتھ چومتے ہوئے کہا۔

”اور میرے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟“ اپنے پیچھے انہیں شمرہ کی جھپٹی ہوئی آواز سنائی دی تو وہ تنہیدگی سے اس کی طرف پلٹیں، وہ بڑی عجیب نظروں سے انہیں دیکھ رہی تھی۔

”تم تو ہمیشہ ہی پیاری لگتی ہو“ انہوں نے پیارے سے اس کا چہرہ دیکھا، جس کے چہرے کا تناؤ ایک دم کم ہوا تھا۔

”میں زہرہ سے زیادہ اچھی لگ رہی ہوں نا، بیوٹی پارلر والی بھی کہہ رہی تھی اور ویسے بھی میں نے اس سے کہہ دیا تھا زہرہ کا میک اپ اور مجھے یہ تم ہی ہونا چاہیے۔ وہ اپنی ہی دھن میں کہہ رہی تھی، اس نے غور ہی نہیں کیا، صفورہ کا چہرہ سخت ہو گیا ہے، لیکن زہرہ، ماں اور بہن دونوں پر نظر رکھے ہوئے تھی۔ اس نے بے ساختہ ماں کا ہاتھ دبا کر انہیں بولنے سے روکا تھا۔ صفورہ نے بمشکل خود کو کنٹرول کیا تھا اور ہونٹ ہچکچاتے ہوئے کہا۔

”ماما، عفرات آئی ہے۔“

”نہیں بیٹا تم نے اس کو اطلاع کی تھی نا، زیادہ لوگوں کو انوکھٹ نہیں کیا تاہم نے تو میں نے عفراتی کو نہیں بلایا۔“ وہ اتنی جلدی میں تھیں اس کی بات سننے بغیر نکل گئی تھیں۔

”عفرات! آئی اور نہ ہی فاطمہ نے مجھ سے کوئی بات کی، کہیں تم نے مجھ سے کوئی جھوٹ تو نہیں بولا۔“

”آئی تھی مجھے کچھ نہیں بتا۔“ وہ اسکا سر بولی۔

”بات سنو عفرات!“ اس نے ایک دم اسے پکڑ کے سیدھا کیا۔ ”میں نے تمہاری مٹنی میں کوئی رکاوٹ اس لیے نہیں ڈالی، کیونکہ مجھے فاطمہ چاہیے، لیکن اگر ایسا نہ ہوا تو میں تمہارا چہرہ حرام کر دوں گی۔“

”چلو زہرہ، شمرہ وہ لوگ آ گئے۔“ صفورہ تیزی سے اندر داخل ہوئی تھیں۔ اور زہرہ کی بات ادھوری رہ گئی۔

اسے جب زوہیب کے پہلو میں لاکر بٹھایا گیا تو اس کا دل بالکل خاموش تھا۔ کوئی احساس چاہنے

کے باوجود وہ محسوس نہیں کر پا رہی تھی۔ انگوشی پہنانے کی رسم شروع ہوئی تو زوہیب کے کزنز نے ایک شور برپا کر دیا تھا۔ شوخ جملوں کا تبادلہ ہو رہا تھا۔ شمرہ سب میں پیش پیش تھی۔ زوہیب اسے انگوشی پہنانا چاہتا تھا، لیکن اس کی والدہ نے زہرہ کو انگوشی پہنائی تھی، جس پر پھر شور بلند ہوا تھا۔ زوہیب سب انجوائے کر رہا تھا۔ وہ کتنا خوش تھا۔ اس کا اندازہ اس کے قہقہوں سے ہو رہا تھا۔ وہ بھی خوش ہونا چاہتی تھی پر اس کا دل ادا اس تھا۔ اس کی دوست اس کی بچپن کی ساتھی اس سے ناراض تھی، وہ اس گھر کا حصہ بننے والی تھی جس کی بچپن سے اس نے چاہ کی تھی۔ ماں یہ اور بات ہے کہ جس شخص نے اسے پروچوڑ کیا تھا وہ بھی اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا، لیکن اب کیا ہوا تھا۔ اس نے تو اس سے کوئی محبت بھرا جملہ نہیں بولا تھا۔ اس نے تو اس سے نہیں کہا تھا وہ اس سے شادی کرنا چاہتا ہے، نہ اس نے اس کی خوب صورتی کے تعہد بے پڑھے تھے۔ وہ تو اس کو دھک کر گر گیا تھا، پھر کیوں اپنے منگھڑتے کے ساتھ بیٹھ کر وہ اسے سوچ رہی تھی۔ اس نے تو کبھی بھی کسی چیز میں بے ایمانی نہیں کی تھی، پھر اب کیوں، وہ خود سے سوال کر رہی تھی، جب وقار نے زوہیب کو انگوشی پہنادی، اس نے گہرا سانس لیا۔

”مجھے بے ایمانی نہیں کرنی۔“ اس نے خود کو باور کروایا تھا، کیرے کا قلندش اس کی آنکھوں میں پڑا تو اس نے بے ساختہ آنکھوں کو بند کیا تو بے اختیار دو آنسو اس کے گالوں پر بہہ نکلے۔

☆☆☆

”عفرات۔“ اپنے نام کی پکار پر وہ بے ساختہ متوجہ ہوئی تھی۔

”ہوں۔۔۔ کہاں ہو یارہ کب سے بلا رہی ہوں۔“ روانے حیرت سے اس کا کھویا ہوا انداز دیکھا۔

”ہاں کیا کہہ رہی تھیں۔“ اب کے کی وی دیکھتے فخر نے بھی چمک کر اسے دیکھا تھا۔

”کیا بات ہے عفرات، کوئی پریشانی ہے۔“ فخر

اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے قریب بیٹھ گیا۔

”نہیں تو بھائی۔“ اس نے ہنس کر اس سے زیادہ خود کو مطمئن کیا۔

”تو پھر کیا بات ہے، کتنے دنوں سے دیکھ رہا ہوں پریشان لگ رہی ہوں، نہ ٹھیک سے کھا رہا ہو، دھیان بھی تمہارا نہیں اور ہوتا ہے، کوئی پریشانی ہے تو مجھے بتاؤ۔“

”نہیں بھائی، ایسی بات نہیں، ویسے ہی آج کل ٹھیک ہو رہے ہیں، بس ان کو لے کر۔“

”یہ بھی کوئی پریشانی والی بات ہے۔“ فخر نے جیسے مطمئن ہو کر کہا۔

”اور تم یہ بتاؤ تمہارا عزیزاں جان سہیلی کی آج منگنی ہے، تمہیں تو وہاں ہونا چاہیے تھا، تم یہاں کیا کر رہی ہو۔“ وہی بات جس کو وہ صبح سے نظر انداز کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ روانے کہہ کر جیسے اس کے کڑھم کو کھڑک ڈالا تھا۔

”میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی، تو میں نے پہلے ہی اس سے ایکسکوز کر لیا تھا۔“

”اچھا تو یہ نہ جانے کا صدمہ ہے۔“ روا کھلکھلا کر ہنسی تھی۔

”پتا ہے میں کیا سمجھی، اس صدی کا سب سے بڑا حادثہ ہو گیا، عفرات اور زہرہ کی لڑائی۔“ اس نے جیسے مزہ لیا تھا۔

”یہاں سبیل ہے مس روائ، یہ دنوں کبھی ناراض نہیں ہو سکتے۔“ فخر نے بڑے دعوے سے کہا تھا اور عفرات کا دل چاہہا تھا وہ اپنی آواز میں رد و ناشروع کر دے۔

”میں سونے جا رہی ہوں، سو رہی روائ، میں تمہیں ناگم نہیں دے سکتی۔“ اس نے اٹھتے ہوئے معذرت کی۔

”کوئی بات نہیں، تم جاؤ، میں فخر بھائی کے ساتھ آؤں کریم کھانے جاؤں گی۔“

”چلو میری شامت فوراً آ جاتی ہے، وہ فاطمہ کدھر ہے۔“ حاتے جاتے اس نے تناؤ اسے خیال آیا، اس نے صبح سے فاطمہ کو نہیں دیکھا، فاطمہ

کے کمرے کی طرف جاتے جاتے وہ ٹیرس کی طرف
مڑ گئی تھی۔ دیوار کی اوٹ سے اس نے سامنے
دیکھا۔ وہ گاڑی سے اتر رہی تھی اور اترتے ہوئے
اس کی نظریں گیٹ سے ہوتی ہوئی ٹیرس تک آئی
تھیں اور پھر مایوس ہو کر وہ اندر مڑ گئی۔ وہ کتنی خوب
صورت لگ رہی تھی۔ عفرانے بے ساختہ منہ پر ہاتھ
رکھ کر اپنی آواز کا گلا گھونٹا تھا۔ کتنی دیر رونے کے بعد
اس نے چہرے کو اچھی طرح صاف کیا اور فاطمہ کے
کمرے کی طرف بڑھی۔ ہلکی سی دستک کے بعد اس
نے جینڈل گھما کر دروازہ کھول دیا۔ وہ سامنے بیڈ پر
لیٹا مسووی دیکھ رہا تھا۔ اسے دیکھ کر وہ مسکرایا تھا۔
”اسے عفران سوئی نہیں تم، آؤ۔“ اب کے وہ
اٹھ کر بیڈ پر گیا تھا۔ وہ اس کے پاس جا کر بیٹھ گئی اور
نظریں لی دی پر جمادیں۔
”تمہاری طبیعت ٹھیک ہے۔“ فاطمہ نے
تشویش سے اس کا چہرہ دیکھا۔ وہ کچھ دیر ہونٹ پکاتی
رہی، پھر بے ساختہ اس کے سینے میں سر چھپا کر رو
پڑی۔ فاطمہ نے اسے روکا نہیں تھا۔ بس ہلکے سے
اس کا سر چھپھٹاتا رہا۔ کافی دیر بعد جب اس کا رونا
سکلیوں میں بدلنے لگا تو اس نے خود سے الگ کیا
اور پاس رکے جگ میں سے پانی گلاس میں ڈال کر
اس کے منہ سے لگا دیا۔
”کیا ہوا ہے، کیوں رو رہی ہو ایسے۔“ اس
کے برعکس وہ بہت سکون میں تھا۔
”وہ آگئی ہے بھائی، اتنی خوب صورت لگ
رہی ہے، وہ ہماری تھی وہ، کسی اور کی کیسے ہو سکتی ہے،
مجھ سے برداشت نہیں ہو رہا، آپ کچھ کریں بھائی،
اسے لے آئیں، اس سے زبردستی نکال کر لیں، پھر
تو کوئی اسے نہیں چھین سکے گا نا۔“ اس کا ہاتھ چھپھٹاتا
فاطمہ کا ہاتھ رک گیا تھا۔
”پانگلوں جیسی باتیں مت کرو عفران۔“ وہ
ناراضی سے بولا۔
”میں ہوں پانگل، اس پر آپ کا حق ہے، میرا
حق ہے، وہ کسی اور کی نہیں ہو سکتی۔“ روتے ہوئے

اس کی ایک ہی رٹ تھی۔
”کیا آپ کو دکھ نہیں ہو رہا۔“ اس نے روتے
ہوئے اس کا چہرہ دیکھا۔
”نہیں۔“ وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ کر بولا۔
”اور تمہیں بھی نہیں ہونا چاہیے۔ ایک بات ہوئی
پھر ختم ہو گئی۔ اس کو زندگی موت کا مسئلہ بنانے کی کوئی
ضرورت نہیں، یہ بات کسی کو نہیں چاہیے، سوائے تمہارے
اور میرے، سب کے لیے سب پہلے جیسا ہے اور اگر
میں تمہیں نہ بتاتا تو تم آج اپنی دوست کی مشکلی سے
بڑی خوش خوشی لوٹ رہی ہوتیں، کوئی فرق نہیں پڑا اور نہ
میری وجہ سے تمہیں اپنی دوستی خراب کرنی چاہیے۔“
”آپ جھوٹ بول رہے ہیں بھائی! بالکل
غلط، آپ اسے معاف کر سکتے ہیں، میں نہیں۔“ وہ
ایک جھٹکے سے اس کے قریب سے اٹھی تھی اور اسی
تیزی سے اس کے کمرے سے باہر نکل گئی۔ فاطمہ
نے گہرا سانس لیا اور لی دی آف کر دیا۔ پہلے کی
نسبت اب اس کا چہرہ مضطرب تھا۔
”وہ اتنی خوب صورت لگ رہی تھی بھائی۔“
عفران کا جملہ اس کے کان میں گونجا تھا۔ وہ بے ساختہ
ٹیرس پر کھڑا ہو گیا۔
”اس پر ہمارا حق تھا، وہ کسی اور کی کیسے ہو سکتی
ہے۔“ اس کی نظریں سامنے ٹیرس پر پڑ گئیں، جہاں
اندھیرا ہی اندھیرا تھا اور پھر وہاں روشنی پھیل گئی۔
☆☆☆
وہ جتنی دیر لوگوں میں رہی اس نے پورے
ضبط سے کام لیا تھا۔ لیکن گھر اترتے ہی عفران کا بند
گیٹ اور سونا ٹیرس دیکھ کر جیسے خود پر قابو رکھنا مشکل
ہو گیا تھا۔ وہ کسی کا بھی انتظار کیے بغیر اپنے کمرے کی
طرف بھاگی تھی اور کمرے میں آتے ہی جیسے اس
نے خود پر رکھا ضبط کھو دیا تھا۔ سب وہاں اس کی
تعریف کر رہے تھے لیکن اس کا ایک بار بھی خود کو
دیکھنے کو دل نہیں چاہا تھا اسے کچھ بھی اچھا نہیں لگ
رہا تھا۔ وہ اسی طرح روتے ہوئے ٹیرس کے پاس
کھڑی ہو گئی۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ لان کی روشنی میں

گھر کے مختلف حصے روشن تھے۔ وہ رینگتھا مگر
رونے لگی۔ روتے روتے اس نے نظر اٹھا کر دیکھا
اور سامنے ٹیرس پر کھڑا ہوا اسے اپنا دم لگا تھا۔ اس
نے بے ساختہ آنکھوں کو صاف کیا۔ وہ اس کا وہم
نہیں تھا۔ وہ حقیقت کا روپ ہے۔ اس کے سامنے
تھا۔ اس کے پیچھے سے آئی روشنی میں وہ اور واضح
ہو رہا تھا اور ان سے نکلتی روشنی میں وہ دیکھ سکتی تھی۔ وہ
اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ وہ اپنے قدم پیچھے ہٹتی اور بھاگ
کر دیوار سے جا لگی اس کے دل کی رفتار بہت تیز
تھی۔ اس نے رخ موڑ کر ذرا سا سر اگے نکال کر چھانکا
وہ ابھی بھی وہیں کھڑا تھا وہ دوبارہ پیچھے ہٹ گئی تھی۔
اب کی بار اس نے سختی سے آنکھیں بند کر لی تھیں۔
☆☆☆
کسی احساس سے اس کی آنکھ کھلی تھی۔ اس نے
بمشکل اپنی بھاری ہوئی آنکھیں کھولی تھیں اور صفورہ کو
اپنے قریب بیٹھا دیکھ کر اسے حیرت ہوئی تھی۔
”ماما آپ.....“ وہ بند آنکھوں کے ساتھ
مسکرائی۔
”ہاں..... میں۔“ وہ اس کا ہاتھ چوم کر بولیں۔
”آپ جینک نہیں کریں۔“
”نہیں آج سوڈ نہیں تھا۔“
”ہوں۔“ اس نے پھر آنکھیں بند کر لیں۔
”صائمہ بھابھی اور سفیان بھائی آئے تھے
مبارک دینے۔“ اور زہرہ نے جھٹکے سے آنکھیں
کھولیں اور ساتھ ہی اٹھ کر بیٹھ گئی۔
”اور عفران وہ بھی آئی تھی۔“ اس نے بڑی
آس سے پوچھا۔
”نہیں بلکہ میں نے بھی عفران کا پوچھا تو انہوں
نے بتایا اس کی طبیعت خراب ہے، میں یہ ہی کہنے
آئی تھی، تم اس کا پتا کر آنا۔“ زہرہ نے گہرا سانس
لے کر سر جھکا لیا۔
”اور ہاں۔“ وہ جیسے کچھ یاد آنے پر پٹیں۔
”زوہیب کا فون آتا تھا، تم سو رہی تھیں، وہ
بعد میں فون کرے گا، تم بات کر لینا۔“

”ماما۔“ وہ ایک دم بولی۔
”میں کیا بات کر رہی تھی۔“ اس کے چہرے پر
گھبراہٹ صاف نظر آرہی تھی۔
”آپ نے منع کر دینا تھا۔“ صفورہ نے پلیٹ
کر اس کا چہرہ دیکھا اور دوبارہ اس کے پاس آ کر
بیٹھ گئیں۔
”منع کیوں کرتی اور اس میں اتنا گھبرانے والی
کیا بات ہے۔“
”ماما مجھے نہیں پتا، مجھے کیا بات کرنی چاہیے اور
پھر اچھا نہیں لگتا۔“ وہ یہ کہہ کر اپنے ہاتھوں کی
تھیلیوں کو دیکھنے لگی۔
”کیا اچھا نہیں لگے گا، زہرہ میں تمہاری ماں
تمہیں اجازت دے رہی ہوں، تمہیں کسی کے اچھایا
برا لگنے کی پروا نہیں کرنی چاہیے۔“ وہ اس کا کندھا
چھپچھا کر اٹھ گئیں، جبکہ وہ گہرا سانس لے کر رہ گئی۔
وہ نیچے آئی تو شرہ بڑے خوش گوار سوڈ میں کسی
سے باتیں کرنے میں مشغول تھی۔ وہ اسے دیکھ کر
کچن کی طرف بڑھنے لگی، جب شرہ نے اسے آواز
دے کر روک لیا۔
”زوہیب کا فون ہے۔“ وہ جو اس کی طرف
آ رہی تھی، وہاں رک گئی۔ ”لونا رک کیوں نہیں۔“
زہرہ، شرہ کا چہرہ دیکھ کر فون کی طرف بڑھی، وہ اسے
ریسیور تھا کہ خود قریب رکھے صوفے پر بیٹھ گئی۔
”ہیلو۔“ شرہ کو دیکھ کر اس نے رخ موڑ کر
جیسی آواز میں بولو کہا تھا۔
”شکر ہے تم سے بات تو ہوئی، یہ میرا تیسرا
فون ہے۔“ اس کی ہیلو سننے ہی زوہیب خوش گوار
لہجے میں بولا۔
”میں رات کو لیٹ سوئی تھی، اس لیے صبح لیٹ
ہو گئی۔“
”لیٹ کیوں سوئی تھیں؟“ اس کے لہجے کی
ہنسی زہرہ کو صاف محسوس ہو رہی تھی۔ اب اسے کیا
بتانی کہ ساری رات کچھ لوگوں کو کھونے کے دکھنے
سوئے نہیں دیا۔

”مجھے یاد کر رہی تھیں۔“ اس کی خاموشی پردہ شرارت سے بولا۔

”جی۔“ وہ بے دھیانی میں بولی۔

”واہی۔“ وہ جیسے حیران ہوا۔

”نہیں میرا مطلب ہے دیے ہی وہ۔“ وہ ایک دم شرمندہ ہو کر صفائی دینے لگی۔

”کیا یار تھوڑی دیر تو خوش رہنے دیتیں؟“ اب کی بار وہ کچھ نہیں بولی۔

”لیکن میں تو ساری رات نہیں سویا، بار بار تمہارا چہرہ آنکھوں کے سامنے آ جاتا تھا، انتظار تھا جلدی صبح ہو تو تمہاری آواز ہی سن لوں، تم بھی کچھ بولو نا۔“

”میں کیا بولوں۔“

”کچھ نہیں بولنے کو۔“ وہ جیسے مایوس ہوا۔

”اچھا۔“ یہ بتاؤ مجھے مس کیا؟“ زہرہ کو اب الجھن ہونے لگی تھی۔

”بتاؤ۔“

”ہاں نہیں۔“ اس کی بے زاری کو دوسری طرف اس کے شرمیلے پن سے ملوث کیا گیا تھا۔

”تم کتنا شرماتی ہو، جبکہ شرمہ بھی تمہاری بہن ہے، اتنا فرحتنگی بات کرتی ہے، مزہ آ جاتا ہے۔“

اب وہ اس بات کا کیا جواب دے سکتی تھی، گہری سانس لے کر وہ تھی۔

”تمہارے پاس موبائل ہے نا۔“

”جی۔۔۔۔۔ تو اپنا نمبر بتاؤ ڈائریکٹ فون کروں گا۔“ زہرہ نے پریشانی سے پاس بیٹھی شرمہ کو دیکھا۔

”میں ماما سے پوچھ لوں۔“

”کیا؟“ دوسری طرف وہ چنچا تھا۔

”تمہیں فون نمبر بتانے کے لیے ماما سے پوچھنے کی ضرورت ہے۔“ وہ اب ناراضی سے بولا۔

تھوڑی دیر بعد اس نے گہرا سانس لیا۔

”ٹھیک ہے، آئی سے پوچھ کر مجھے میسج کر دینا اور میرا نمبر آنٹی کے پاس بھی ہے اور شرمہ کے پاس بھی۔“ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا، زہرہ نے ہوش جمع لیے، یقیناً زہیب کو اس کی باتیں اچھی

نہیں لگی تھیں۔

☆☆☆

صائمہ نے مسکرا کر سر ہلایا۔

”آپ آج کہہ تو ٹھیک رہی ہیں، لیکن میرا ارادہ عفرات کی پہلے کرنے کا ہے۔“ ان کی بات سن کر

بتول نے جائے کالمگ واپس میز پر رکھ دیا۔ تو میں نے کب منع کیا ہے، کرو اللہ عفرات کے نصیب اچھے

کریں۔ لیکن تم خود سوچو صبا اور ردا، عفرات سے بڑی ہیں اور میں تو بچپن سے ہی تمہیں کہہ چکی تھی کہ میری

دونوں بیٹیاں تمہارے گھر کی بہنیں کی۔ اب تو صبا بھی فارغ ہے اور ردا بھی تمہارے بہنوئی یا ر بار

کہتے ہیں اپنی بہن سے بات کرو نہیں تو ان کے سچے اور بھانجے بھی ہیں اور تم جانتی ہو میری آج

نکاح اپنی بیٹھالی اور تندہ سے نہیں بنی۔ وہ ناگوار سے بولیں۔ اور سب سے اہم بات صبا اور ردا کا

رجحان بھی تمہاری طرف ہی ہے۔

”آپائیں کہہ تو رہی ہوں مجھے کوئی اعتراض نہیں، لیکن بچوں سے بھی پوچھنا ضروری ہے نا۔“

”کمال کی بات کرنی ہو صائمہ، کیا تم نے فخر اور فاطمہ سے بات نہیں کی تھی۔“

”آپا بچہ کہوں تو بھی خاص طور پر ایسا ذکر نہیں ہوا، لیکن آپ فکر نہیں کریں میں فخر اور فاطمہ سے

بات کرنی ہوں وہ مان جائیں گے۔“

”اور اگر وہ نہ مانے تو۔“ بتول ماتھے پر تل ڈال کر بولیں۔

”آپ فکر کیوں کرتی ہیں آپا! ایسا کچھ نہیں ہوگا۔“ صائمہ نے ان کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر تسلی دی

تو وہ خاموش ہو گئیں۔

☆☆☆

شام کو وہ سب ٹی وی لائونگ میں اکٹھے تھے جب صائمہ چائے کے ساتھ پکڑے بھی لے کر آئیں۔

”واہ ماما! تو آپ نے کمال کا کام کیا۔“ سب سے پہلے فخر اپنی جگہ سے اٹھا تھا۔ صائمہ نے ایک طائرانہ نظر سب پر ڈالی، فخر پکڑے کھاتے ہوئے

دی دیکھ رہا تھا، جبکہ فاطمہ اور سفیان بیانی تھا، سیاست

رہنما کو گھر رہے تھے اور عفرات پکڑے کھاتے ہوئے بھی

ٹی وی اور کبھی باپ اور بھائی کو سن رہی تھی۔

”آج بتول آیا آئی تھیں۔“ ان کے اچانک

اطلاع دینے پر سب انہیں دیکھنے لگے۔

”یہ کون سی نئی بات ہے ماما۔“ عفرات ہٹا کر بولی۔

”نئی بات یہ ہے کہ وہ صبا اور ردا کی شادی کرنا

چاہتی ہیں تو اس مقصد کے لیے وہ ہمارے گھر آئی

تھیں۔“ اب کے سب اپنے اپنے کام چھوڑ کر انہیں

دیکھنے لگے۔

”صبا اور ردا کی شادی سے ہمارا کیا مطلب

ہے۔“ فاطمہ نے کافی سنجیدگی سے پوچھا تھا۔ صائمہ

نے غور سے فاطمہ کی شکل دیکھی۔

”آپا نے شروع سے ہی مجھ سے کہہ رکھا تھا

کہ صبا اور ردا کی شادی تم لوگوں سے ہوگی اور دیکھا

جائے تو ٹھیک بھی ہے، وہ میری بھانجیاں ہیں، بچپن

سے انہیں جانتی ہوں، مجھے پسند ہیں وہ۔“

”سفیان آپ کا کیا خیال ہے؟“ صائمہ نے

اب اپنے شوہر سے پوچھا۔

”مجھے تو کوئی اعتراض نہیں دونوں بچیاں اچھی

ہیں۔“

”ہیں نا۔“ صائمہ خوش ہو کر بولیں۔ عفرات نے

اپنے دونوں بھائیوں کی شکل دیکھی۔

”پھر کیا کہتے ہیں آپا کو ہاں کہہ دوں۔“

انہوں نے تائیدی انداز میں سفیان کو دیکھا۔

”اتنی جلد بازی ٹھیک نہیں صائمہ بیگم۔“

”آپ کو ابھی بھی جلد بازی لگ رہی ہے، آپا

تو دیر ہو جانے پر ناراض ہو رہی تھیں اور پھر آپ کو

اور مجھے پسند ہیں صبا اور ردا۔“

”بیٹیاں بات تمہاری اور میری پسند کی نہیں

جنہوں نے زندگی گزار لی ہے ان سے

پوچھو۔“ انہوں نے فخر اور فاطمہ کی طرف اشارہ کیا۔

”ہاں فخر بولو، تمہیں صبا یا ردا میں سے کون پسند

ہے۔“ صائمہ نے اب سیدھا فخر سے پوچھا تو وہ

گڑبڑا کر ماں کو دیکھنے لگا۔

”مما وہ دونوں میری کزنز ہیں، لیکن اس سے

زیادہ کچھ نہیں۔“

”فخر۔“ صائمہ غصے سے بولیں۔

”میں نے تمہیں بتا دیا تھا کہ میرا ارادہ صبا کو

بہنوئی بنانا ہے، جب تم کیوں نہیں بولے۔“

”مما! میں نے ہاں بھی نہیں کی تھی۔“

”تمہیں کوئی اور پسند ہے۔“ اب کے سوال

سفیان کی طرف سے آیا تھا، فخر جواب دینے کے

بجائے خاموش ہو گیا تھا۔

”میری ایک بات کان کھول کر سن لو فخر، اگر تم

صبا سے شادی نہیں کرو گے تو پھر اپنی پسند کی لڑکی سے

بھی تم شادی نہیں کر سکتے۔“

سفیان غصے سے بولے۔

”زندگی فخر نے گزائی ہے مما تو اسے پورا حق

ہے، وہ اپنی پسند کو نظر رکھے۔“ اب فاطمہ بھی بولا تھا۔

”تم اس کی اتنی حمایت کر رہے ہو، یقیناً تم

نے بھی کوئی پسند کر رکھی ہوگی۔“

”میری بات چھوڑیں، مجھے اگر کوئی پسند ہوتی

تو مجھے کوئی روک نہیں سکتا تھا۔“ عفرات نے بے ساختہ

فاطمہ کی طرف دیکھا۔

”تو تمہیں ردا پسند ہے۔“

”اب میں نے یہ بھی نہیں کہا۔“

”اور وہ جو تمہاری ردا سے اتنی دوستی ہے۔“

”مما آپ بات کو کہاں سے کہاں لے کر

جار رہی ہیں۔ کزن ہے وہ ہماری، اچھے طریقے سے

بات کرنے یا لہجی مذاق کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ ہم

شادی چلان کر کے بیٹھے ہیں، ردا میری کزن ہے بس

اور لائف پارٹنر کے لیے میرے ذہن میں جو لڑکی

ہے ردا اس سے بہت مختلف ہے۔“ صائمہ نے باری

باری دونوں کا چہرہ دیکھا اور دوپٹے میں چہرہ چھپا کر

رونے لگیں۔

کمال ہے مما۔۔۔۔۔ فاطمہ دونوں ناگوں پر ہاتھ

ایسے کیوں بیٹھی ہو زہرہ۔ وہ میری جیوں پر بیٹھی
ایک تک سامنے لگے پھولوں کو دیکھ رہی تھی۔ جب
صفورہ کی آواز پر چونک کر پلٹی۔

”کچھ نہیں ماما۔“ وہ ہلکا سا مسکرا کر ہلچے سامنے
دیکھنے لگی تو صفورہ بھی اس کے ساتھ میز پر بیٹھ گئیں۔
”اتنی شام کو لالہ میں نہیں بیٹھتے۔“ ان کے
کہنے پر بھی وہ خاموش رہی۔

”زہرہ کیا بات ہے۔“ اب کے انہوں نے رخ
اس کی طرف موڑ لیا۔ زہرہ نے گہرا سانس لے کر سر
ان کی طرف گھمایا۔

”ماما آج زہیب کا فون آیا تھا۔“
”اچھا تو اس میں پریشانی والی کیا بات ہے۔“
وہ مسکرا کر بولیں۔

”مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا ماما۔“
”کیا بات سمجھ میں نہیں آ رہی میری گڑبا کو۔“
انہوں نے اس کا سر سہلایا تو اس نے سر ان کی گود
میں رکھ دیا۔

”ماما میں لوگوں کو سمجھ نہیں پاتی یا لوگ مجھے نہیں
سمجھتے۔“ اس کا سر سہلایا صفورہ کا ہاتھ رک گیا تھا۔
”مجھ سے کوئی خوش نہیں ہوتا، میں کسی کی خوشی
کا باعث نہیں بن پاتی، مجھ میں کیا خرابی ہے ماما کہ
کوئی مجھ سے محبت نہیں کرتا۔“

”کیا ہوا ہے زہرہ، زہیب نے کچھ کہا ہے۔“
صفورہ نے اس سے سنجیدگی سے پوچھا، لیکن وہ اپنی
دھن میں تھی۔

”بچپن سے ایسا ہی ہوتا آ رہا ہے، ہمیشہ آتی کو
مجھ سے زیادہ توجہ اور محبت لی، لیکن اس کے باوجود وہ
مجھ سے میری ہر خوشی چھیننے کی کوشش کرتی ہیں، ہر کوئی
میرا مقابلہ ان سے کرتا ہے، کیا میری اپنی کوئی پہچان
نہیں، کیا کوئی مجھے میری پہچان کی بنا پر میری عادتوں
اور سیرت سے محبت نہیں کر سکتا، کیا آنے والی زندگی
میں مجھے کچھ وراثہ کرنا پڑے گا، مجھے محبت نہیں ملے
گی، عزت نہیں ملے گی، آگے بھی مجھے ڈر، ڈر کر جینا

پڑے گا۔“

”ہوا کیا ہے زہرہ۔“ صفورہ نے پریشانی سے
اسے جھنجھوڑا لایا تھا۔ زہرہ نے چونک کر انہیں دیکھا
جو پریشانی سے اسے دیکھ رہی تھیں۔

”بیٹا مجھے، زہیب نے کچھ کہا ہے یا شہرہ نے
کچھ کر دیا ہے۔“ زہرہ نے بے ساختہ سر جھٹکا۔

”نہیں ماما۔“ اس نے بے ساختہ ہاتھ سہلایا۔
”زہیب بار بار مجھے فون کرتے ہیں۔“

”سمجھ میں نہیں آتا، کیا بات کروں، یہ ہی ذرا ہوتا ہے
کوئی غلط بات نہ کہہ دوں جو انہیں بری لگ جائے
اور وہ اس بات کو غلط رنگ دے رہے ہیں۔“

”اور شہرہ کے بارے میں کیا کہہ رہی تھیں۔“
”کچھ نہیں ماما۔“
”مجھے بتاؤ زہرہ۔“ وہ اب غصے سے بولیں۔

”میرے خیال میں آتی زہیب سے باتیں
کرتی ہیں تو انہیں بھی گلے لگتا ہے آتی مجھ سے بہتر
ہیں۔“ صفورہ کے ہونٹ مسخ گئے تھے۔

”اب زہیب نے مجھ سے ملنا چاہتے ہیں، وہ بھی
آتی کے ساتھ اور مجھے لگتا ہے آتی ملتی بھی ہیں۔“ اب
کے زہرہ نے ماں کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھیں
آنسوؤں سے بھری تھیں۔ صفورہ نے گہرا سانس لیا۔

”تم پریشان نہ ہو، میں دیکھ لوں گی سب، تم
زہیب سے بات کر کے اسے کلیئر کر دو، غلط فہمی کو
جتنی جلدی ختم کر دیا جائے اتنا ہی اچھا ہے اور
ہاں۔“ وہ اٹھتے اٹھتے پھر بیٹھ گئیں۔

”جو محبت نصیب میں لکھی ہوئی ہو اسے کوئی
نہیں جھین سکتا، جو تمہارا ہے وہ تمہارا ہی رہے گا اور
جو تمہارا نہیں وہ تمہارا ہو کر بھی تمہیں نہیں مل سکے گا۔“

لفظ پر یقین رکھو، وہ انہوں کے ساتھ اچھا کرتا ہے
اور یہ جو آزمائشیں زندگی میں آتی ہیں، یہ انسان کو
کند بن دیتی ہیں، تمہیں کسی سے ڈرنے کی
ضرورت نہیں اور نہ تم کسی سے کم ہو، تم میری سب
سے اچھی اور پیاری بیٹی ہو۔“ انہوں نے کہہ کر اسے
دوبارہ ساتھ لگایا۔

”سبح زہیب کا فون آیا تھا وہ زہرہ سے ملنا
چاہتا ہے، لیکن وہ چاہتا ہے میں بھی زہرہ کے ساتھ
آؤں۔“ کھانا کھاتے ہوئے شہرہ نے بڑے مطمئن
انداز میں اطلاع دی تھی۔ اور صفورہ اسی وقت کا
انتظار کر رہی تھیں، انہوں نے اپنا چہچہہ پلیٹ میں رکھ
کر اسے دیکھا۔

”زہیب نے تمہیں فون کیوں کیا۔“ اب کے
شہرہ نے چونک کر دیکھا، وقار، صفورہ اور زہرہ تینوں
اسے ہی دیکھ رہے تھے۔

”یہ آپ مجھ سے کیوں پوچھ رہی ہیں، اس
سے پوچھیں۔“

”تمہیں یاد ہے ناز زہیب، زہرہ کا مگنیر ہے؟“
”آپ کا مطلب کیا ہے؟“ اب کے شہرہ نے
اتنے پر بل ڈال کر پوچھا۔

”میرا مطلب تم اچھی طرح جانتی ہو، کیوں تم
زہیب سے ملتی ہو، اس سے باتیں کرتی ہو۔“ وقار
نے چونک کر صفورہ کو دیکھا۔

”مجھے کوئی شوق نہیں اس سے ملنے یا بات
کرنے کا، وہ کرتا ہے مجھے فون، میں نے تو اس کی
وجہ سے اس سے بات کی تھی۔“ اس نے زہرہ کی
طرف اشارہ کیا۔

”شہرہ! ڈانٹن بھی دس گھر چھوڑ دیتی ہے، تم
اپنی ہی سگی بہن کے پیچھے پڑ گئی ہو۔“ شہرہ نے غصے
سے پلیٹ پیچھے کھسکا لی۔

”کیا ہو گیا ہے، کیوں فضول بولتی جا رہی
ہو۔“ وقار نے انہیں ٹوکا تھا۔

”آپ تو جب ہی رہیں پاپا۔“ وہ ہاتھ اٹھا کر
بدلتیزی سے بولی۔ ”شک آگئی ہوں میں آپ لوگوں
کی روز بروز کی چیخ سے، یہ مت کر دو، وہ مت کر دو،
ہر وقت زہرہ آپ لوگوں کے ذہن پر سوار رہتی ہے۔“

اس تک لی بی کے کارنامے تو کسی کو دکھائی نہیں
دیے، کسی کو میری قربانی نظر نہیں آتی، میں بڑی
ہوں، لیکن منجھی شہرہ یہ ہے۔“

”قربانی؟ کون سی قربانی دی ہے تم نے، میں تو

زہرہ کی منجھی بھی نہیں کرنا چاہتی تھی، تم نے مجھے نورس کیا
تھا، مجھے تو پسند بھی فاطمہ تھا، تم نے زہیب کا کہا تھا زہرہ
انوار ہے زہیب میں۔“ زہرہ کے سر پر دھماکا
ہوا تھا، اس نے بے یقینی سے اپنی سگی بہن کو دیکھا۔

”تو کیا غلط کہا تھا زہیب نے اسے خود
پر دپوز کیا تھا، اس کی مرضی تھی تو وہ گھر تک آیا تھا اور
یہاں تو آپ کو پاپا کسی کو کوئی اعتراض نہیں ہوا اور

جب میں نے عدیل کا کہا تھا آپ دونوں کیسے
میرے خلاف ہو گئے تھے۔ اس کے گھر والوں سے
ملنے سے انکار کر دیا۔ میں بہت کچھ کر چکی تھی، آپ

کی عزت کی دھجیاں اڑا سکتی تھی، لیکن دیکھیں
خاموش ہو گئی اسے قربانی کہتے ہیں۔“ تیز تیز بولتے
اس کا سانس پھولنے لگا تھا، اس کا خوب صورت چہرہ
نفرت سے عجیب سا ہو گیا تھا۔

”وہ کسی قابل ہوتا نا تو میں خوشی خوشی تمہاری
خوشی پوری کروتی، لیکن وہ کسی کام کا نہیں۔“

”آپ کو اب الہام بھی ہونے لگے ہیں۔“ وہ
طنز پر انداز میں فحش کر بولی۔

”الہام نہیں پتا کرو لیا ہے۔“
”واہ۔“ شہرہ نے تالی بجائی۔
”کون ہے آپ کا ذلیل بیٹا تم کیا جانتی ہو

اس کے بارے میں۔“ اب یہ سوال وقار نے کیا تھا۔
”یہ کیا کم ہے کہ وہ آپ سب سے زیادہ مجھ
سے سینئر ہے۔“

”تمہیں لگتا ہے ماں باپ سے زیادہ بھی کوئی
تم سے پیار کر سکتا ہے۔“
”ہاں مجھے لگتا ہے۔“ وقار نے افسوس سے شہرہ
کو دیکھا۔

”اس کا کریکٹر اچھا نہیں شہرہ، وہ ایسے ہی
لڑکیوں کو پھانتا ہے، تم سے پہلے وہ ایک شادی
کر چکا ہے اور ایک لڑکی کو ویسے ہی تباہ کر چکا ہے۔“

”کیوں، آپ جھوٹ بول رہی ہیں، تاکہ میں
عدیل سے بدظن ہو جاؤں، لیکن اپنی اس غلط فہمی کو
دور کر لیں، خیر۔“ اس نے سر جھٹکا۔ ”مجھے اس

بارے میں بحث نہیں کرنی، مجھے صرف یہ بتائیں
زہرہ کل میرے ساتھ جاری ہے یا میں زہرہ کو منع
کردوں۔“ صفورہ نے دانت پر دانت رکھ کر خود پر
ضبط کیا تھا۔ وقار نے ایک نظر صفورہ کو دیکھا اور
دوسری نظر صم شہی زہرہ پر ڈالی۔

”زہرہ جانے کی کل تمہارے ساتھ، لیکن بہتر
ہوگا تم زہرہ سے زیادہ فری نہ ہو، کیونکہ آگے
جا کر تمہاری بہن کو مسئلہ ہو سکتا ہے۔“ زہرہ نے ابرو
اچکا کر وقار کو دیکھا۔

”واہ پاپا!۔۔۔ آپ کو بھی زہرہ زہرہ کرنے کی
عادت پڑ گئی ہے۔ واہ بھی زہرہ تمہارے چاہنے
والے تو ہر جگہ نظر آنے لگے ہیں، گھر میں، گھر کے
سامنے، گھر سے دور، واہ بھی کیا قسمت ہے۔“ وہ واہ
دیتے ہوئے کرسی دھکیل کر سیڑھیاں چڑھ گئی، جبکہ
صفورہ نے بے بسی سے سر ہٹام کیا اور وقار بھی پریشانی
سے سیڑھیوں کی طرف دیکھتے رہے جہاں ان کی
لاڈلی بیٹی تھی۔

☆☆☆

”پلیزٹ سر پرائز۔“ ان دونوں کو دیکھ کر وہ
کھڑا ہو گیا تھا۔

”مجھے بالکل امید نہیں تھی تم آؤ گے۔“
زہرہ کی پرشوق نظریں اس کے چہرے پر جمی تھیں
جو اس کی طرف دیکھنے سے گریزاں تھی۔

”یہ کریڈٹ مجھے جاتا ہے۔“ اس کے ساتھ
کھڑی شہر کو آخر کار بول کر اسے متوجہ کروانا پڑا۔

”ٹھیکس ٹویو مائی ڈیر سالی صلیب۔“ وہ جھک
کر بولا۔

”اب یہ مت بھولنا سالی آدھی گھر والی بھی
ہوتی ہے۔“

”ارے آپ کے لیے تو پورا گھر حاضر ہے۔“
”وہ بیان سے کہیں، ایسا نہ ہو میں واقعی پورے
گھر پر قبضہ کر لوں۔“ وہ دونوں قبضہ لگا کر ہنس پڑے،
جبکہ زہرہ کو ان کے مذاق سے انصاف ہونے لگی تھی۔

”سالی صلیب آپ تو اتنا اچھا بولتی ہیں، یہ

محترمہ اتنی گم صم کیوں رہتی ہیں۔“

”کیونکہ ان محترمہ کا دل اور وہ بیان کہیں اور
رہتا ہے۔“

”کیا مطلب۔“ زہرہ نے چونک کر پوچھا
تو زہرہ نے بے ساختہ شہرہ کو دیکھا۔

”کیوں زہرہ، بتا دوں زہرہ کو۔“ زہرہ کم
کر شہرہ کو دیکھنے لگی، پتا نہیں اب وہ کون سا تیر
چھوڑنے والی تھی۔

”کیا بات ہے۔“ دوسری طرف زہرہ
آنکھوں میں خشک لیے زہرہ کو دیکھنے لگا۔

”کچھ نہیں، مذاق کر رہی تھی، اب یوں بھی
بیٹھے سوال کرتے رہو گے یا کچھ کھانے کا آرڈر بھی
دو گئے۔“

”ہوں۔“ وہ شہرہ سے ایک نظر زہرہ کو دیکھ
کر میز کو بلانے لگا اچھا تو زہرہ سے یہ تاؤ تم دونوں
پہلی بار کب اور کیسے ملے۔“ دیر کے سرو کرنے کے
بعد شہرہ نے پھر سوالنامہ شروع کر دیا تھا۔

”زہرہ کا تو پتا نہیں، لیکن میں کافی عرصے سے
محترمہ کو نظر میں رکھے ہوئے تھا۔ اس کی یہ بے

نیازی ہی مجھے زیادہ اثر کرتی تھی، لیکن اب
محسوس ہوتا ہے یہ نیازی نہیں بے حس ہے۔“ زہرہ
نے چونک کر زہرہ کو دیکھا۔ وہ بھی اسے ہی دیکھ
رہا تھا۔ شہرہ نے مسکراتی نظروں سے دونوں کو دیکھا۔
آگ لگ چکی تھی، تھوڑا اور تیل ڈالنا تھا اسے۔

”یہ تو ہمیشہ سے ایسی ہی ہے بورنگ، تمہیں پتا
نہیں اس میں کیا نظر آیا، میں تو خیر ان ہوئی، جب

تمہارے جیسے ہندسہ لڑکے کا پروپوزل زہرہ کے لیے
آیا۔ آئی ایم سوری، لیکن مجھے تمہارے ٹیسٹ پر
افسوس ہو رہا ہے۔ وہ سوپ پیتے ہوئے کافی بے رحمانہ
تجزیہ کر رہی تھی۔ زہرہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا وہ کیسے
ایسا دفاع کرے، اس کی زبان نالوسے چپک کر رہ گئی
تھی اور آنکھیں اپنی بے عزتی پر بہنے کو تیار تھیں۔

”اب خیر ایسی بھی کوئی بات نہیں، زہرہ بہت
خوب صورت ہے، جس نے بھی زہرہ کو دیکھا اس

نے میری پسند کو داد دی تھی۔“ زہرہ نے مسکرا کر
زہرہ کو دیکھتے ہوئے کہا تو شہرہ کا مسکراتا چہرہ شہرہ
ہو گیا تھا۔ اس کا موڈ کچھ بہتر ہو گیا تھا۔ زہرہ کی
کسی بات پر وہ مسکرائی تھی، جب اسے عجیب سا
احساس ہوا اسے لگا کوئی اسے دیکھ رہا ہے، اسے غور
سے کہ اسے اپنے چہرے پر پیش محسوس ہو رہی تھی،
اس نے زہرہ کی طرف دیکھا، وہ اس کی طرف
متوجہ نہیں تھا۔ ”پھر کون۔“ اس نے دیر سے
دائیں طرف دیکھا، ایسا کوئی نہیں تھا۔ اس نے
نظر دلوں کو بائیں طرف گھمایا اور اسے لگا جیسے ساری
دنیا گھوم گئی ہو۔ زہرہ کے پیچھے بائیں طرف والے
ٹیکل بر فاطمہ بیٹھا تھا اور جس طرح وہ اسے گھور رہا تھا وہ
اندازہ کر سکتی تھی اس کا چہرہ کیوں جل رہا ہے۔ اس کے
لیے ایک نوالہ کھانا بھی مشکل ہو گیا تھا۔

”ایک سیکیوری۔“ میں آئی ہوں۔“ وہ ایک دم
کھڑی ہوئی تھی۔

”کیا ہوا۔“ زہرہ اس کے یوں کھڑے
ہونے پر حیران ہوا تھا۔

”مجھے واش روم جانا ہے۔“ ”اوکے دس دے
“ اس نے بائیں طرف اشارہ کیا۔

”ارے جاؤ، رک کیوں گئی ہو۔“ اسے ایسے
ہی کھڑے دیکھ کر شہرہ نے ٹوکا تو وہ طوطا کر اپنی جگہ
سے کھلی۔ فاطمہ کے قریب سے گزرتے ہوئے اس
نے واضح طور پر اپنی ناگواری میں لہرزش محسوس کی تھی۔
”ارے زہرہ۔“ شہرہ کی آواز پر وہ بے ساختہ
مڑی تھی۔

”تم یہاں کہاں۔۔۔ میں بھی کہوں یہ ملی
اس ریٹائرمنٹ میں آنے کے لیے اتنا زور کیوں
دے رہی تھی۔“ ”خیر اچھا کہ اس کے قریب آ گیا، اس
نے مرا کر ٹیکل کی طرف دیکھا، جہاں عفرات بیٹھی تھی
اس کے دیکھنے پر عفرات نے منہ دوسری طرف پھیر لیا،
جبکہ فاطمہ کی پہلے ہی اس کی طرف پشت تھی۔“

”واؤ کیا اتفاق ہے۔“
”کیا۔“ شہرہ کے سامنے دیکھ کر مسکراتے پر

زہرہ نے بھی مڑ کر دیکھا، جہاں زہرہ ایک لڑکے
کے سامنے کھڑی تھی۔

”یہ کون ہے۔“
”یہ ہمارے بڑوسی ہیں، عفرات، زہرہ کی دوست

کو تو تم جانتے ہو گے، ہاں، اس کے بھائی ہیں، زہرہ کا
ان کے گھر بہت آنا جاتا ہے، بلکہ کہنا چاہیے بہت
محبت ہے۔ وہ جو بلیونی شرٹ میں لڑکا بیٹھا ہے، اس
کا پروپوزل بھی آیا تھا زہرہ کے لیے، وہ نون شاید
ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے۔“ زہرہ نے غور
سے اس لڑکے کو دیکھا جو ہونٹ جھپٹے چادلوں میں
چھپ چکا تھا۔

”تو پھر اس کا پروپوزل قبول کیوں نہیں کیا؟“
زہرہ نے شہرہ سے شہرہ کو دیکھا۔

”اچھ نکلی ماما اور یااا کو ایسی بے شہری کی باتیں
پسند نہیں نا اور پھر عفرات کے گھر والے بھی نہیں مانے،
اویں خوب صورت لڑکی چاہیے تھی، میرے جیسی آئی
تو میرا ہی رشتہ لینا چاہتی تھیں، پر میں نے منع کر دیا۔
میرا لیل ڈراؤنچا ہے۔“ اس نے ایک ادا سے بال
پیچھے کرتے ہوئے کہا۔

”اس لیے تمہیں کبہ رہی تھی، مجھے تمہارے
انتخاب پر حیرانی ہو رہی تھی۔“ زہرہ نے کوئی
جواب نہیں دیا، اس نے دوبارہ مڑ کر دیکھا، زہرہ
وہاں سے جا چکی تھی۔ کچھ دیر بعد شہرہ نے فاطمہ کو بھی
اچھ کر واش روم کی طرف جاتے دیکھا، تو اس کی
آنکھیں چمک اٹھیں۔

”تم کہاں جاری ہو۔“ زہرہ نے چونک کر
اسے اسٹپ دیکھا۔ ”وہ بھی زہرہ کے پیچھے گیا ہے، مجھے
انہیں رنگے ہاتھوں پکڑنا ہے۔“ زہرہ کو تو دنگ رہ گیا
تھا۔ زہرہ کا جو احتجاج اس کی نظر میں تھا اس کی دھجیاں اڑ
رہی تھیں۔ وہ بھی اس کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔ شہرہ کے
سامنے کھڑے ہو کر اس نے غور سے اپنا چہرہ دیکھا،
اسے بے حد رونما آ رہا تھا، عفرات کی اتنی نفرت، فاطمہ کی
نظروں کی جھپٹ، یہ سب باتیں اس سے برداشت نہیں
ہو پا رہی تھیں، اس نے گہرا سانس لے کر پانی کے

چھٹنے منہ پر مارے تو جلتی آنکھوں کو کچھ سکون ملا۔ وہ باہر نکلی تو وہ سامنے سے آ رہا تھا۔ بے ساختہ دونوں کی نظریں ملی تھیں، صرف ایک لمحے کے لیے اور دونوں ہی نظروں کا زاویہ بدل کر آگے بڑھ گئے، ابھی وہ کوریڈور سے لنگی تھی جب ٹمرہ اور زوہیب اسے آتے دکھائی دیے۔ وہ حیران ہو کر انہیں دیکھنے لگی۔

”تم نے اتنی دیر کر دی تو نہیں آنا پڑا۔“ اس کے دیکھنے پر ٹمرہ جلدی سے بولی۔

”لیکن مجھے تو صرف بائچ منٹ لگے ہوں گے۔“ اس نے سنجیدگی سے ٹمرہ کو دیکھا۔

”خیر چھوڑو ان باتوں کو تم دونوں باہر چلو، میں آتی ہوں۔“ ٹمرہ ان دونوں کو جانے کا کہہ کر خود واش روم میں آ گئی، اس کا ارادہ آج فاطمہ سے بات کرنے کا تھا۔ ان دونوں کو ایک ساتھ آنا دیکھ کر عفرہ نے غصے سے بانی کا گلاس منہ سے لگا لیا۔

”یہ زہرہ کو کیا ہوا ہے۔“ اسے یوں جاتا دیکھ کر ٹمرہ کافی حیران ہوا تھا۔

”دشمنی کرنا کے دماغ خراب ہو گیا ہے۔“ عفرہ ایک ایک لفظ چاکر بولی تو ٹمرہ نے خود سے اسے دیکھا۔

”اور تمہیں کیا ہوا، تم نے بھی اس سے بات نہیں کی اور اس کی مٹھی پر بھی نہیں گئی تھیں اور اب وہ بھی ہمارے گھر نہیں آتی۔“

”یہ آپ مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہیں۔ وہ نہیں آتی، اس کی مرضی ہے۔“ اب ٹمرہ کو واقعی کسی گز بڑکا احساس ہوا تھا۔

”چلیں۔“ فاطمہ نے آتے ہی کہا تھا۔

”پیارا بھی تو آکس کریم کھاتی تھی۔“

”پیک کروا لیتے ہیں یا، میرا موڈ نہیں۔“

”اور میرا بھی دل نہیں چاہ رہا۔“ عفرہ نے فاطمہ کی شکل دیکھ کر کہا تو ٹمرہ نے کمری نظر سے دونوں کی سوچی ہوئی شکلوں کو دیکھا اور کھڑا ہو گیا۔ وہ پارکنگ کی طرف بڑھ رہے تھے، جب انہوں نے زہرہ اور زوہیب کو کار کے پاس کھڑے دیکھا۔ زوہیب کچھ

بول رہا تھا، جبکہ زہرہ کا چہرہ رونے والا ہو رہا تھا۔

”لگتا ہے زہرہ کے ساتھ کوئی پرالیم ہے۔“ ٹمرہ کو معاملہ عجیب لگا تھا۔

”وہ ان کا معاملہ ہے۔“ فاطمہ کے کہنے پر ٹمرہ نے عجیب سی نظروں سے اسے دیکھا۔

”ہوا کیا ہے تم دونوں کو۔“ اب کے وہ غصے سے بولا۔

”تم جینو، ہمیں دیر ہو رہی ہے۔“ کہنے کے ساتھ فاطمہ نے تیزی سے بیٹھ کر کار اسٹارٹ کر دی۔

”اوہ کدھر جا رہے ہو۔“ اب کے ٹمرہ کو فاطمہ پر واقعی غصہ آنے لگا تھا۔ ان دونوں کے قریب سے فاطمہ نے اتنی تیزی سے کار گزاری کہ اگر وہ دونوں تیزی سے پیچھے نہ ہٹتے تو یقیناً ایک آدھ زخمی ہو جانا۔

”اندھے ہو گیا۔“ اپنے پیچھے ان تینوں نے زوہیب کی عیسیٰ آواز سنی تھی۔

”فاطمہ تمہیں کیا ہوا ہے۔“ ٹمرہ نے چہرہ موڑ کر اس کا سخت چہرہ دیکھا۔

”مجھے کیا ہونا ہے۔“

”تم دونوں مجھ سے کچھ جھجکا رہے ہو۔“ اب کے ٹمرہ نے باری باری دونوں کا چہرہ دیکھا۔ عفرہ نے کار کا شیشہ نیچے کر کے منہ پوری طرح باہر کر لیا، جبکہ فاطمہ نے فل والیوم میں گانے لگا دیے تھے۔ ٹمرہ غصے سے بول رہا تھا، جبکہ وہ دونوں گونگے اور بہرے ہو گئے تھے۔

”تمہیں کوئی اور پسند تھا زہرہ! تو تم مجھے بتا سکتی تھیں۔“ کار کی طرف بڑھتے ہوئے وہ اپنے خیالوں میں غم تھی۔ جب اس نے زوہیب کی سنجیدہ آواز سنی، وہ رک کر اسے دیکھنے لگی۔

”یہ آپ سے کس نے کہا؟“

”تمہارا اسی ٹیوڈ ڈیٹا ہے۔“

”آپ مجھے غلط جج کر رہے ہیں، یہ بات آپ کتنی بار کہہ چکے ہیں، میں اس لیے نہیں بولی شاید آپ مذاق کر رہے ہیں، میں ہمیشہ سے ایسی ہی ہوں، بولی دیکھتی تھیں بھی میں ایسی تھی، اگر آپ کو یاد

ہو، آٹ ہمیشہ مجھے کبھی، آبی سے، کبھی اپنی کسی کزن سے کمپیئر کرتے ہیں، مجھے اچھا نہیں لگتا، مجھے جیسی نیچر اللہ نے دے کر پیدا کیا ہے، میں اسے بدل نہیں سکتی، کم گو ہوں، میری نیچر ہے، میں باتونی نہیں بن سکتی۔ سادگی میری نیچر میں ہے، میں فیشن ایبل نہیں بن سکتی۔ میں نے اچانک خود کو تبدیل نہیں کیا، آپ نے ایسے ہی دیکھ کر مجھے پسند کیا تھا۔“ وہ روہاسی ہو گئی تھی۔ اسے لگا اگر آج وہ نہ بولی تو کچھ غلط ہو جائے گا، لیکن شاید زوہیب مطمئن نہیں ہوا تھا۔

”لیکن ٹمرہ کا کہنا ہے تم کسی اور کو پسند کرتی ہو، وہ لڑکا جسے دیکھ کر تم پریشان ہو گئی تھیں اور جو تمہارے پیچھے بھی گیا تھا۔ شاید تم سے بات کرنے اور اس نے تمہیں پروپوز بھی کیا تھا۔“ زہرہ نے گہرا سانس لیا۔

”جانتی نہیں ٹمرہ کو اس سے کیا پیر تھا، اس کی زندگی تباہ کرنے پر تھی۔“

”ایسا کچھ نہیں، وہ میری دوست کے بھائی ہیں۔ انہوں نے مجھے پروپوز نہیں کیا۔ میری مٹھی آپ سے ہو چکی ہے، اس کا مطلب ہے میں نے آپ کو پسند کیا ہے۔“ زوہیب طنز پر انداز میں مسکراتا تھا۔

”یہ بات تم نے پہلے ہی بولی تو شاید میں خوشی سے ہانگ ہو جانا، لیکن اب میرا دل مطمئن نہیں ہو پارہا۔“

”آپ کو میری بات پر یقین نہیں۔“ زوہیب نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

”وہ تمہاری سگی بہن ہے، وہ کیوں جھوٹ بولے گی، کچھ تو ہے جو وہ یہ سب کہہ رہی ہے۔“ زہرہ نے ہائوس ہو کر سر جھکایا، اپنی طرف تیزی سے آتی گاڑی اسے دکھائی دی، لیکن وہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر اسے دیکھ کر اتنی حیران ہوئی کہ سوچنا بھول گئی۔

زوہیب نے بازو سے پکڑ کر اسے بھی پیچھے کیا اور خود بھی تیزی سے ہٹا تھا۔ گاڑی زن سے گزرنی تھی۔

”اندھے ہو گیا۔“ اس نے زوہیب کو جینتے سنا، جبکہ اس کے حواس سن ہو گئے تھے۔ فاطمہ اسے مارنا چاہتا تھا زوہیب کو۔

”کہاں چلے گئے تھے تم دونوں، کب سے

ڈھونڈ رہی ہوں۔“ اچانک ٹمرہ نے آ کر کہا، جبکہ وہ دونوں کچھ نہیں بولے۔ گاڑی میں مکمل خاموشی تھی، وہ تینوں اپنی اپنی سوچوں میں گم تھے۔ ٹمرہ کو انہوں سے ہوا تھا کہ وہ فاطمہ سے بات نہیں کر سکی۔ اب وہ سوچ رہی تھی کیسے وہ فاطمہ سے بات کرے۔

وہ کپڑے بدل کر باہر نکلی تو زہرہ ہاتھ ملکتی بیڈ پر بیٹھی اسی کا انتظار کر رہی تھی۔ اسے دیکھ کر زہرہ تیزی سے اٹھی۔ ”آپ کو کیا پرالیم ہے مجھ سے آپ! کیوں میری زندگی برباد کرنے پر تھی۔“

”اب کیا ہو گیا۔“ ٹمرہ نے غصے کے سامنے کھڑے ہو کر ٹمرہ بے زاری سے بولی۔

”آپ نے کیوں کہا زوہیب سے کہ فاطمہ بھائی نے مجھے پروپوز کیا۔ میں پسند کرتی ہوں انہیں، یہ مٹھی میری مرضی سے نہیں ہوئی۔“

”تو اس میں غلط کیا ہے ڈیئر۔“

”آپلی پلیز۔۔۔۔۔ میں آپ کے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں، بس کریں، میرا نہیں تو ما، بابا کا بھی سوچ لیں، انہیں تکلیف ہوئی۔“ ٹمرہ نے مسکرا کر اس کے جڑے ہاتھوں کو دیکھا اور رخ موڑ لیا۔

”تمہیں تکلیف میں دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوتی ہے زہرہ! جب تم فاطمہ کو دیکھتی ہو اور جو تکلیف تمہارے چہرے پر آتی ہے کچھ مجھے بہت سکون ملتا ہے۔“

”مجھ سے کسی یہ برداشت نہیں ہوتا کہ میرے سامنے کوئی تمہیں خوب صورت کہے، کوئی میری موجودگی میں تمہیں پسند کرے، تم کیا کہتی ہو زوہیب سے مٹھی ہو گئی، تم جیت گئیں، تم ہار گئی ہو زہرہ! اور تمہاری ہار میں میری جیت ہے۔“

”اتنی نفرت کیوں آپلی ابھی آپ کی سگی بہن ہوں، مجھے نہیں یاد پڑتا میں نے بھی جانے انجانے میں آپ کو تکلیف دی ہو، میں آپ سے بہت پیار کرتی ہوں، میں جانتی ہوں آپ ہر لحاظ سے مجھ سے بہتر ہیں۔“

”جانتی ہوتی ہے بات فاطمہ کو کیوں نہیں سمجھائی، یاد رکھو زہرہ! اگر فاطمہ نے مجھے قبول نہ کیا تو میں

جہاں زندگی کو بھی جہنم بنا دوں گی۔“ شرہ کی آنکھوں میں ایسا پتا نہیں کیا تھا کہ زہرہ وہیں محمد ہو کر رہی۔ یہ بے بسی اور لاچارگی کی انتہا تھی کہ اس کی آنکھ اب ڈراؤنے خواب سے کھلتی تھی اور جو آنکھ کھل جاتی تو پھر غینہ نہیں آتی تھی۔ شرہ کا خوف اس کے حواسوں پر سوار ہو گیا تھا۔ وہ جانتی تھی۔ فاطمہ کا جواب کیا ہوگا اور اس کے بعد شرہ کا رے ایکشن کیا ہوگا۔ یہ ہی سوچ سوچ کر اس کی راتوں کی نیندیں اور دن کا سگون ختم ہو کر رہ گیا تھا۔ اسے یہ بات مصفورہ کو بتانی چاہیے تھی، اس کے دل کا بوجھ کچھ تو کم ہو۔ صبح اس کی آنکھ دیر سے کھلی تھی۔ منہ دھو کر جب وہ نیچے آئی مصفورہ اور وقار کہیں جانے کے لیے تیار بیٹھے تھے۔

”آپ کہیں جا رہی ہیں ماما۔“ وہ ان کے سامنے بیٹھتے ہوئے پوچھنے لگی۔

”ہم گوجرانوالہ جا رہے ہیں۔ وقار کے دوست کی بچی کی شادی ہے۔“

”ماما اچانک، کل تو آپ نے ایسا کوئی ذکر نہیں کیا تھا۔“ وہ پریشان ہو کر بولی۔

”تو بیٹا اس میں پریشان ہونے والی کیا بات ہے، ہم رات تک واپس آ جائیں گے۔“ اب کہ

وقار نے مسکرا کر اسے دیکھا۔

”زینت ہے اور شرہ بھی یہیں ہے۔“ وہ کیا کہتی، خاموش ہو کر وقار کا چہرہ دیکھنے لگی۔

”چلو مصفورہ جلدی سے ریڈی ہو جاؤ، میں کار نکالتا ہوں۔“

”کیا بات ہے زہرہ، کوئی پریشانی ہے۔“ مصفورہ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔

”نہیں ماما۔“ وہ زبردستی سب ٹھیک ہے والی مسکراہٹ ہونٹوں پر لائی تھی۔

”وہ اچانک آپ کے جانے کا سنا تو تھوڑا سا پریشان ہوئی۔“

”میرا کوئی موڈ نہیں تھا بیٹا، پھر تمہارے پایا فورس کرنے لگے تو میں نے بھی سوچا صبح اتوار ہے، ہو ہی آتی ہوں، لیکن تم پریشان نہ ہو زینت یہیں

رہے گی اور شرہ کو صبح تو کیا ہے، لیکن آج اس کی کپڑی کی بھی تھوڑے سے وہ جائے گی، لیکن میں اسے فون کر دوں گی، وہ جلدی آ جائے گی۔“ شرہ گھر میں نہیں ہوئی، اس نے سکون کی سانس لیا تھا۔

”آپ اطمینان سے جائیں ماما، میں ٹھیک ہوں۔“ وہ اب مسکرا کر بولی۔

”لو کہ بیٹا۔۔۔ اللہ حافظ۔“ وہ اس کا ہاتھ چوم کر باہر نکل گئیں۔ مصفورہ اور وقار کے جاتے ہی اس نے

سارے ہاتھ روم سے حیران کی بو میں نکال کر باہر نالی میں بہا دی اور پھر مطمئن ہو کر بچن میں آ گئی، آج اس کا ارادہ ہوئی کئی ڈش خزانہ کرنے کا تھا۔

پرفیوم کی خوش گوار مہک پر اس نے سر گھما کر سٹریٹوں کی طرف دیکھا، جہاں اپنی بھرپور تیاری کے ساتھ شرہ نیچے اتر رہی تھی۔

”میں جا رہی ہوں، اتنے ہوئے دیر ہو جائے گی۔“ اس نے زہرہ کو اطلاع دی تھی۔

”ٹھیک ہے۔“ شرہ نے کچھ حیرت سے اسے دیکھا، جو کافی مطمئن تھی۔ حالانکہ اس کے خیال کے مطابق اسے پریشان ہونا چاہیے تھا۔

”تم کیا کر دوں گی اتنی دیر۔“ شرہ نے موبائل چیک کرتے ہوئے سرسری انداز میں پوچھا۔

”کچھ خاص نہیں، فی وی دیکھو گی اور پھر سوچاؤں گی، آپ کتنی دیر تک آئیں گی؟“

”پتا نہیں، میرا انتظار نہ کرنا، میں گیٹ کی دوسری چابی لے کر جا رہی ہوں۔“ وہ کہہ کر باہر نکل

گئی تو زہرہ نے گہرا سانس لے کر سر موڑ لیا۔

”آئی کھانا لگا دیں، کچھ ہم دونوں اچھی سی چائے پیتے ہیں۔“ اس نے بچن کی طرف ہانک

لگا کر زینت سے کہا تھا۔ فی وی دیکھتے دیکھتے بھی اب وہ بور ہونے لگی تھی۔ زینت آنکھیں کب کی وہیں

کارپٹ پر میٹرس پچھا کر سو گئی تھیں، وہی پورے گھر میں بے چینی سے گھوم رہی تھی، بارہ بجتے والے تھے،

نہ شرہ آئی تھی اور نہ ہی مصفورہ اور وقار۔ اس نے پہلے شرہ کا نمبر ڈائل کیا۔ اس کا موبائل بند جا رہا تھا۔ اس

کا جھلکا کر مصفورہ کا نمبر ٹرائی کیا۔ وہاں نیل جا رہی تھی، لیکن وہ فون نہیں اٹھا رہی تھیں، پھر اس نے

وقار کا نمبر ڈائل کیا، وہاں بھی نیل جا رہی تھی۔

”ذرا بھی خیال نہیں ان لوگوں کو میرا۔“ وہ بڑبڑاتی ہوئی پریشانی سے بھرنے لگی۔ دس منٹ بعد اس کے موبائل پر نیل بھی تھی۔ وقار کا نمبر تھا۔

”شکر ہے اللہ کا۔“ اس نے کہتے ہوئے جلدی سے فون آن کیا۔

”ہیلو پاپا۔“ وہ تیزی سے بولی۔

”ہیلو بیٹی۔۔۔ میں اسپیڈ ٹو از بات کر رہا ہوں۔“

”جی۔“ وہ پریشان ہو کر بولی۔

”آپ کون بات کر رہی ہیں؟“

”نہیں۔۔۔ یہ میرے پاپا کا فون ہے۔“ وہ ہچکا کر بولی۔

”دیکھیے یہاں ہائی دے پر گاڑی کا ایکسیڈنٹ ہوا ہے، جس میں ایک عورت اور ایک آدمی تھے۔“

زہرہ کی سانس ”تھے“ میں ہی ایک لگی تھی۔

”یہ فون اسی آدمی کی جیب سے نکلا ہے، آخری کال آپ کی تھی۔“

”وہ دونوں اب کہاں ہیں۔“ وہ بمشکل بولی تھی۔

”یہاں قریبی اسپتال میں انہیں ایڈمٹ کروا دیا ہے۔“ اس نے اسپتال کا نام بتایا۔

”آپ جلدی سے آ جائیں۔“

”جی۔“ اس نے فون رکھا تھا اور زمین پر بیٹھ کر اونچی آواز میں رونے لگی، زینت ایک دم گھر اکر آ گئی تھی۔

”بے بی کیا ہوا ہے بی۔“ وہ حواس باختہ ہو کر اس کی طرف بڑھی۔

”آئی ماما، پاپا کی گاڑی کا ایکسیڈنٹ ہو گیا۔“

”ہائے میرے ربا۔“ زینت نے بے اختیار اپنے دل پر ہاتھ رکھا تھا۔

”نہیں جانا ہے آئی۔“ وہ آنسو صاف کرتی تیزی سے کھڑی ہوئی۔

”کیسے جائیں گے بچے، شرہ بیٹی بھی گھر میں

نہیں۔ زینت بھی پریشانی سے اس کا چہرہ دیکھنے لگیں، وہ کانپتی انگلیوں سے شرہ کا نمبر ڈائل کرے لگی، لیکن اس کا نمبر ابھی بھی بند تھا۔

”آئی آئی! آپ کا نمبر بند ہے، اب کیا کروں۔“

”وہ رورہو کر بے حال ہو رہی تھی۔“

”بیٹا یہ وقت ضائع کرنے کا نہیں، اس وقت ہمارے ساتھ کسی مرد کا ہونا بہت ضروری ہے، ایسا

کر دے سامنے سے کسی کو بلاؤ، زہرہ رک کر زینت کو دیکھنے لگی۔ اور دوسری نظر گھڑی پر ڈالی ساڑھے بارہ

ہور ہے تھے۔

”بیٹا کچھ مت سوچو، جلدی جاؤ۔“ وہ بھی ایک لمحہ

ضائع کیے بغیر باہر کی طرف بھاگ گئی۔ اس نے نیل پر ہاتھ رکھا، ڈور تک آواز سنائی دی تھی۔ دو منٹ بعد

اس نے پھر نیل دی تھی۔ ساتھ ساتھ وہ اضطرابی انداز میں چکر بھی لگا رہی تھی، کچھ دیر بعد اسے فی وی

لاؤنچ کا دروازہ کھلنے کی آواز آئی تھی۔ اس نے تیزی سے نکلتے آنسو صاف کیے گیٹ کھولنے والا فاطمہ تھا۔

اس کو یوں آدھی رات کو آنسو سے تر چہرہ لیے دیکھ کر وہ پہلے حیران اور پھر پریشان ہو کر دیکھنے لگا۔

”کیا ہوا ہے۔“ فاطمہ نے اس کے پیچھے کھلے گھر کے گیٹ کو دیکھ کر پوچھا۔

”وہ ماما، پاپا کی گاڑی کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے، وہ دونوں اسپتال میں ہیں، اگر سفیان اگلے ہیں تو

پلیز انہیں جگا دیں۔“ وہ اس کے سامنے رونا نہیں چاہتی تھی، پر آنسوؤں پر جیسے اسے قابو نہیں رہا تھا۔

”گھر میں کوئی نہیں، سب اسلام آباد آ گئے ہیں۔ زہرہ کے آنسوؤں میں مزید تیزی آ گئی تھی۔

اس نے نظریں اٹھا کر اس کا چہرہ دیکھا، فاطمہ نے گہرا سانس لیا۔

”گھر لاگ کرلو، میں کپڑے چننے کر کے آتا ہوں۔“ وہ اس کی نظروں کی زبان سمجھ گیا تھا۔ وہ تیزی سے بھاگ گئی، زینت پہلے سے تیار بیٹھی تھی۔

”آئی آئی! لاگ کرتے ہوئے اس نے زینت سے پوچھا۔

”چھوڑو بیٹا، جس ذمہ داری کا اس نے ثبوت دیا ہے اس کے بعد اسے بتانے کا کوئی فائدہ ہے جو ان جہان لڑکی رات کے ایک بجے تک گھر سے باہر ہے اور سے موبائل آف، حد ہوتی ہے۔“ زینت آنٹی کو پریشانی میں اور غصہ آ رہا تھا۔ فاطر نے گاڑی باہر نکال کر اپنا گیت لاک کیا۔

”آنٹی آپ آگے بیٹھ جائیں۔“ ان دونوں کو آتا دیکھ کر فاطر نے کہا تو زہرہ اس کی لمبی چوڑی پشت دیکھ کر رہ گئی۔

”بہت مہربانی بیٹا اور بڑی معذرت چاہتے ہیں اتنی رات کو ہمیں تکلیف دی، پر کیا کرتے، ہم لوگوں کے علاوہ اور ان کا یہاں ہے بھی کون۔ اگر ابھی نہ جاتے تو اس بے چاری بچی نے رو رو کر خود کو لپکان کر لیتا تھا اور وہ بڑی اس کا تو کچھ پتا نہیں، آدھی رات کو کہاں ہے۔“ زینت آنٹی کو بولنے کا موقع ملا تھا، تو وہ بس شروع ہو گئی تھیں، جبکہ وہ پیچھے دیعا میں پڑھنے کے ساتھ مسلسل ٹمرہ کا نمبر بھی ملا رہی تھی۔ وہ مطلوبہ اسپتال پہنچے تو رات کے ڈھائی بج رہے تھے۔ صفورہ اور وقار کو کافی چوٹیں آئی تھیں۔

ان کی حالت دیکھ کر اسے خود پر قابو نہیں رہا تھا۔

”بے بی یوں نہیں روتے، اللہ کا شکر ادا کرو اس نے دونوں کی زندگی رکھ لی۔ زینت اسے ساتھ لگائے حوصلہ دینے لگیں، لیکن اس کو کسی پل قرار نہیں تھا۔ وہ دونوں اس وقت بے ہوش تھے۔

”آپ ان کے ساتھ ہیں۔“ نرس نے اس کے قریب آ کر پوچھا، تو اس نے سر اثبات میں ہلایا تھا۔

”ہاں رنیشن یہ کچھ فارمیسیز پوری کرنی ہیں اور ملے کر رہے، تاکہ ان کو روم میں شفٹ کیا جاسکے۔ نرس تو کہہ کر چلی گئی، لیکن وہ پریشان ہو کر زینت کا منہ دیکھنے لگی۔ گھر سے نکلنے وقت وہ اتنی پریشان تھی کہ اسے خیال ہی نہیں رہا کہ پیسوں کی ضرورت بھی پڑے گی۔

”پیسے نہیں لائیں؟“ زینت اس کا چہرہ دیکھ کر سمجھ گئی۔

”ہوش آیا انکل آنٹی کو؟“ تب ہی فاطر اندر آیا تھا۔

”نہیں بیٹا ابھی نہیں، وہ نرس کہہ کر گئی ہے کچھ پیسے ادا کرنے ہیں، لیکن بے بی پیسے لاتا بھول گئی ہے۔“ زہرہ کو اس وقت بے حد شرمندگی محسوس ہوتی تھی۔ وہ نظریں اٹھانے کے قابل نہیں رہی۔

”آپ پریشان نہ ہوں، میں سب کچھ کر دوں گا، میں باہر ہی ہوں، کوئی چیز چاہیے ہو مجھے بتا دیجیے گا، ویسے میں نے فخر کو بھی فون کر دیا ہے، وہ بھی صبح پہنچ جائے گا۔“

”تمہاری بہت مہربانی بیٹا۔ تم تو ہمارے لیے مہربان فرشتہ بن کر آئے ہو، اللہ تمہیں ہمیشہ خوش اور آباد رکھے۔“ آنٹی کی دعاؤں کا سلسلہ طویل ہو گیا تو وہ رخ موڑ کر ماں، پاپا کو دیکھنے لگی۔ صبح کیسے ہنستے مسکراتے گئے تھے اور اب کیسے زخموں میں چور پڑے تھے۔ اس کے ہاتھوں میں پکڑا فون بچنے لگا۔ اس نے چونک کر اسکرین کی طرف دیکھا، انجان نمبر تھا۔

”میں لاہور ماڈل ٹاؤن تھانے سے بات کر رہا ہوں۔ ٹمرہ وقار ٹائی لڑکی ہمارے پاس ہے۔ کیا آپ اسے جانتی ہیں۔“ زہرہ کو لگا اسپتال کی چھت اس کے سر پر آ گری ہے، وہ ایک دم لڑکھرائی تھی۔ کسی سہارے کے لیے اس نے ہاتھ بڑھایا۔ فاطریات تو زینت سے کر رہا تھا پر اس کی نظریں اسی پر تھیں، اس نے زہرہ کے چہرے کے بدلتے رنگ اور پھر اسے لڑکھراتے دیکھا تو تیزی سے اس کی طرف بڑھا۔ زہرہ کو لگا وہ بہت زور سے گرے گی، لیکن کسی نے بڑی مضبوطی سے اسے تھام لیا تھا۔ اس نے زور سے آنکھیں بند کر کے کھولیں، تاکہ نظروں کے سامنے کا اندھیرا چھٹ جائے اور اندھیرا چھٹنے ہی فاطر کا چہرہ اسے قریب سے نظر آیا کہ وہ بے اختیار رینگ کر اس کے بازوؤں سے لٹکی۔

”کیا ہوا بے بی۔“ زینت بھی حواس باختہ ہو کر اس کے قریب بیٹھ گئیں، لیکن وہ کچھ کہنے کے

بجائے دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رونے لگی۔ فاطر نے اس کے ہاتھ سے فون لے کر کان سے نکال دیا۔ دوسری طرف سے جواسے کہا گیا وہ اسے بھی پریشان کرنے کے لیے کافی تھا۔

”اوکے، میں آتا ہوں۔“

”کیا ہو گیا بیٹا۔“

”آنٹی! ٹمرہ پولیس اسٹیشن میں ہے۔“

”اللہ۔“ زینت دل تھام کر بیٹھ گئی، آج تو لگتا تھا حد صدموں کا دن تھا۔

”پر کیوں بیٹا۔“ زہرہ کے دل کا سوال زینت نے کیا تھا۔

”وہ اپنی دوستوں کے ساتھ ڈرگ لیتی ہوئی پکڑی گئی ہے۔“

”تو یوب۔“ زینت نے باقاعدہ اپنے گال پیٹے۔

”بے لڑکی تو اپنے ماں باپ کے لیے وبال ہے۔“ انہوں نے کہتے ہوئے انہوں نے زہرہ کو اپنے ساتھ لگا لیا۔ حجاب گھٹنوں میں سر دبے سک رہی تھی۔

”بس۔۔۔۔۔ بچی تو رو رو کر خود کو لپکان کر رہی ہے۔ ماں باپ کی زندگی تندرستی کے لیے دعا کر۔“

پھر جو کوئی کسی کے لیے برا چاہتا ہے اللہ پھر اسے اسی برائی میں ملوث کر دیتا ہے۔ ٹمرہ، زہرہ کو کلتا تلک کرتی تھی یہ تو سب جانتے تھے۔

”آنٹی آپ اس کا دھیان رکھیں۔ میں نے فخر کو فون کر دیا ہے وہ بھی صبح تک پہنچ جائے گا۔ میں پولیس اسٹیشن جا رہا ہوں۔“

”جنگ جیو بیٹا۔“ فاطر نے ایک نظر اس کے ہاتھ و جود پر ڈالی اور تیزی سے مڑ گیا۔

صفورہ اور وقار کو ہوش آ گیا تھا اور انہیں پراسیوٹ کمرے میں منتقل کر دیا گیا تھا۔

”زہرہ اس طرح رو کر تم مجھے پریشان کر رہی ہو، دیکھو میں اور تمہارے پاپا اب ٹھیک ہیں۔“ صفورہ نے اس کے بال سہلائے جو ان کے سینے پر سر رکھے کب سے سک رہی تھی۔

”زہرہ! وقار کی آواز پر اس نے سر اٹھایا۔

”جی ہاں۔“ وہ کھڑی ہو گئی تھی۔

”ہم ٹھیک ہیں، بیٹا اب روتا بند کرو، شاہاش۔“ زہرہ نے ہاتھوں سے اپنی آنکھوں اور گالوں کو صاف کیا تھا۔

”ٹمرہ نظر نہیں آ رہی۔“ وقار کے سوال پر اس نے بوکھا کر زینت کو دیکھا۔

”وہ آنے والی ہے بھائی صاحب، دفتر ہوتا ہے نا اس کا وہاں اطلاع دینی بھی ضروری تھی۔“

”اجھا۔“ وہ دوبارہ آنکھیں بند کر کے لیٹ گئے۔

”السلام علیکم۔“ سلام کر کے اندر داخل ہونے والا فخر تھا۔ اس کے پیچھے ایک خوب صورت سی لیدی ڈاکٹر بھی تھی۔

”کیسی ہیں آنٹی۔“

”ٹھیک ہوں بیٹا، تم یہاں کیسے۔“

”مجھے فاطر کا رات کو فون آیا تھا، ہم اسلام آباد میں تھے۔ اطلاع ملتے ہی میں سیدھا دوسرے آ گیا۔“ صفورہ نے منمن نظروں سے اسے دیکھا۔

”بیٹا میں تمہارا اور فاطر کا احسان کیسے چکا سکوں گی، مجھے زینت نے بتایا کیسے آدھی رات کو وہ بچہ اپنی نیند خراب کر کے یہاں آیا، پر وہ مجھے نظر نہیں آیا۔“ فخر نے بھی سوالیہ نظروں سے زہرہ کو دیکھا تو وہ نظریں جم کر خواہ تو وہ وقار کی دوا میں دیکھنے لگی۔

”یہ کون ہے۔“ صفورہ نے خاموش کھڑی اس لڑکی کے بارے میں پوچھا۔

”آنٹی یہ طوطی ہے، میری کو لیگ، میں نے اسے تیار کیا کہ میرے انکل، آنٹی اسپتال میں ہیں، تو یہ بھی آپ کی عیادت کے لیے آ گئی۔“

”شکریہ بیٹا آپ کا۔“ صفورہ نے مسکرا کر اسے دیکھا۔

”پلیز آنٹی، مجھے شرمندہ مت کریں، فخر آپ سب کا خاص طور پر زہرہ کا بہت ذکر کرتے ہیں، تو میں نے سوچا آپ لوگوں کی عیادت کے ساتھ میں زہرہ سے بھی مل لوں گی۔“ زہرہ نے حیرت سے فخر کو

دیکھا، جو اس کی حیرت و کچھ کر مسکرا دیا تھا۔
 ”السلام علیکم!“ کی آواز پر سب نے
 دروازے کی طرف دیکھا، جہاں سفیان، صائمہ اور
 عفر اکھڑے تھے۔

”آپ لوگوں نے تو ڈراما دیا بھی۔“ سفیان
 نے ہاتھ میں پچڑی باسکٹ نیل پر رکھتے ہوئے کہا۔
 ”اتنی رات کو سفر کرنے کی کیا ضرورت تھی
 صفورہ۔“ صائمہ نے ان کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔
 ”مجھے زہرہ کی فکر تھی، وہ اکیلے میں ڈرتی ہے،
 اسی لیے رات کو نکل پڑے۔“ جبکہ زہرہ ان کے
 بجائے عفر اکھڑے کی طرف توجہ دے کر کہتی تھی۔
 ”اس کے لیے اب مشکل ہو رہا تھا۔ اس نے
 نظریں گھما کر زہرہ کو دیکھا جو آنکھوں میں آنسو لیے
 بڑی آس سے اسے دیکھ رہی تھی۔ عفر اکھڑے صرف ایک
 لمحہ لگا تھا اگلے لمحے وہ زہرہ کے گلے لگ گئی۔

”یہ تم دونوں کو کیا ہوا ہے، ایسے گلے لگ کر رو
 رہی ہو جیسے کب کی پچھڑی ہو۔“ عفر نے مذاق کیا تھا،
 لیکن وہ دونوں اتنا جاتی تھیں، وہ کب کی پچھڑی ہیں۔

☆☆☆

”جینکس کرم آگئے۔ اتنی گندگی تھی وہاں، تو
 آرہی تھی مجھے۔“ گاڑی میں بیٹھے ہی شمرہ نے بالوں
 میں برش کرتے ہوئے پڑی اداس فاطمہ کو دیکھا۔
 ”مجھے امید نہیں تھی تم آؤ گے۔“ اسے مسلسل
 خاموش دیکھ کر وہ بار بار بولی۔

”تم بات کیوں نہیں کر رہے۔“ آخر اس سے
 رہا نہیں گیا تو وہ منہ بنا کر بولی۔

”مجھے ایسا کیوں لگ رہا ہے، تمہیں اپنے
 کروٹوں پر کوئی شرمندگی نہیں۔“

”واٹ کر تو۔“ وہ ایک دم بھڑک کر بولی۔
 ”ان لوگوں کو غلط فہمی ہوتی تھی۔“

”یہ تو غلط فہمی تھی، لیکن آدھی رات کو تمہارا باہر
 رہنا یہ بھی غلط فہمی ہے، کیا شریف لڑکیوں کو زیب دینا
 ہے کہ وہ ایک رات پولیس اسٹیشن میں گزاریں۔“
 اب کے شمرہ کو گڑبگڑ کا احساس ہوا تھا۔

”ایسا پہلی بار ہوا ہے، میں تو کبھی رات کو باہر
 نکلی ہی نہیں اور میری دوستیں ایسی ہیں، مجھے ہتھی
 نہیں تھا۔“ وہ ایک دم بھولی بن کر بولی، لیکن فاطمہ
 نے کوئی جواب نہیں دیا۔

”یہ راستہ گھر کو تو نہیں جاتا۔“ وہ ارد گرد دیکھتے
 ہوئے بولی۔

”ہم اسپتال جا رہے ہیں۔“
 ”کیوں۔“ وہ تیزی سے بولی۔

”انفلو، آنٹی کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔“
 ”کب۔“ وہ حیرت سے بولی۔

”جب تمہارا فون آف تھا۔“ وہ طنز کرنا نہیں
 چاہتا تھا، پر اسے اس لڑکی کی بے بسی پر غصہ آ رہا تھا۔

”وہ اب ٹھیک ہیں۔“
 ”جی نہیں، میں تمہیں لینے آ گیا تھا۔“

”یعنی اس کو میری فکر ہے۔“ وہ دل میں
 مسکرائی، اپنے آگے اسے اپنے ماں، باپ کی

خیریت کی بھی پروا نہیں تھی۔
 ”مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔“

شمرہ نے چہرہ اس کی طرف گھما کر کہا۔
 ”زہرہ نے تم سے بات کی ہوگی؟“

”کون سی بات؟“ وہ سیدھا دیکھتے ہوئے
 بولا۔ شمرہ کو اس کی بے نیازی پر غصہ تو بہت آیا، پر اس

وقت وہ غصہ نہیں کر سکتی تھی۔
 ”یہی کہ میں تمہیں پسند کرتی ہوں اور تم سے

شادی کرنا چاہتی ہوں۔“ فاطمہ کا باؤں بے ساختہ
 پر یک پر گیا تھا۔ وہ اچانک جھٹکے کے لیے تیار نہیں

تھی۔ اس کا سر سیدھا ڈش بورڈ سے ٹکرایا۔
 ”واٹ ریش۔“ وہ سر پکڑ کر چیخی۔

”سہی میں کہنے والا تھا واٹ ریش۔“ اب
 کے فاطمہ نے ماتھے پر ہل ڈال کر اسے دیکھا۔

”ریش۔“ یہ نہیں ریش لگ رہا ہے، ایک
 لڑکی خود تمہیں پروپوز کر رہی ہے، وہ بھی اتنی خوب

صورت لڑکی۔“
 ”تم سے کس نے کہا، تم خوب صورت ہو، خوب

صورت وہ ہوتا ہے جس کا باطن بھی خوب صورت ہو،
 جبکہ تم ایک تہیہ خود پسند اور غلیظ لڑکی ہو، جس کو کم از کم
 میں تو بالکل پسند نہیں کر سکتا اور شادی نہ کرو۔“ کہہ کر اس
 نے کارائٹ کر دی، اب کی بار اس کی اسپینڈ بہت تیز

تھی۔ وہ جلد از جلد اس سے نجات چاہتا تھا۔
 ”تو تمہارے نزدیک خوب صورت کون

ہے۔“ کچھ دیر بعد اس نے شمرہ کی آواز سنی۔
 ”میں تمہیں بتانا ضروری نہیں سمجھتا۔“

”لیکن میں جانتی ہوں تمہارے نزدیک زہرہ
 خوب صورت ہے۔ مگر بڑے افسوس کا مقام ہے

تمہارے لیے کہ اس نے تمہیں رجحان کر کے کسی
 اور کو پسند کر لیا۔“ شمرہ نے اسے اشتعال دلانے کے

لیے طنز یا انداز اختیار کیا تھا۔ وہ خاموش رہا تھا۔
 ”تم لو زہرہ۔“ وہ دوبارہ بولی، لیکن اس بار بھی

وہ ری ایکٹ کیے بغیر کار چلاتا رہا۔ اسپتال کے
 سامنے اس نے کار روکی۔

”آؤٹ۔“ اس ایک لفظ میں اس کے لیے اتنی
 حقارت تھی کہ اسے کچھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کر

ڈالے، وہ بہت غصے میں کار سے اترتی تھی۔ کار پڈور
 میں چلتے ہوئے اس نے زہرہ کی کامبر ڈال کیا تھا۔

”ہیلو زہرہ، شمرہ بات کر رہی ہوں۔“
 ☆☆☆

عفر اکھڑے کی ناراضی ختم ہوئی تو اسے لگ رہا تھا
 جیسے سب صبح ہو گیا، شمرہ کا ڈور بھی جیسے کہیں جا سویا

تھا۔ اپنی خوشی میں اس نے شمرہ کا عجیب انداز نوٹ بھی
 نہیں کیا۔ صفورہ اور وقار کو ڈس چارج کر دیا گیا تھا۔ وہ

ان کی چیزیں سمیٹ رہی تھی جب گھر اندر آیا۔
 ”وہ واٹ روم گئی ہیں۔“

”لچک ہے، میں پارکنگ میں انتظار کر رہا
 ہوں، تم آنٹی کو لے آنا، سامان یہیں چھوڑ دو فاطمہ

آ رہا ہے، وہ لے آئے گا۔“
 ”جی۔“ وہ سر ہلا کر باقی چیزیں اکٹھی کرنے

لگی۔ دروازہ بند ہونے پر اس نے سرسری نظر پیچھے
 ڈالی، جہاں شمرہ بازو پیچھے موڑے دروازے سے

نیک لگائے کھڑی تھی۔

”آئی آپ کی نہیں۔“ وہ صفورہ کی چادر طے

کرتے ہوئے اسے دیکھنے لگی۔
 ”چانے کی باری تمہاری ہے۔“ چادر طے کرتا

زہرہ کا ہاتھ وہیں رک گیا تھا۔ شمرہ دو قدم چل کے
 آگے آ گئی تھی۔

”میں نے تم سے کہا تھا اگر تم نے مجھ سے جھوٹ
 بولا یا فاطمہ نے مجھ سے شادی کرنے سے انکار کیا تو میں

تمہاری زندگی جہنم بنا دوں گی۔“ اس کی آنکھوں میں اتنی
 نفرت تھی کہ زہرہ گھبرا کر پیچھے ہٹنے لگی۔

”آئی پکیز میری بات نہیں، اس میں میرا کوئی
 قصور نہیں۔“

”قصور صرف تمہارا ہی ہے۔ فاطمہ کو لگتا ہے تم
 خوب صورت ہو۔“ وہ اس کی طرف انگلی اٹھا کر بولی۔

”تم ساری عمر مجھ سے پیچھے رہیں اور اچانک
 سب کو گلے لگا ہے تم خوب صورت ہو، زہرہ بی بی نے

تمہیں پسند کیا، فاطمہ نے تمہیں پسند کیا، حالانکہ میں
 تم سے زیادہ خوب صورت ہوں، پھر کوئی مجھے چھوڑ کر

تمہیں کیسے پسند کر سکتا ہے۔“ ماما کی اچھی بیٹی صرف تم
 ہو اور میں، میں کچھ نہیں، پاپا کو مجھ سے پیار تھا، وہ بھی

اب تم سے پیار کرنے لگے ہیں۔ تم میری بار ہو اور
 ہارنا مجھے پسند نہیں، یہ جو تمہارا چہرہ ہے نا میں اسے اتنا

بھیا تک بنا دوں گی، سب تم سے نفرت کریں گے۔“
 وہ بازو آگے کرتے ہوئے بولی۔ اس کے ہاتھ میں

تیزاب کی بوتل تھی۔ دہشت کے مارے زہرہ کی
 آنکھیں پھیل گئی تھیں۔

”آئی پلیز۔“ اسے بڑھتا دیکھ کر وہ بری طرح
 چیخنے لگی تھی۔

”زہرہ۔“ اس کی آواز سن کر صفورہ گھبرا کر
 واٹ روم سے نکلی تھیں۔

”یہ کیا ہو رہا ہے۔“ انہوں نے حیرت سے
 دونوں کو دیکھا۔

”ماما پلیز۔“ مجھے بچالیں، آئی مجھے تیزاب
 سے جلانا چاہتی ہیں۔“ حیرت کے مارے صفورہ کا

منہ کھل گیا تھا۔
”دماغ ٹھیک ہے تمہارا شمرہ، پاگل تو نہیں ہو گئیں۔“ صفورہ جلدی سے آگے بڑھیں۔
”وہیں رک جائیں ماما، ورنہ میں آپ کا بھی لحاظ نہیں کروں گی۔“ اس نے بوتل کا ڈھکن کھولتے ہوئے کہا۔

”شمرہ میری بیٹی! پاگل نہ بنو، ایسے بھی کوئی کرتا ہے، یہ تمہاری بہن ہے۔“
”نہیں ہے یہ میری بہن۔“ صفورہ بھاگنے کے انداز میں آگے آئیں تو شمرہ نے بوتل کو باکسا جھٹکا دیا۔ تیراب اچھل کر باہر آیا تھا۔ صفورہ اپنی جگہ ساکت ہو کر رہ گئیں، جبکہ زہرہ بری طرح چپختے لگی تھی۔ دروازہ ایک جھٹکے سے کھلا تھا۔ فاطمہ نے حیرت سے اندر کے منظر کو دیکھا۔

”فاطمہ پکڑو اسے، اس کے ہاتھ میں ایسٹڈ ہے۔“ فاطمہ نے ایک لمحہ ضائع کیا، بغیر اسے بازوؤں سے مضبوطی سے تھام لیا۔

”چھوڑ دیجئے، میں نہیں بھی جلا دوں گی۔“
اس کی گرفت سے خود کو چھڑانے کے لیے بری طرح چپختے لگی۔ صفورہ نے تیزی سے آگے بڑھ کر زوردار چھڑ شمرہ کے منہ پر جڑ دیا۔ اس کو جیسے اسٹاپ لگ گیا تھا۔ صفورہ نے اس کے ہاتھ سے بوتل ہٹائی جاتی، تب ہی وہ ایک بار پھر کھلی، تیراب اچھل کر اس کی ٹانگ اور بازوؤں پر ہتلا گیا۔ اس کے منہ سے دل خراش چیخ نکلی تھی اور فاطمہ نے بے ساختہ اسے چھوڑا تھا۔ وہ اب زمین پر گر کر بری طرح تپ رہی تھی۔ صفورہ بے تاب ہو کر اس کی طرف بھٹکیں، جبکہ فاطمہ گھبرا کر باہر ڈاکڑ کو بلائے بھاگا تھا۔ آکھیں اور منہ کھولے زہرہ جیسے ساکت ہوئی اور اگلے ہی بل وہ زمین پر ڈھیر ہوئی گی۔

☆☆☆

”ان دونوں نے مجھے میری بہن کے آگے منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑا۔“ صائمہ نے ناراض نظروں سے سامنے بیٹھے خن اور فاطمہ کو دیکھا۔

”یہ کوئی زبردستی والی بات تو نہیں صائمہ! بچوں کی زندگی کا سوال ہے۔“ سفیان نے شہتہ سے لہجے میں انہیں سمجھانے کی کوشش کی۔

”کیا آپ پوچھ سکتے ہیں انہوں نے ایسا کیوں کیا؟“ سفیان صاحب نے خن کو بولنے کے لیے آنکھ سے اشارہ کیا۔

”ماما اس دن اسپتال میں..... میں نے آپ کو طوبی سے ملوایا تھا، میں اس کو پسند کرتا ہوں۔“
”دیکھا دیکھا آپ نے۔“ صائمہ نے غصے سے سفیان کو دیکھا۔

”ریلیکس صائمہ۔“ سفیان نے ہاتھ اٹھا کر انہیں روکنا۔

”دیکھو صائمہ اس میں کوئی حرج نہیں، طوبی سے میں ملتا ہوں، وہ ابھی لڑکی ہے۔ ڈاکٹر ہے اور اچھی طبیعت سے ہے اور کیا چاہیے نہیں اور سب سے ضروری بات تمہاری بھانجیوں کی بات طے ہوگئی ہے، پھر کیوں تم اپنے بچے کی خوش خراب کرنا چاہتی ہو۔“

”میری بہن ناراض رہے گی، مان جائے گی، تم بس اپنے بچوں کی فکر کرو، ہم کل ہی جائیں گے، طوبی کے گھر رشتہ لینے کے لیے..... کیوں خن ٹھیک ہے۔“ انہوں نے مسکرا کر خن سے پوچھا، جس نے انگوٹھے سے انہیں تھینک دیا تھا۔

”اب جب آپ باپ بیٹے فیصلہ کر چکے ہیں تو میری ہاں ناکی کیا ضرورت ہے۔“

”ماما آپ کی مرضی میرے لیے بہت اہم ہے۔“ خن نے انہیں بازو کے گھیرے میں لیا تو وہ کچھ بول نہیں سکیں۔

”اب اس سے بھی پوچھ لیں نفیقہ اس نے بھی کوئی پسند کر رکھی ہوگی۔“ انہوں نے فاطمہ کی طرف اشارہ کیا جو سر جھکائے کسی سوچ میں گم تھا۔

”فاطمہ بولو یا..... اچھا موافق ہے، چپ رہے تو پھر ماں کی پسند پر ساری عمر گھٹنا پڑے گی۔“ سفیان نے مذاق کیا تھا، وہ سر اٹھا کر انہیں دیکھنے لگا۔

”نی اٹال آپ خن کے بارے میں سوچیں۔“
یہ کہہ کر وہ اٹھ گیا تھا۔

☆☆☆

جب وہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی تو ذویبب اور اس کی والدہ خاموش سر جھکائے بیٹھے تھے۔ وہ سلام کرتی ہوئی ان کے سامنے بیٹھ گئی۔ اس نے پریشان نظر اپنے ماں باپ کے اترے ہوئے چہروں پر ڈالی۔

”ہم نے بہت چاہت سے یہ رشتہ کیا تھا۔“ ذویبب کو گلہ تھا زہرہ جیسی لڑکی شاید ہی اس دنیا میں ہو، لیکن ہمیں معلوم نہیں تھا کہ آپ نے اپنی بیٹیوں کی ایسی پرورش کی ہے۔“

”ایک بیٹی آپ کی ڈرگ کیس میں حوالہ تہہ کر آئی ہے۔ دوسری کا کسی اور سے چکر ہے اور حد تو یہ کہ آپ لوگ انہوں کو ہی تیراب سے جھلسا دیتے ہیں، ہمیں تو آپ لوگ معاف رہیں۔ ہم شریف لوگ ہیں۔“ ذویبب کی والدہ نے غصے سے ان تینوں کو دیکھا۔

”آپ لوگ غلط سمجھ رہے ہیں۔“ زہرہ کو ہی ہمت کر کے بولنا پڑا۔

”ابھی بھی تم میں اتنی ہمت ہے زہرہ! کہ تم ہمیں غلط کہو، میں خود گواہ ہوں تمہارے رویے کا اگر واقعی تم اس منگنی سے خوش ہو تیں تو تم مجھ سے یوں کبھی کبھی نہ رہتیں اور تمہاری بہن کو جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت تھی اور سب سے بڑی بات انسان تکلیف میں ہمیشہ اسے یاد کرتا ہے، غصے وہ کچھ سمجھتا ہے۔ انگل، آخنی کے انکسپنڈنٹ کی خبر سن کر تم مجھے بھی ٹون کر سکتی تھیں، لیکن نہیں، تم سیدھی اس کے پاس دوڑی گئیں، کیوں؟ کچھ تھا جو تم اتنے مان سے اس کے پاس گئی تھیں، میں کچھ بھی برداشت کر سکتا ہوں، لیکن دل کی خراکت نہیں، میں یہ رشتہ ابھی اور اسی وقت ختم کر رہا ہوں اس نے انوکھی ٹیمبل پر دھک دی۔ زہرہ نے پریشانی سے اپنے ماں باپ کو دیکھا۔

”میری بات سنیں آخنی۔“ وہ اپنی انداز میں ان کی طرف بڑھی۔

”لوگوں پر۔“ وقار نے اونچی آواز میں اسے پکارا۔
”کوئی ضرورت نہیں، کسی کو کوئی وضاحت دینے کی، تم کیا ہو، ہم بہت اچھی طرح جانتے ہیں اور جس شخص کو براہ اختیار ہی نہیں اس کے ساتھ ساری زندگی کیسے بچاؤ کی، کتنی بار وضاحت دوئی۔ ہماری طرف سے بھی یہ رشتہ ختم، آپ لوگ جاسکتے ہیں۔“
دونوں ماں، بیٹیوں نے جتنی نظر اس پر ڈالی اور چلے گئے۔ صفورہ نے آگے بڑھ کر اسے گٹھے لگا لیا۔

”ماما۔“

”رہتے نہیں بیٹا، اس میں کوئی بہتری ہی ہو گی۔“ صفورہ نے اس کے بال سہلاتے ہوئے کہا۔

☆☆☆

”تمہارا دماغ ٹھیک ہے عفرات۔“ صائمہ نے غصے سے اسے دیکھا۔

”ماما اس میں غلط کیا ہے۔“
”تمہیں تو کبھی غلط لگے گا نہیں، کیونکہ وہ تمہاری دوست ہے، لیکن تمہاری دوستی کے لیے میں فاطمہ کی زندگی خراب نہیں کر سکتی، اس کی منگنی ٹوٹی ہے، اللہ جانے کیا عیب دیکھے ہیں ان لوگوں نے جو اتنی چاہت سے کی ہوئی منگنی توڑ دی اور وہ اس کی بہن وہ تو دماغی مریض ہے، مجھ سے تو یہ امید بالکل نہیں رکھنا۔“ عفرات نے شکایتی نظر خاموش بیٹھے فاطمہ پر ڈالی۔

”تم نے رشتہ نہیں کرنا تو نہ کرو صائمہ! پر پکی کے بارے میں غلط الفاظ استعمال نہ کرو، ہم بچپن سے اس بچی کو جانتے ہیں اور اس کے اچھے کردار کے گواہ ہیں ہم۔“ سفیان کو ان کا انداز بہت برا لگا تھا۔
”جو بھی ہے، میں نے فاطمہ کے لیے ایک لڑکی دیکھ رکھی ہے۔“

”پاپا آپ اور ماما کل زہرہ کی طرف جا رہے ہیں میرا پرد پوزل لے کر۔“

”فاطمہ۔“ صائمہ نے حیرت سے اسے دیکھا۔
”اور ماما مجھے ہر صورت میں ہاں چاہیے، آپ سمجھ رہی ہیں نا۔“ وہ کہہ کر اٹھ گیا تھا، جبکہ ہاں بیٹھے سفیان، خن، صائمہ تینوں حیران تھے، صرف عفرات ہی

”میں نے کیا کیا ہے۔“ وہ کندھے اچکا کر پوچھنے لگا۔ غریبی قریب آپ آکر کھڑا ہو گیا۔

”زہرہ کے ساتھ نکاح آپ نے اپنی مرضی سے کیا ہے، پھر آپ ایسے کیوں بی ہو کر رہے ہیں، جیسے آپ نے مجبوری میں نکاح کیا ہو۔“

”ٹھیک کہہ رہی ہے عفرہ، فاطمہ اتنا روڈی لی ہو کر رہے ہو اس سے، وہ پہلے ہی تم سے ڈرتی ہے۔“ وہ سر جھٹک کر بولا۔

”وہ مظلوم نہیں، محصور ہے۔“

”ہاں اتنی محصور ہے کہ میرے پر پوزل کے باوجود اس نے کسی اور سے منگنی کر لی۔“

”بھائی۔“ عفرہ نے ہاتھ پائی لیا۔

”میں بتا چکی ہوں آپ کو کس طرح ایسے پارچہ کیا تھا شمرہ آپ نے، وہ آپ کو پسند کرتی تھی، کر لی ہے اور اب آپ کی بیوی ہے تو سرتے دم تک آپ سے محبت کرتی رہے گی۔“

”مجھے ابھی بدلہ لینا ہے، کیونکہ اس نے میری محبت کی انسلٹ کی ہے۔“ اب کی بار وہ دھیمے بولا تھا۔

”فاطمہ غلط کر رہے ہو، تمہاری طرف سے جو محبت تھی وہ اس سے ناواقف تھی، کون سا اس نے تم سے منگنی کی تھی، تمہیں وعدے کھائے تھے۔ جس سے وہ مکر گئی تھی اور جس بات کو تم نے انا کا مسئلہ بنالیا ہے، ایسے آپ کو ٹھیک کر دو، بند ہو غلط فہمی اتنی بڑھ جائے کہ تمہاری محبت اسے ختم نہ کر سکے۔“ غر نے بڑی جھجھکی سے فاطمہ سے کہا اور عفرہ کا بازو پکڑ کر واپس مڑ گیا۔ فاطمہ نے ایک نظر گاڑی میں بیٹھی زہرہ پر ڈالی اور سر جھٹکنا گاڑی کی طرف مڑ گیا۔

☆ ☆ ☆

”آج میں بہت خوش ہوں وقار، میرے دونوں فرض پورے ہو گئے، میری دونوں بیٹیوں کو چاہنے والے لوگ ملے ہیں۔ مجھے لگتا ہے میں نے ماں ہونے کا فرض ادا کر دیا، کیا اماں نے مجھے معاف کر دیا ہوگا۔“

”صفورہ تم ایک اچھی بیٹی اور بہترین ماں ہو اور ایک بہترین بیوی ہو، تمہاری اماں تم سے نہیں مجھ

سے ناراض تھیں، آج انہوں نے مجھے بھی معاف کر دیا ہوگا۔“ وقار کے کہنے پر صفورہ نے مسکرا کر سر ان کے کندھے پر رکھ دیا۔

”شمرہ کی منگنی پر وہ کتنے دل سے تیار ہوئی تھی۔ کیونکہ فاطمہ نے بھی آتا تھا، لیکن وہ آیا ضرور، سب سے پہلی مذاق کیا، سوائے اس کے، وہ دل مسوس کر رہ گئی۔ سب کے جانے کے بعد وہ جھکی جھکی سی کمرے میں آ گئی۔ اس نے شیشے کے آگے کھڑے ہو کر خود کو دیکھا۔ سفید اور سلور کرتا شرارہ میں وہ کتنی پیاری لگ رہی تھی، لیکن وہ جس کے لیے تیار ہوئی تھی اس نے تو شاید دیکھا بھی نہیں تھا۔ وہ منہ بنا کر ٹیس پر آ گئی، اس کے کمرے کی لائٹ جل رہی تھی۔ وہ سامنے دیکھ رہی تھی، جب وہ اچانک ٹیس پر آ گیا، وہ بڑبڑا کر رہ گئی، سمجھ میں نہیں آیا کیا کرے۔“

”نہیں یہ کیا۔“ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگی، وہ اسے گیٹ پر آنے کا اشارہ کر رہا تھا۔ وہ بانگوں کی طرح یونہی کھڑی رہی، یہاں تک کہ وہ اپنا گیٹ کھول کر ان کے گیٹ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا شرارہ پکڑ کر دسے پاؤں میڑھوں کی طرف بڑھنے لگی۔ شمرہ کے کمرے سے کھٹکھٹانے کی آواز آ رہی تھی، یقیناً باہر بھائی کا فون تھا۔ وہ اسی انداز میں میڑھیاں اترنے لگی۔ گیٹ تک پہنچتے پہنچتے اس کا سانس پھول گیا تھا۔ اس نے تیزی سے گیٹ کھول دیا۔ وہ ایک نظر اسے دیکھ کر اندر آ گیا۔ زہرہ نے تھوک نکل کر اپنے خشک حلق کو تر کیا۔

”بولو، کیا شکایتیں ہیں، تمہیں مجھ سے۔“ وہ اکھڑے ہوئے لہجے میں بولا۔

”مجھے کچھ بھی نہیں۔“ وہ ہٹا کر بولی۔

”پھر تمہارے منہ پر بارہ کیوں بچے رہتے ہیں۔“

”تو کیا کرنا چاہیے مجھے۔“ وہ جذباتی ہو کر بولی۔

”بارہ آپ کے منہ پر بچے رہتے ہیں، اگر میں آپ کو اتنی بری لگتی تھی تو پھر کیوں نکاح کیا مجھ سے۔“ وہ کہتے کہتے رو پڑی تھی۔

”ہر وقت میری آزمائش کیوں ہوتی ہے، ہر

کسی کو میں ہی فالتو نظر آتی ہوں، جس کا دل کرتا ہے، مجھ سے ناراض ہو جاتا ہے۔ ہر وقت میں ہی ہر ایک کو مناتی رہوں۔“ وہ سر جھٹکے روٹی جاری تھی۔

”مجھے کب منایا تم نے، اس نے روتے روتے سر اٹھا کر اسے دیکھا جو دونوں بازو سینے پر لیے مسکرا کر اسے دیکھ رہا تھا۔

”ایک بار مٹا کر تو دیکھو۔“ وہ بالکل اس کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔ ”اس کے بدلے تیر پر وہ ایک دم گھبرا کر پیچھے ہٹ گئی۔

”نہیں۔“ وہ ایک دم پلٹی، لیکن اس سے پہلے فاطمہ نے اس کا بازو پکڑ کر اسے واپس کھینچ لیا۔

”نہیں کیا، بات پوری کر کے جاؤ۔“ مناد مجھے بڑے رومانٹک انداز میں، یقیناً کر دہیں بڑی جلدی مان جاتا ہوں۔“ اس نے بازوؤں کا دائرہ بنا کر اسے دائرے میں قید کر لیا۔ زہرہ نے گھبرا کر لاؤنج کے دروازے کی طرف دیکھا۔

”ماما، پاپا ابھی سوئے نہیں۔“ اس نے فاطمہ کو دیکھ کر کہا۔

”چلو ٹھیک ہے، میں ان کے سونے کا ویٹ کر لیتا ہوں، تب تک تم یوں ہی میرے قریب کھڑی رہو۔“ وہ ایک منٹ یوں ہی سانس روک کر کھڑی رہی، پھر سر اٹھا کر دیکھا۔

”اب میں جاؤں۔“

”کیوں، اب کیا ہوا ہے، میں تو ابھی بھی ناراض ہوں، تم نے مجھے منایا ہی نہیں۔“ صاف پتا چل رہا تھا، وہ اسے تنگ کر رہا تھا۔

”ابھی میں جاؤں، بعد میں آپ کو متالوں گی۔“ اب کے وہ مسکراہٹ روک کر بولی۔

”کب؟“

”بعد میں۔“

”بعد میں کب۔“ وہ اس کے سر سے سر کرنا کر بولا۔

”جب منانے کا وقت آئے گا۔“ کہنے کے ساتھ ہی وہ ایک جھٹکے سے جھک کر اس کے بازوؤں کے دائرے سے نکلی تھی۔

”وہ وقت جلد آنے والا ہے۔“ فاطمہ کے کہنے پر وہ مسکرا کر پیچھے ہٹ گئی۔ اب تو آپ مجھ سے ناراض نہیں۔ اس نے جھکی آنکھوں سے اپنا وہم دور کرنا چاہا۔ ”نہیں، میں ناراض نہیں، تھوڑا ہرٹ ہوا تھا، کیونکہ تمہیں چاہئے لگا تھا، بالکل اچانک اور مجھے لگا تھا تمہیں پانا بھی بہت آسان ہے، لیکن جب تم نے انکار کر دیا، سچ کہوں مجھے بہت برا لگا تھا اور زوہیب کے ساتھ تمہیں دیکھنا میرے لیے اس سے زیادہ مشکل تھا۔ لیکن اب سب ٹھیک ہے۔“

”تو پھر آپ مجھ سے بات کیوں نہیں کرتے؟“ وہ شکایتی انداز میں بولی۔

”تنگ کر رہا تھا، سوچا تھا شادی والے دن سارے شگے دکھائیں دور گر لیں گے، لیکن تم عفرہ کو بچ میں لیے آئیں۔ اس نے میری جان غذاب میں ڈال رکھی تھی، بہری دوست پریشان ہے۔ اب کوئی اسے یہ بتائے اس کی دوست میری بیوی، میری جاپا ہے۔“ زہرہ نے بے ساختہ اسے دیکھا۔ وہ شاندار شخص جس کی تنہا ہی کسی دل نے، وہ کتنا چاہتا تھا اسے۔ وہ شرمسار سر جھٹک گئی۔

”اب آپ جا میں۔“

”جو غم۔“ وہ مڑا، پھر دوبارہ اس کی طرف مڑا۔

”تم بھی چلو میرے ساتھ۔“

”فاطمہ پلیز، زیادہ بھیلیں مت، جائیں۔“ وہ شاید پہلی بار کھٹکھٹا کر بولی تھی۔

”جار رہا ہوں، نیند نہ آئے تو ٹیس پر آ جانا، میں بھی آ جاؤں گا۔“

”مجھے ابھی نیند آ رہی ہے، میں سوؤں گی۔“

”اچھا سو۔“

”فاطمہ پلیز۔“ اب کے اس نے اسے زبردستی باہر دھکیلا اور مستی ہوئی اندر بڑھ گئی۔ اسے یقین تھا کہ اب زندگی میں کچی خوشیاں آنے والی ہیں، کیونکہ وہ تنہا سا شخص شریک زندگی بن گیا تھا۔



دھڑک

”ذوب مرنے کا مقام ہے ام حبیبہ تمہارے لیے یعنی کہ ہمارے خون سے، تمہارے ٹپن سے جنم لینے والی یہ لڑکی۔ یا اللہ! ہمیں موت کیوں نہیں آگیتی۔ ہم سر کیوں نہیں جاتے۔ ہماری یہ سفید داڑھی، یہ سفید کرتے، ہماری نمازیں کیسی اکارت گئی ہیں۔ ام حبیبہ! کیا جانو، تم کیسے سمجھ سکتی ہو بھلا۔“ مولانا کوثر جمیل کی داڑھی آنسوؤں سے تر تھی۔

ٹپ ٹپ آنسو گر بیان بھگور رہے تھے اور دیوار سے لگی کھڑی چاب جمیل کی والدہ ام حبیبہ دوپٹے سے سر پر جاسے تھر تھر کا پ رہی تھیں۔ وہ جن کے دوپٹے کی پر چھائی تک کوئی ناخرم نہ پاس کا تھا جن کی آواز سے صرف گھر کی دیواروں مانوس تھیں۔ آج ان کی اکھوتی بیٹی جو شریعت کے سارے اصولوں کے عین مطابق پالی تھی۔ پالنے میں ہی جسے سورۃ رحمن کی تلاوت سنا سنا کر مجھب واد سے محبت کرنا سکھایا گیا تھا وہ ایک ناخرم کو خط لکھتی تھی۔ غیر مرد کی محبت میں مبتلا تھی۔

”جان من“، ”جان جہاں! ان کا جہاں تو مصلے سے شروع ہو کر قرآن کی تفاسیر تک آ کر ختم ہو جاتا تھا۔ نہ کسی آئے فیشن کی خبر، نہ جاتے موسم سے لگاؤ۔ یہ دنیا تو عارضی ہے اور اس عارضی دنیا سے کیا دل لگانا گھر چاب کے عارضی کسی محبوب نام کی شے سے دیکے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔

کہاں کی رو گئی تھی، ان کے خاندان کی ناموس کی تو لوگ بھرے بازاروں میں نہیں کھاتے تھے۔ جھوٹ، ملاوٹ، دنیا داری سے یہ خانوادہ کو سول نہیں



دھیرے دھیرے محو سفر تھا۔ اس کے کمرے میں ساری نیلے رنگ کی ہو جائے یا پھر رنگ رنگ کی بوکر اڑ جائے۔ اسے اس سے کوئی لیٹا دینا نہیں تھا، معافی کے دروازے کھلنے کی امید کرنا محبت تھا۔ ”مہرین

حی، البتہ دوپٹے سر پر ویسے ہی جتا تھا جیسے پیدا اس سے لے کر آج اس کھڑی تک۔ پاک اسٹڈیز اردو ”بہار اردو“ حساب کا ہوم ورک ابھی رہتا تھا۔ دستے کے اوپر دھرا بین جس میں سے نیلی سیاہی نکل نکل کر پورے دستے پر پھیل چکی تھی۔ اب بھٹلے وہ پورے گھر کے کو اپنی لپٹ میں لے کر لیٹا کر دے، چین اٹھانے۔ کتابیں سمیٹ کے رکھنے سے کیا حاصل۔ اب وہ بھی اسکول نہیں جاسکے گی۔

دہ جاتی تھی اس کی دنیا تو پہلے بھی بے حد محدود تھی، اب گھر کی چار دیواری سے باہر کی دنیا بھٹلے

اسے ان کے خاموش رہنے پر بھی اعتراض تھا۔
”تم نے ایسا کیوں کیا؟“ اسی جان کا جواب
سوال تھا۔

”وہ مجھے اچھا لگا تھا۔“ اس کی آنکھیں جھکی
تھیں، صرف لب ہلے تھے اور ام حبیبہ پر آسمان ٹوٹ
پڑا تھا۔

”تمہیں ہزاروں سال جہنم کی آگ میں جلنا
کیوں پسند آیا تھا؟“ وہ آنکھیں نہ جہنم کی بھڑکتی
آگ سے ڈرتی دکھائی دیتی تھیں، نہ جنت کی طلب
گار لگتی تھیں۔

”میرا خواب تھا کہ تم بہت سارا پڑھ لکھ لیتیں، تم
دنیا کی رنگینوں کو محسوس کرتیں۔ تمہیں..... انسوس
کون سا رنگ پسند آیا دکھتا جہنم۔“ اسی جان سے
معافی مانگتا فصول تھا۔

روز اتنے سارے بچوں کی چہل پہل دیکھنے
والی اندر سے اکیلی تھی، اپنا کیلا پن بانٹنے آئی تھی مگر
وہ اٹھ کر جا چکی تھیں۔ صرف جائے نماز پر بیٹھ بھول
گئی تھیں، سرخ دیکھتے دانے۔ سارے برتن دھل کر
اپنی جگہ پر تھے، پراٹھا اور چائے موجود تھی مگر بھوک کا
نام و نشان نہیں تھا۔ کچن کینٹ میں وہ نہ جانے کیا
تلاش کر رہی تھی، اسے بھی معلوم نہیں تھا۔

اسی جان صرف بابا جان کے ڈر سے اس کی
پڑھائی کے حق میں نہیں بولتی تھیں اور اندر وہ بھی۔
چھانکے سے اس کے اندر کچھ ٹوٹا تھا، اتنے زور سے
کہ وہ آنکھیں گرم پانیوں سے بھر اور یا بن گئیں۔

”میں نے اسے دیکھا تھا، وہ گریٹ برکھار ہوتا
تھا۔ میرے لیے نہیں، وہ شریعہ کا بھائی تھا، شریعہ کے
لیے آتا تھا، اس لیے۔ شریعہ نے ہی مجھے بتایا کہ وہ
عمیر ہے، مجھے اسی نے بتایا تھا۔ اس نے تو مجھے بھی
دیکھا بھی نہیں، وہ میری شکل، آنکھوں کی اٹھان تک
سے واقف نہیں پھر میں نے ایک نہیں، کئی خط لکھے،
روز لکھے، دن رات لکھے۔ مگر اسی جان! ایک خط بھی
اسے دیا نہیں، نہ ہی وہ میرے ان خطوط سے متعلق

کچھ جانتا ہے۔ کیا میری غلطی معاف ہو سکتی ہے۔“
اس ٹھنڈے رخ ماحول سے اندر جلتے بیڑی کی
حدت میں بھی حجاب کے ماتھے پر پسینہ چمک رہا تھا۔
اپنی غلطی، اپنی محبت کا اعتراف جو اس کے گلے کا پھندا
بنے جا رہی تھی۔ اسے یہ پھندا گلے سے نکالنے کا یہ ہی
راستہ بھائی دیا تھا۔ سیکس سے روشنی کی کرن دکھتی
تھی۔

باقی سارے دروازے اس سختی سے بند تھے کہ
کھولنے کی کوشش میں صرف اسی کی انگلیاں زخمی
ہو سکتی تھیں۔ اسے لہو کا تماشا اس نے کئی روز سہا تھا۔
کل حیران اس کی کلاس فیلو اسے بتا کر گئی تھی کہ بابا جان
اس کا نام تک خارج کر دئے تھے۔ وہ وہ جانا
چاہتی تھی، وہ زبان سے کچھ نہیں کہہ رہی تھی۔ آنسو
ایک داستان لکھ رہے تھے، اس کے چہرے پر، اس
کے دل کی کوری دیواروں پر بے بسی ہی بے بسی تھی۔
کیا حجاب زہرہ کی زندگی کا عمر تاریک ہو چکا ہے۔

یہ سوال لیے اپنی جھولی اسی جان کے حضور
جا پھیلائی تھی۔

”میں وعدہ کرتی ہوں آئندہ کسی کی طرف
آکھ اٹھا کر نہیں دیکھوں گی۔“ اگر آئندہ ایک روائی
میں بیٹے تو آسانی سے اس کے لیے رستہ بنا لیتے،
بڑے ہوئے ہاتھ، پیکاپاتے لب سوچی آنکھیں۔ یہ
صرف اسکول جانے کا سوال ہے، کسی محبت کی بھیک
نہیں مانگی گئی۔

”کیا بے نام محبت کی معافی مل سکتی ہے۔ کیا مل
سکتی ہے؟“ اسی جان نے اس کا سراپائی کود میں رکھ لیا
تھا، ان کے نرم، انگلیوں کا بالوں میں چلنا حجاب کو
سکون پہنچا رہا تھا۔ وہ کچھ نہیں کہہ رہی تھیں، ہمیشہ سے
جج بولنے کی تربیت دینے والی اسی جان جانتی تھیں کہ
یہ جج ہے، جج کے سوا کچھ نہیں۔ مگر وہ بے بس تھیں اور
بے بسی سے بڑا درد کوئی نہیں۔
پھر اس کی زندگی کا تاریک تو نہیں ہو سکی تھی، کچھ
روشن روشنی ہو چلی تھی، عبدالرحمن، اس کا دوست

ہو گیا تھا۔

”بابا جان کو پتا چلا کہ آپ شوہر کے بجائے
دوست بنے ہوئے ہیں تو انہیں کیسا لگا، پتا نہیں۔“
اس نے عبدالرحمن اپنے دوست سے ہر بات چھپائی
تھی۔

”ہم اس گلی سے چلیں۔“ یعنی مل کھاتی گلی
کے تقریباً سارے کونے آلو چھو لے، سمو لے،
پکڑ لے بیچے والوں سے بھرے ہوئے تھے۔ چھپ چھپ
طرف والی گلی کی کلوہے کی جالی ذرا اکڑی ہوئی
تھی۔ کلاس روم سڑک سے اتنے اونچے تھے کہ
ایڑیاں اٹھا کر اندر جھانکنا جاسکتا تھا۔ اس نے بھی یہی
کیا۔ ایڑیوں کے بل اندر جھانکنے لگی، کسی نے اسے
نہیں پہچانا۔ سب اپنے کاموں میں مصروف تھے،
خاموش ماحول میں شاید کوئی ٹیٹ ہو رہا تھا۔ دو
مہینوں میں کتنا کچھ بدل سکتا تھا مگر وہ بہت تبدیل
ہو چکی تھی۔

زہرہ خاتون، اس کی ساس حجاب زہرہ کو باکر
بہت خوش تھیں۔ مولانا کوثر جیل کی بیٹی ان کی خوش
نصیبی نہیں تو کیا ہے بھلا۔ آہستہ آہستہ وہ سب
بھولنے لگی اور ان ہی بھول بھولیوں میں وہ بھی بابا جان
کی عزت کو ہی مقدم جانے لگی تھی۔ انہوں نے برائی
کے راستے سے اسے پہنچ نکالا تھا، کتنا اچھا کیا
تھان۔ ہر باپ ہی یہی چاہتا ہے کہ اس کی بیٹی پر
زمانے کی دھول تک نہ پہنچے پائے اور وہ چاہے
سوچوں میں ہی سہی برا سوچ تو رہی ہی تھی ناں، کیا پتا
کچھ غلط کبھی ذاتی۔

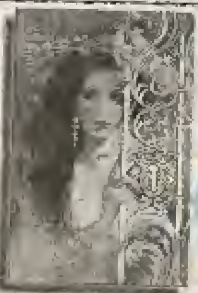
وقت گزرتا رہا۔ مولانا صاحب اب بہت
بوڑھے ہو گئے تھے۔ چہرے کا نور بڑھتا جا رہا تھا، بیٹی
سے محبت بھی بڑھی ہی ہو گئی تھی۔ دعاؤں کے مضبوط
حصار اس کے گرد باندھتے رہتے۔ شوہر کی طرف سے
اس نے کوئی تکلیف دہ لمحہ نہیں پایا تھا۔ ساس بھی جب
تک ساتھ رہیں پھر رخصت ہوئیں، تب بھی کوئی
لالہ نہ دے کر گئیں، اولاد بھی رب نے خوب

صورت، خوب سیرت عطا کی تھی، ام کلثوم اور فاطمہ
میں اس کی جان تھی۔ ام کلثوم اب کالج میں تھی، اس
کی جان تب لگی جب کلثوم کورات کے اندھیرے میں
اس نے اپنے کمرے میں نہیں پایا۔
وقت کتنا گزر چکا تھا، ایک پرانا لمحہ ساکت
سامنے تھا، وہی خوشبو تھی۔

عبدالرحمن اور اس کا بیٹا حبیب الرحمن بڑے
کمرے میں خواستہ راحت تھے۔ بڑی گہری نیند تھی، بس
اسے ہی نیند نہیں آرہی تھی۔ فاطمہ بے سدھ بڑی
سو رہی تھی، کبیل سر تک کھینچا تھا صرف ام کلثوم کا ہنر
خالی تھا۔ بے اختیار اس کے دل کی دھڑکن بڑھی تھی۔
”ام کلثوم۔“ اس کے لبوں نے بے آواز جیش
کی، کوئی کراہ نہیں نکلی۔ سارا وجود کراہ زور بن چکا تھا۔
کھڑکی کے پار نیچے کالی چوڑی سڑک پر دم سم سابل
جل رہا تھا۔ آنسو بھی آنکھوں نے کھڑکی کی جھری
سے ام کلثوم کا ہیولہ سامھوس کیا۔ ابھی اسے نکلے
صرف رات کی تاریکی نے ہی محسوس کیا تھا، ساری
کھڑکیاں، روشن دان تاریک تھے۔ صرف اس کی
بد نصیبی کا در کھلا رہ گیا تھا، جادو لپیٹ کر بے دھڑک
قدموں سے نکلے پیر وہ ام کلثوم کے پیچھے بھاگی۔ یہ

خواتین ڈائجسٹ

ایک طرف سے، ہمارے لیے ایک اور بادل



دستِ مِی
چھپیمیا

قیمت - 400 روپے

32735021

new
freedom
Ultra thin sanitary napkins

اب مخصوص دن بھی گزاریں خوشگوار!!!

Ultra Thin
Extra Long



Ultra Thin
Long



A product of

H&P

Health and Hygiene products

اس کا رقبہ، یہ معصومیت جو پناہ نہیں کس غلامت کا شکار ہونے کو تھی، اسے بجانے کا وقت تھا۔

”ام کلثوم“ اس کے لہجے میں اپنی ماں کا سا درد سمٹ آیا تھا۔

جودل کا ٹکڑا تھی۔ دل کے ٹکڑے کرنے چلی تھی، اس نے اپنی سانسوں تک کو بے آواز کر لیا تھا۔ دروازہ اس طرح بند ہو چکا تھا جیسے رات کے اندھیرے میں کبھی کھلا ہی نہ ہو۔ کسی کو اس بات کی

بھنک بھی نہ پڑ سکتی تھی۔ مگر اب وہ بے خبر نہیں رہنا چاہتی تھی، گھر میں محسن بہت زیادہ تھی۔ دنیا سے بے خبری بہت بڑھ گئی تھی۔

ام کلثوم کو بہت ساری شکایتیں تھیں، شکایت تو اسے بھی تھی، وہ کیا کرنے چلی تھی۔ سارے پچھلے پرانے خوابوں کی دھجیاں اڑانے لگی تھیں۔ عبدالرحمن کی بہن نفیسہ نے ام کلثوم کو اپنے بیٹے عثمان کے لیے کتنی بار مانگا تھا۔

اسے یاد آیا تھا پوری جزئیات سے، وہ جملہ ”ام کلثوم کو میری بیٹی بنا دیں۔“

ایب ہاں کرنے کا وقت تھا، بوجھ اتار چھیننے کی گھڑی تھی۔ موبائل پر نمبر ملائے، وہ نفیسہ کی منتظر تھی۔ سینٹرل ٹیلی پر کتا نہیں اوندھی بڑی تھیں۔ آنکھیں کتاہوں میں اچھ کر رہ گئیں۔ نیکی بہتی ہوئی سیاہی دے۔

”امی میں پڑھنا چاہتی ہوں، پلیز مجھے معاف کر دیں ورنہ میرا سبز کرنے کا خواب ٹوٹ جائے گا۔ میں ٹوٹ جاؤں گی۔ میں آئندہ ایسی حرکت بھی نہیں کروں گی۔ امی! بس ایک بار.....“ ام کلثوم اور وہ کمرے میں موجود تھے۔ ایک جیسے خواب، ایک پہلے ٹوٹ گیا، دوسرا ٹوٹنے کو تھا۔

”اولاد سے غلطیاں ہو جاتی ہیں۔ آپ پلیز امی۔“ ام کلثوم بھی امی جیسی ہی تھی۔

”وہ کوئی نہیں تھا امی! آپ چاہے قسم لیں۔ میں اس سے کبھی نہیں ملی، آج ہی اس نے بلایا

تھا۔ پہلی بار اور وہ آیا بھی نہیں تھا، بسیں کھڑا رہتا تھا اس نے اشارہ کیا تھا مجھے میں نیچے اتری تو کوئی نہیں تھا۔ سچ کہہ رہی ہوں امی ہیرا یقین کریں۔“

”ایک انجان آدمی کے لیے کتنی پاگل ہو تم ام کلثوم!“ سامنے موجود حجاب جیل اب بڑھانے کی دہلیز تھا۔ نہ کوئی اور ام کلثوم جوانی کی خوشبو میں اچھی نادانی کی حدود عبور کرتی، اپنا مستقبل برباد کرنے کے لیے تیار تھی۔

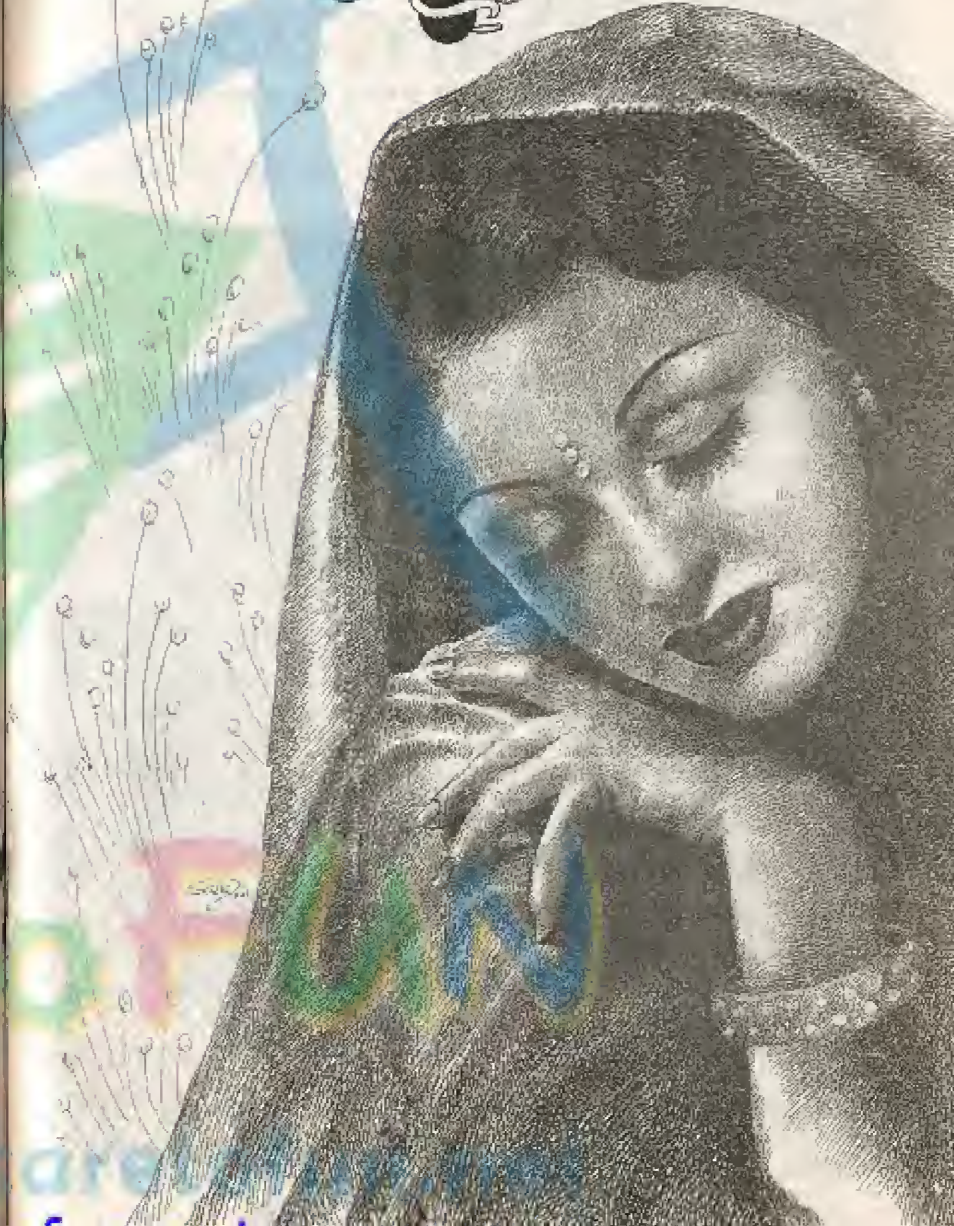
وہ ام کلثوم کا چہرہ دیکھ دیکھ کر تھک چکی تھی، کمر گھپ اندھیرے میں ڈوبا تھا۔ یہ چوٹا اندھیرا تھا جو اکیلا تھا، رات گہری تھی جب دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی تھی۔ چھلکی ہاری ام کلثوم اس کے قدموں میں آ کر بیٹھ گئی تھی۔

”آپ جو فیصلہ کریں، امی مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ مجھے کہیں نہیں جانا جو آپ کہیں گی وہی کروں گی اب۔ بس اب آپ اٹھ جائیں امی! مجھے ڈر لگ رہا ہے۔“ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔

”ایسا کوئی قدم مت اٹھاؤ ام کلثوم کہ تمہیں پچھتاہٹ پڑے۔ جھوگی، ضرور جھوگی ایک دن۔ اچھی کتاہیں پڑھا کرو، کوئی دنیا کی خبر رکھنے کا بھی انتظام کروانی ہوں۔ کوئی ٹی ڈی وغیرہ۔ ٹھیک ہے ناں، چلو اب اٹھو۔ جاؤ، کھانا کھاؤ۔ کالج تمہیں میں لے جایا کروں گی اور لانا تمہارے بھائی کی ذمہ داری ہوگی۔ فیصلہ بہت مشکل ہے مگر تمہارے حق میں ہے، محنت کرو اور آگے بڑھ جاؤ۔ اپنی ماں کی دنیا سے سوچ سے بھی آگے۔ خود کو نمودار نہ کرو۔ اپنے پر پھیلاؤ ام کلثوم! دنیا بہت بڑی ہے۔ گھٹنا عشق محبت جو اس کا عین گڑھا ہے غلامت کا۔“ چھلکی ہاری ام کلثوم ماں کو دیکھنے لگی، جو کسی گہری سوچ میں کھنسی مگر چہرے پر کوئی داستان لکھی جا رہی تھی جس نے نجانے کون سی دستک کا جواب دیا تھا۔



طریق عشق



آج کے دن.....

جج پر جانے والے خوش نصیب ہیں، لیکن بد نصیب وہ بھی نہیں۔ یوم جمعہ ہے..... اذان ظہر سے پہلے، قیام جمعہ سے پہلے، خلیفہ کے شاہی دستے آگے اور پیچھے، دائیں اور بائیں چلتے ہوئے، ٹھہریا اس اعلا نسل اؤنٹ کے ساتھ آرہے ہیں جس کی سعادت مند کوہان پر ”محمل شریف“ سوار ہے.....

عرش کا نشان، زمین کا جلال..... ”بیت اللہ“ کا کسوۃ الکعبہ (غلاف)

کلاموں میں کلام..... ابن کلام..... قرآن پاک.....

اس شاہی قافلے کو دیکھنے کے لیے قاہرہ کے لوگ گھروں سے باہر نکل آئے ہیں، گھروں کی چھتوں پر چڑھ گئے ہیں۔ چھوٹوں کے بچے نیک نہیں چھوڑے گئے، وہ بھی اس وقت اپنی ماؤں کی گودوں میں ہنستے ہوئے، محمل شریف کی راہ دیکھ رہے ہیں۔ جن گھروں سے قافلہ دکھائی دینے والا ہے،

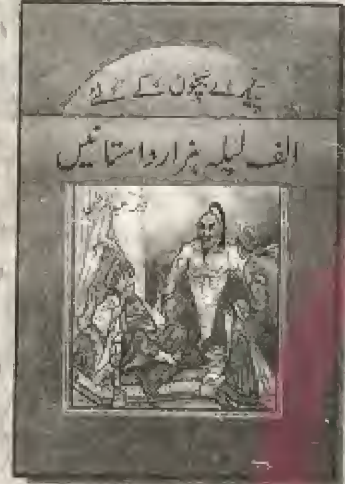
مکمل ناول

نیل گواہ عصا ہے..... دقت کے لمحے اور دریا کی لہریں ایک جیسی نہیں رہیں لیکن وہ پانی کہیں نہ کہیں تو موجود ہوگا جس نے عصائی کی ضرب پر لپٹ کر کہا ہوگا..... لپٹ کر کہنے، بیت اللہ کا حج کرنے، حاجی قاہرہ کی زمین پر قافلہ در قافلہ اتر رہے ہیں..... صبح کا پیام، دن کے بیان میں بدل چکا ہے۔ مصر کے قاہرہ میں، گرم موسم میں، ٹھنڈی ہوا کی آمد کو حجاج کرام کی خوش قدمی قرار دیا گیا ہے۔ گھوڑوں کے ٹاپوں کی دھمک، ہجوم کے جوشیلے نعروں کا شور، گلی کوچوں، بازاروں، اونچے نیچے راستوں اور زمین کے خالی قطعوں پر کھڑے قاہرہ کے لوگوں کا صبر قائل دیدہ ہے۔

”محمل شریف“ کے لیے آنکھیں نم اور دل محبت کی گرمی سے نرم ہیں۔ سر پر شیرینی کے ٹوکے رکھے، خواجہ فروشوں کی آوازوں کے لفظ وہی ہیں بس تاخیر بدلتی ہوئی ہے..... آج کے دن..... ایک



الحمد لله شہزادہ اسحاق علی



دلچسپ اور خوبصورت داستانیں جنہیں پڑھ کر
بچے ہیری پوٹر کو بھول جائیں گے، ایسی داستانیں
جنہیں بڑے بھی پڑھ کر لطف اندوز ہونگے

کتاب بذریعہ رجسٹری منگوائیں
300/- روپے کا ڈسکاؤنٹ حاصل کریں

فی کتاب- 1200/- روپے
ڈسکاؤنٹ- 300/- روپے
آج ہی- 950/- روپے
مئی آؤ رارسال فرمائیں

بذریعہ ڈاک منگوائے گئے
مکتبہ عمران ڈائجسٹ

32216361 لاہور بازار کراچی۔ فون

بھی گھر سے زیادہ بلندی پر موجود تھیں۔ چھ گھروں
سے انہیں دیکھنے اسی لیے ملے تھے، تاکہ وہ ساتویں
گھر، اللہ کے گھر سے، اللہ کے گھر جانے والا کسوتہ
الکجہ اور کلام پاک دیکھ لیں۔ نیت ورنہ ارادہ باندھ
لیں۔ تیز ہوا سے ان کے دامن پھڑ پھڑا رہے
تھے۔ شدت جذبات سے محبت اتر رہی تھی۔

محل شریف (اہرام مصر کی ساخت کا بنا
ڈھانچہ، جس میں کلام پاک اور غلاف کعبہ ہوتا ہے)
قاہرہ کا جہوم اور شاہی دستے قریب آ رہے تھے۔ حج
پر نصیب والے جاتے ہیں، جو پیچھے رہ جاتے ہیں وہ
نصیب جاگ جانے کی دعائیں مانگتے ہیں۔ دور
سے آنے والے، پیچھے رہ جانے والوں کی آنکھوں
کے قریب آ رہے تھے۔ غیر محسوس طریقے سے تینوں
نے چادریں سچ کر چہروں کو چھپا لینا چاہا۔
تہرکات کو ایسے کھلے منہ دیکھنے سے انہیں شرم آئی۔
انہیں یقین تو حاصل تھا لیکن شک بھی ان کے ساتھ
تھا کہ وہ ان تہرکات کو دیکھ سکتی ہیں اور نہیں بھی۔

حافظ قرآن ماؤں کے حافظ قرآن مصوم دل
بچے، غلاف کعبہ کے لیے پکڑا رہے ہیں، پھر اس پر
آیات لکھتے ہیں۔ حافظ قرآن بابوں کے حافظ قرآن
بچے، بیت اللہ جانے والا ”کلام پاک“ لکھتے ہیں۔

ایسی حفظ، حفظ محبت سے..... ایسے والہانہ سیاہ
رنگ عشق سے آنکھیں چار کرنے سے انہیں شرم
آئی.....

لیکن.....
تینوں کی نظر ایک ساتھ محل شریف پر پڑی
تھی۔ وقت پر نہ جانے کیا گزری لیکن ان کے لیے
مستی جاہ و جلال، ہستی روح و کمال، خاک ہوئی.....
تینوں کی سواری، عاجزی کی نشانی، چوپایوں
میں درویش چوبائے اونٹ نے سرائیا،

انہوں نے سر جھکا یا اور دیکھا۔ وہ قاہرہ سے
ہی تھیں لیکن شہر کے دوسرے کنارے سے۔ انہوں
نے کبھی محل کو دیکھنے کا گناہ نہیں کیا تھا۔ وہ کلام
پاک، غلاف پاک کو اپنی ناپاک نظروں سے دور ہی

کیسے جاسکتی ہیں بھلا.....؟ جنت نے اداس ہو کر کہا۔
”جیسے مسجد کی طرف بھاگی جا رہی ہو، ویسے ہی
اللہ کے گھر کی طرف بھی بھاگ کر چلی جاؤ۔ میرے تو
گھٹنوں نے بے وفائی کی ورنہ میں تو کب کی جا چکی
ہوتی۔“

”دوڑ کر صحرایہ پار کر لیتیں؟“ آنے والے وقت
کے بہرے پن کا شکار لڑکی، حیران ہوئی۔

”میں تو آؤ کر آسان بھی پار کر لیتی..... بس کم
ہمتی لے ڈوبی۔ تم یہ کم ہمتی نہ کھانا..... پتا نہیں
مذاق تھا یا صلاح۔ خاتون سنجیدہ تھی..... خاتون دانا
تھی..... خاتون فرشتہ تھی..... خاتون بیابان تھی۔

سارا قاہرہ، سارا عالم کا روانہ حج کے ساتھ
”بیت اللہ“ جاسکتا تھا لیکن وہ نہیں..... وہ نہیں..... وہ
واقف حال تھیں۔

بچے مسجد کے قریب دیوار میں بھاگے پھر رہے
تھے۔ نعرے لگا رہے تھے۔ وہ مسجد کی سمت بھاگ
گئیں۔ اوپر کی طرف جانی میزھیاں چڑھ کر، شکل
سے ہی سہی لیکن وہ مسجد کے گنبد تک پہنچنے میں
کامیاب ہو گئیں۔ انہوں نے بھی دیواریں وغیرہ
پھلائی تو نہیں لیکن اب ایک دوسرے کے
ہاتھوں کا سہارا لے کر وہ دیواریں پھلانگ کر گنبد کے
چبوترے تک پہنچ چکی تھیں۔ سب سے پہلے عزیزہ
کھڑی ہوئی تھی اور اس کا منہ حیرت سے ٹھارہ گیا
تھا۔

اتنی بلندی سے شہر کے نظارے کا یہ اس کا پہلا
موقع تھا۔ یہ خیال قاہرہ کی عورتوں کو کیوں نہیں آیا
تھا۔ یہاں سے محل صاف دکھائی دے سکتا تھا۔
پھول بھی مین اس کے اوپر پھینکے جاسکتے تھے۔ گول
گنبد کے کنارے کھڑے ہونے کی جگہ تھی، اگر ان
کے قدم ڈگمگا جاتے تو وہ مسجد کی نیچے گرتیں۔ محل کے
قدموں میں..... لیکن.....

لیکن فی الحال وہ گنبد کی منڈ پر کھڑی تھیں۔
ان کے شفاف چہرے، اور روشن آنکھیں، سورج کی
گرمی اور نرمی سے غبر و آرمہ تھیں۔ وہ قاہرہ کے کسی

گرم گئے۔ بچوں، مردوں، عورتوں کو دیکھتے
ہوئے وہ مسجد کی سمت تقریباً بھاگی ہوئی جا رہی تھی۔
آوازیں بتا رہی تھیں کہ محل کس قریب ہی ہے۔

”آج کے دن بھی یہی ہلاکت خیز گناہ ہوں
گئے.....“ تیزی سے بھاگتے ہوئے وہ ایک محترمہ
سے ٹکرائی، جس نے جل کر کہا۔

”مجھے معاف کر دیں.....“ اس کے ایسے کیلے
انداز پر عزیزہ ہنس دی۔ سچ سے اسے دیکھنے ہی مل
رہے تھے تو دو چار اس نے بھی لوٹا دیے..... حساب
برابر رکھنا چاہیے ناں۔

”وانت نکال کر مجھ سے معذرت کر رہی ہو اور
یہ تم کہاں بھاگی پھر رہی ہو؟“

”میں نہیں جگہ نہیں لی تھی تو ہم مسجد کی طرف
جا رہی ہیں، شاید وہاں.....“ آمنہ نے دانا بننے
ہوئے کہا جیسے یہ خیال اسے ہی تو آیا تھا۔ عزیزہ،
آمنہ کو گھورے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔

”بڑی چالاک ہو، یہ خیال مجھے کیوں نہیں
آیا..... پر میرے گھٹنے مجھے میزھیاں نہیں چڑھنے
دیں گے۔“

”اور دیواریں پھلانگنے بھی.....“ کہتے ہوئے
عزیزہ اس کے قریب سے گزر کر جانے لگی لیکن اس
نے۔

”تم ہو کون؟ تمہیں پہلے کبھی یہاں نہیں
دیکھا۔“ نظر آمنہ اور جنت پر، سوال عزیزہ سے۔

عزیزہ کے چہرے کا رنگ بدلا۔ غیر محسوس
انداز میں تینوں نے اپنے چہرے پر غائب سچ لینے کی
کوشش کی۔ ان کے پاس جواب تو تھا لیکن جرات
نہیں تھی۔ وہ آج کے دن..... محل کو دیکھنے کے
دن..... حاجیوں سے پھرے قاہرہ..... قاہرہ میں تیار
کاروان حج کے دن.....

کیسے تازہ تیار کر وہ کون ہیں.....
”کاروان کے ساتھ ہو؟ ہاں مہمان ہی لگتی ہو،
وہاں جا کر میرے لیے بھی دعا کرنا۔“
”ہم کاروان میں شامل نہیں ہیں۔ ہم وہاں

رکھنا چاہتی تھیں۔ تب ان کے نام کچھ اور تھے لیکن اب وہ نام بدل چکی تھیں۔ تو بہ کر کے تاب ہو چکی تھیں۔ شہر کے دوسرے کنارے سے اس کنارے کی طرف ہجرت کر چکی تھیں۔

شہر کا وہ کنارہ جو ”قبر خانہ“ کہلاتا ہے۔

شہر کا یہ کنارہ جہاں محل اپنی شان دکھاتا ہے۔ جیسے زمین کے کنارے، ویسے آسمان کے کنارے، نہ ستون، نہ میزبیاں، بس درجے اور منزلیں۔

نماز شرف ملاقات..... حج شرف عشق دیوانہ وار ہے۔

☆☆☆

کلام پاک، خلاف پاک، نے ان کی بے نور آنکھوں کو نور کر دیا تھا۔ قاہرہ کے رہنے والوں کی آوازیں حمد و ثناء سے معطر تھیں۔ وہ بھی زیر لب حمد و ثناء کر رہی تھیں۔ دیوانہ وار پھول پھینک رہی تھیں۔ ”سبحان اللہ“ بے ساختہ آمنہ نے تعریف کی۔

”الحمد للہ“ جنت نے اب جانا تھا کہ شکر کا لمحہ کب آتا ہے۔

”ان شاء اللہ“ عزیزہ نے دل کی دعا، روح کی نیت پر کہا۔

انہوں نے زندگی میں کبھی ایسی خوشی حاصل نہیں کی تھی، جو اس وقت کر چکی تھیں۔ جب تک محل نظروں سے اوجھل نہیں ہو گیا، وہ وہیں کھڑی رہی تھیں۔ پھر تینوں ایک ایک کر کے گنبد کے چبوترے سے کود گئیں۔ نماز جمعہ کا وقت ہونے والا تھا۔ مسجد میں نمازیوں کی تعداد بڑھنے لگی تھی۔

”تم سب کہاں سے آ رہی ہو؟“ وہ مسجد کی میزبیاں اُتر کر وضو کے لیے حوض کی سمت جا رہی تھیں کہ مسجد کے خادم نے حیران پریشان ہو کر پوچھا۔

”ہم اوپر تھیں۔ محل شریف دیکھنے گئی تھیں۔“ عزیزہ جرات مند تھی۔ حق پر بھی گئی۔

خادم کا منہ بن گیا۔ ”یہ مسجد ہے، اہرام نہیں کہتم۔ کوئی بھلاگتی اوپر چڑھ جاؤ۔“

”یہ اللہ کا گھر ہے اور اللہ کے گھر پر اللہ کے بندے کا حق ہے۔ ہم نے مسجد کے کسی بھی حصے کی بے حرمتی نہیں کی۔“

خادم حیران عزیزہ کو دیکھ رہا تھا۔ ”تمہاری زبان فتنی کی طرح چل رہی ہے۔“

”یہ فتنی تمہیں کاٹ نہ دے۔ ذرا پیچھے ہٹ جاؤ، ہمیں نماز بھی پڑھنی ہے۔“ جنت دونوں کے درمیان میں سے جگہ بناتے ہوئے حوض کی سمت بڑھ گئی۔

مسجد میں حج پر جانے والے نمازیوں کی تعداد زیادہ تھی۔ عورتوں کا حصہ بھی کچھ بھرا ہوا تھا۔ وہ تینوں ایک ایک کوفور سے دیکھ رہی تھیں۔

”آپ تو بہت خوش ہوں گی ناں؟“ نماز جمعہ کے بعد وہ ایک سیاہ فام عورت کے پاس آکر بیٹھ گئیں۔ پوچھے بغیر رہا نہیں گیا تھا۔

عورت عاجزی سے ہنس دی۔ ”الحمد للہ! کیا نام ہے تمہارا؟“

”میرا نام عزیزہ ہے، میں ایک بہادر لڑکی ہوں۔ یہ جنت ہے، اس عیشی ڈرپوک لڑکی پورے مصر میں نہیں ملے گی۔ اور یہ آمنہ ہے، یہ کسی نہ کسی بیماری کا شکار رہتی ہے، کچھ دیر پہلے یہ اندھے پن کا شکار تھی، کچھ دیر بعد یہ نکلنے سے پن کا شکار ہو جائے گی۔ یہ صورت حال کے ساتھ ساتھ اپنی پیاریاں بدلتی ہے، ویسے اس کی سب سے بڑی بیماری اس کا انسان ہونا ہے۔“

عورت ہنسی ہی دیر تک ہنسی رہی۔ ”بہنیں ہو؟“

”نہیں۔۔۔۔۔ سہیلیاں۔۔۔۔۔ بہت خوش قسمت ہیں آپ، ایسا کریں مجھے بھی اپنے ساتھ لے جائیں۔“ عزیزہ نے ہنسنے بغیر کہا۔

”میرے اختیار میں ہو تو میں ایک ایک

مسلمان کو اپنے ساتھ لے جاؤں۔ وہاں جا کر میں تم تینوں کے لیے دعا کروں گی۔ تم تینوں کا نام لے کر کروں گی۔ جب میرے گھر کے سامنے سے قافلے گزر کر گزر کر جایا کرتے تھے تو میں بھی چلا چلا کر ایک ایک سے کہتی تھی کہ ام بانی کا نام لے کر دعا کرنا کہ وہ اللہ کے گھر کا سفر اختیار کرے۔ پتا نہیں کس کی دعا مجھے لگ گئی ہے۔ میں نے اور میرے شوہر نے نو سال مٹی کے برتن بنائے ہیں پھر بھی کسی قافلے کے ساتھ آنے کی جرأت نہیں کر سکے۔ ہم نے اپنے پیٹ نہیں کائے، ہنس کائے ہیں۔

ایک بار سب چوری ہو گیا تھا۔ میرے جانور مر گئے، بارشوں نے گھر تباہ کر دیا۔ یہ دسواں سال تھا، پھر گیارہویں سال میں نے اسباب کے بجائے اعمال جوڑنے شروع کر دیے۔ میں نے ضد کے گھڑے کو چاہت کے پانی میں بدل دیا۔ سفر کے شوق کو محبت کی لبیک میں اور ایسے میرا رخ بدل گیا۔ میرے شوہر کی صاحب حیثیت عورت نے میرا سفر خرچ ادا کیا ہے۔ وجہ کوئی بھی بنے، حکم بس ایک کا ہی چلتا ہے اور تب ہی سب ہوتا ہے۔“

محبت کا لبیک..... حکم..... عمل..... چاہت کا پانی۔

سب سوال اور سب جواب ختم ہو گئے۔ تینوں چپ چاپ، مسجد سے باہر آ گئی تھیں۔ بازار سے ہو کر، کلیوں سے گزر کر، شہر کے اجازت کنارے پر آباد، درویش کے درویش صفت گھر کی سمت۔ میدان میں بچے فرضی شیطان کو نکلنے باں مار رہے تھے۔

”میں حج پر جانا چاہتی ہوں۔“ چلتے چلتے رک کر عزیزہ نے کہا۔ ”وہ ہمارے رب کا گھر ہے، اس پر ہمارا بھی حق ہے۔“

”ہم صاحب اعمال نہیں ہیں عزیزہ! ہم صاحب گناہ ہیں۔“ آمنہ کو عزیزہ کی بات سن کر حیرت ہوئی تھی۔

”ہمارا ماضی ہمارے فرائض کے راستے میں کھڑا نہیں ہو سکتا۔ تو بہ میری ڈھال بن چکی ہے، اس

پر مایوسی کا ہتھیار نہ چلاؤ۔ ہم بھی کسی عام مسلمان کی طرح کی انسان ہیں۔ ماضی ہمارا انجام ملے نہیں کر سکتا۔ وہ ہمارا سامان سفر، تاج و بریاؤ نہیں کر سکتا۔ دونوں اس کی شکل دیکھ رہی تھیں۔

”میں نے اس رب کے لیے سب کچھ چھوڑ دیا، اس نے مجھے ہدایت دی تو میں نے بھی ”لبیک“ کہا۔ میرے گناہ سیاہ سمندر، اس کا رحم بے کنارہ بحر۔ میرے گناہ زمین سے آسمان، اس کی بخشش ساتوں آسمان۔“

”بے شک!“ آمنہ نے بے ساختہ کہا۔

”کیا تم دونوں نے بھی یہی نہیں کیا؟ میرا حسن جو چاند کا گلزار تھا، میں نے اسے کتر بچھا تو کس لیے؟ مخلوق سے نکل کر خود کو خاک کیا تو کس کے لیے؟ کس چیز نے مجھے ایسے بدرنگ پھنے پرانے کپڑے پہننے پر مجبور کر دیا؟ وہ کیا ہے جس کے آگے رحیم و کواب بے حیثیت ہیں؟ میرے جواہر پتھر کے ٹکڑے ہیں؟“

کھیل کود کرتے بچوں کے شور کی وجہ سے اسے اپنی آواز بلند کرنی پڑی تھی۔ دونوں خاموش تھیں۔

”کیا یہ سب میں نے اپنے رب کے لیے نہیں کیا؟ راہ حق پر چلنے کے لیے میں نے ایک بار بھی پلٹ کر پیچھے نہیں دیکھا۔ کسی چیز کے لالچ نے میرا دامن نہیں چھینا۔ ہمارا رب..... جس کی محبت میں ہم نے سب کچھ چھوڑ دیا۔ دنیا کو خاک کیا اور عرش والے کے لیے اہتمام کیا۔ نماز قائم کی اور روزوں کے لیے تیار کی۔ تو کیا اس رب کے گھر کے طواف پر ہمارا حق نہیں؟“

”ہم کا روانہ حج میں شامل نہیں ہو سکتے اس سال نہ آنے والے کسی سال۔“ جنت کو اس کی نیت توڑنی ہی پڑی۔

”یہ اہتمام اللہ کو کر لینے دو۔“ اس کی نیت ارادے میں بدل چکی تھی۔

”ہمیں یہ سفر کوئی اختیار کرنے نہیں دے گا۔“ آمنہ نے حقیقت بیان کی۔

”یہ اختیار، اختیار والا دیکھ لے گا۔۔۔۔۔“ اس نے ”یقین“ کی ترجمانی کی۔

عزیزہ ان دونوں سے عمر میں چھوٹی تھی، اپنے گھنے بالوں کو وہ دو حصوں میں بانٹ کر بل دے کر نیچے گرہ لگا لیتی تھی۔ خاموش رہتی تھی تو بہت بھولی بھالی لگتی تھی، بولتی تھی تو ہوش اڑا دیتی تھی۔ یہ وہی تھی جس نے درویش کی تبلیغ پر توبہ میں پہل کی تھی۔ یہ وہی تھی جس کی وجہ سے وہ دونوں آج اس کے ساتھ تھیں۔ شہر کے اُس کنارے سے دور، شہر کے اُس کنارے میں مشغول، درویش کے گھر، مسجد کے پڑوس میں، بد رنگ کپڑوں میں لیکن اعلیٰ روح کے ساتھ۔

☆☆☆

”میں جانتا تھا کہ میرا امتحان آنے والا ہے۔“ روٹی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر کے درویش پانی سے بھری رکابی میں بھجورہا تھا۔ یہ اس کا پسندیدہ کھانا تھا۔ اس کا اصل نام منان یوسف تھا لیکن وہ درویش کے لقب سے مشہور تھا۔

”امتحان خوش نصیبوں کو نصیب ہوتے ہیں۔“ بے ساختہ عزیزہ کے منہ سے نکلا تھا۔

”تم حج پر کیوں جانا چاہتی ہو؟“ وہ تینوں سے پوچھ رہا تھا۔ یہ سب لوگ چوبیس کے پاس بیٹھے تھے۔ درویش کی بیوی روٹیاں پکا رہی تھی۔ جنت سب کو کھانا نکال نکال کر دے رہی تھی۔ عزیزہ کھانچکی اور آٹن کا دل کھانے سے اٹھ چکا تھا۔

”بتاؤ جنت! کیوں جانا چاہتی ہو؟ تم تو صاحب حیثیت بھی نہیں ہو؟“ پہلا نوالہ اٹھا کر درویش نے اپنی بڑی بیٹی کی طرف بڑھایا اور اس کے منہ میں ڈال دیا۔

”میں صاحب چاہت ہوں درویش؟“ اب جنت اپنے لیے کھانا نکال رہی تھی۔ درویش نے گھبرا سانس لیا۔ ”اور تم آمنہ؟ کیوں جانا چاہتی ہو؟“

کی جا سکتی ہیں۔ نماز زمین کے کسی بھی ٹکڑے پر پڑھی جا سکتی ہے، پانی، پہاڑ، صحرا، جنگل۔۔۔۔۔ بارش، طوفان، گرمی، سردی۔۔۔۔۔ رمضان کے روزے اور زکوٰۃ کی ادائیگی بھی۔ لیکن حج صرف ایک مقام پر ادا ہوتا ہے۔ میں اس ”ایک گھر“ جانا چاہتی ہوں۔

”تو تم زیارت کرنا چاہتی ہو؟“ درویش نے دوسرا نوالہ چھوٹی بیٹی کے منہ میں ڈالا۔

”اللہ کو اتنا جہاد پسند ہے، سفر اور اہتمام سفر پسند ہے۔ ہمارا چل کر، دوڑ کر، بے تاب ہو کر، بے قرار ہو کر آنا۔ دنیا کے کناروں سے نکل کر مرکز کی طرف بھاگنا۔ قیامت کے دن بھی ایسا ہی ہو گا۔۔۔۔۔“

”اور تم عزیزہ۔۔۔۔۔؟“ درویش اپنا کھانا ختم کر چکا تھا۔ لمبے وقفے کے بعد وہ عزیزہ سے پوچھ رہا تھا۔

”لیک کہنے درویش۔۔۔۔۔“ وہ اس سے زیادہ، اس سے کم کچھ نہیں کہنا چاہتی تھی۔ درویش ہزار بار پوچھتا، وہ ہزار بار یہی جواب دیتی۔

”لیک کہنے۔۔۔۔۔؟“ کھٹے کھڑے کر کے، درویش نے سر کو دیوار کے ساتھ لگا لیا تھا۔

”تم نے ایسی باتیں کیسے سیکھیں عزیزہ؟“ وہ زیر لب بڑبڑا رہا تھا۔

☆☆☆

امیر انج۔۔۔۔۔ امیر کاروان۔۔۔۔۔ برکات ابن موسیٰ کو سر کھانے کی فرصت نہیں تھی۔ تین دن بعد کاروان حج کی روانگی تھی۔ آج صبح اندلس سے آخری قافلہ بھی آچکا تھا۔ کاروان میں حاجیوں کی تعداد دس ہزار کے قریب پہنچ چکی تھی۔ یہ بلاشبہ اب تک کا سب سے بڑا کاروان تھا۔ عالم اسلام میں اس کاروان کی روانگی کی جتنی جھوم تھی، امیر انج پر اتنی ہی زیادہ ذمہ داریاں تھیں۔ کچھ حامد بن جمل رہے تھے کہ عالم اسلام کا اتنا بڑا کاروان ابن موسیٰ کی سربراہی میں جا رہا ہے۔ کچھ دل والے خوش تھے کہ یہ رجبہ ابن برکات کو حاصل ہو رہا ہے۔

رات کا آخری پہر تھا اور وہ میدان کاروان میں انتظامات دیکھنے میں مصروف تھا۔ اناج، جانور، شاہی دستے۔۔۔۔۔ دور، دور تک حاجیوں کے اونٹ ہی اونٹ دکھائی دے رہے تھے۔ خیمے تھے، گھوڑے، شہر اور کاروان کا سامان تھا۔ وہ یہ سب دیکھ کر پھولے نہیں سارہا تھا۔ اس کی سربراہی میں جانے والا یہ دوسرا کاروان حج تھا۔ پہلے کاروان کی واپسی پر، مصر میں اس کا شاندار استقبال کیا گیا تھا۔ اس نے بدوؤں کے حملے کو بری طرح سے پسپا کر دیا تھا۔ اس کی بہادری اور شجاعت کے ڈٹکے بیٹے لگے تھے۔

مصر میں وہ مقبول عام تھا۔ قاہرہ میں ہر دل عزیز تھا۔ لوگ اس سے محبت کرنے پر مجبور تھے۔ وہ ان کے دلوں کا سکون بن گیا تھا۔ بچے اسے دیکھ کر ”امیر انج“ بننے کے خواب دیکھنے لگے تھے۔

”کیا آپ مجھے اپنے ساتھ حج پر لے جائیں گے۔“ اسے روک کر بچے یہ سوال کرنا پسند کرتے۔

”لیکن تم ابھی بہت چھوٹے ہو۔۔۔۔۔“ وہ گھٹنوں کے بل بچوں کے گردہ کے پاس بیٹھ گیا۔

”کیا اللہ چھوٹے بچوں کو اپنے گھر آنے کی اجازت نہیں دیتا؟“

”بالکل دیتا ہے۔۔۔۔۔ لیکن تم اتنا لمبا سفر نہیں کر سکو گے۔۔۔۔۔ والدہ والدہ کے ساتھ جا سکتے ہو۔۔۔۔۔“

”والدہ کہتے ہیں وہ غریب ہیں، والدہ کہتی ہیں وہ غریب کی زودہ ہیں۔ میں دو غریبوں کا معصوم ”بیٹا“ ہوں، کیا کروں اب؟“

”اب تم دو غریبوں کے امیر ہونے کی دعا کرو۔“ برکات ابن موسیٰ ہنسے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔

”آپ امیر انج کیسے بنے؟“ غریب بچے کے ساتھ کھڑے امیر بچے نے پوچھا۔

”میں؟“ میری والدہ حج کرنے کے لیے گئی تھیں اور پھر واپس نہیں آسکی تھیں۔۔۔۔۔ گھبرا سانس۔۔۔۔۔ گہری آہ۔۔۔۔۔

”آپ بدوؤں سے بدلہ لینے کے لیے امیر انج بنے؟ والدہ کہتے ہیں آپ نے بدوؤں کو حرا چکھا

دیا تھا۔“

وہ ہنس دیتا، رونا چھپا لیتا، وہ ساری دنیا کے بدوؤں کو حرا چکھا دیتا تو بھی والدہ کو واپس نہیں لاسکتا تھا۔ جو اس کی پیشانی چوم کر اونٹ پر سوار ہوتی تھیں، وہ پھر فریضہ اجل کے ساتھ پرواز کر گئی تھیں۔ ان دنوں وہ ہر روز کاروان کی دانی کی راہ دیکھا کرتا تھا۔ شہر کے جس کنارے سے اس نے والدہ کو رخصت کیا تھا، اس کنارے پر کھڑا ہو کر وہ انہیں خوش آمدید کہنے کے لیے بے تاب رہتا تھا۔ بیوہ ماں کے بچوں کے پاس انتظار کے سوا ہوتا ہی کیا ہے۔ دکھائی دینے والی ایک صورت، سنائی دینے والی بس ایک آواز، تسلی دینے والا بس ایک دل۔۔۔۔۔ ساری زندگی کا سرمایہ بس ایک ”ماں“۔۔۔۔۔ قیمتی بچوں کے دل کی ہر ایک دھڑکن ماں کے دل کے ساتھ دھڑکتی ہے۔

جس دن کاروان واپس آیا، وہ پاگلوں کی طرح کاروان کے پیچھے بھاگا تھا، سارا شہر استقبال کے لیے موجود تھا۔ وہ ایک ایک اونٹ، ایک ایک حاجی کو دیکھ رہا تھا۔ وہ ایک ایک اونٹ کی سمت دیوانہ وار بھاگ رہا تھا لیکن اسے اپنی حاجن والدہ کہیں دکھائی نہیں دے رہی تھیں۔ سب حاجی اسے روک روک کر گلے سے لگا رہے تھے۔ اس کی پیشانی چوم رہے تھے، اس کی آنکھوں کے آنسو پوچھ رہے تھے جو ماں کو دیکھنے کی ٹرپ میں بہہ نکلے تھے۔

”تمہاری والدہ بدوؤں کے حملے میں شہید ہو چکی ہیں میرے بیٹے۔۔۔۔۔“

امیر انج اس کے پاس آ کر اسے سینے سے لگا کر بتا رہے تھے۔ حج بھی اور شہادت بھی۔۔۔۔۔ اتنے سارے حاجیوں کے سینے سے لٹکنے کے باوجود صبر کی اتنی زیادہ تحکیماں ملنے کے باوجود وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا تھا۔ زمین پر ڈھیر ہو کر، زمین کی مٹی سے مٹھیاں بھر کر۔

”اب زمین کی ہر شے مجھ سے زیادہ خوش قسمت کہلائے گی، وہ چوبیس کی را کہ اور سو گئی گھاس کا تنکا ہی کیوں نہ ہو۔“

اسلام آنے سے پہلے تھی۔ جن باتوں کو جاہلیت قرار دیا گیا، ان کے نام بدل کر لوگوں نے انہیں ”قاعدے قانون“ کا نام دے دیا۔ حق تو آگیا لیکن دلوں کا باطل نہیں مٹا۔“

آمنہ خاموشی سے اٹھ گئی۔ نہ اٹھتی تو پتا نہیں کتنے اور سوال پوچھ لیتی۔ وہ شوخ و چیل تھی۔ پیچھے جو کچھ چھوڑا، آگے اس سے بڑھ کر پالیا۔ کھر دری زمین پر پیال پر سوتے ہوئے اس نے اپنی ہڈی کو کند نہیں ہونے دیا تھا۔ لیکن اب اسے لگا کہ وہ کبھی مسکرا نہیں سکے گی۔ وہ کبھی اس حقیقت کو بھول نہیں پائے گی کہ وہ کون ہیں اور کیا کرتی رہی ہیں۔

”کیا ہمیں اپنے گناہ یاد رکھنے چاہئیں یا اوقات؟“ جنت نے درویش کی بیوی سے پوچھا۔ وہ دوسوں کا شکار تھی۔

”تمہیں صرف اللہ کی رحمت کو یاد رکھنا ہے، تمہیں تمہاری حیثیت خود بخود معلوم ہو جائے گی۔“

رحمان کی رحمت کو یاد رکھنے کے لیے انہیں اپنی حیثیت بھولنی تھی۔ عزیزہ خاموش تھی لیکن اندر ہی اندر غصے سے تل کھا رہی تھی۔ وہ اپنا غصہ نکال دینا چاہتی۔ درویش نے لاکھ بچھا یا تھا کہ غصہ ختم کا دشمن ہوتا ہے لیکن وہ اس دشمن کو بال بوس کر بڑا کر دیا کرتی تھی۔ غصہ ویسے بھی ہر وقت استعمال میں نہیں لائی جاسکتی تھی۔ وہ دل کی کمزور ہو سکتی تھی لیکن ارادوں کی مضبوطی تھی۔

سر باز درویش سے پہلی ملاقات کے بعد اس نے نیت کر لی تھی کہ وہ جلد سے جلد اپنی جگہ چھوڑ دے گی۔ دو دن بعد وہ ان دونوں کو ساتھ لیے کر درویش کے ساتھ سیدھے راستے کی طرف آگئی تھی۔

راستہ جتنا سیدھا ہو، اس پر چلنا اتنا ہی مشکل ہوتا ہے۔ پتھر نہ ملیں تو سنگر ملتے ہیں۔ حق پر چلنے والوں کو اعزاز نہ ملے تو دھکا لگتی ہے۔ تاہم ہوتا آسان تھا۔ ہر وہ کام جو بندے اور اللہ کے درمیان ہوتا ہے، آسان ہوتا ہے۔ وہ آسانیاں دیتا ہے۔ فرض دیتا ہے تو قضا بھی رکھتا ہے۔ گناہ کے بعد توبہ کی

شفا بھی دیتا ہے۔ یہ وصف انسانوں نے نہیں اپنایا۔

تینوں کے لیے وہ رات کانٹوں کا بستر تھی۔ جس دن درویش انہیں ملا تھا، انہیں ہدایت مل گئی تھی۔ جس دن حمل شریف بران کی نظر پڑی تھی، انہیں راستہ مل گیا تھا۔ جس لمحے حج کی نیت کی، اسی لمحے بندگی کی منزل دکھائی دی۔

سفر زندگی کا ہو یا بندگی کا۔ ارادے کی مضبوطی شرط ہے۔

حقیقت جان لینے کے بعد کہ وہ کبھی بھی حج کے لیے نہیں جاسکیں گی، ان کے دل گہری اداسی میں گھر گئے تھے۔ کوئی امیرانج انہیں کاروان میں قبول نہیں کرے گا۔ کوئی انہیں خوش آمدید نہیں کہے گا۔ سب انہیں ملامت کریں گے کہ وہ کبوتہ الکعبہ کے ساتھ سفر کرنے کی جرات بھی کیسے کر سکتی ہیں۔

عزیزہ نے ایک جرات کی تھی۔ وہ میدان کاروان میں امیرانج کو ڈھونڈنے کی تھی۔

میدان کاروان میں مصر اور قرب و جوار کی ریاستوں سے قافلے آچکے تھے۔ چند قافلے رہ گئے تھے جو اگلے دن تک پہنچنے والے تھے۔ شہر کے مہمان خانے، شاہی مراہیں، میدان، حاجیوں سے آباد ہو چکے تھے۔ میدان میں ہر طرف خیمے ہی خیمے تھے۔ قاہرہ کے لوگ حاجیوں سے ملنے کے لیے میدان کاروان آتے تھے۔

عزیزہ بھی آمنہ اور جنت کے ساتھ آئی تھی۔ درویش کی بیوی اپنے ساتھ کھانے پینے کی کچھ ایسی زبردست چیزیں لائی تھی جو سفر کی تکان کو زائل کرنے میں مدد دیتی ہیں۔ وہ چند عورتوں کو بہت عاجزی سے وہ چیزیں پیش کر رہی تھی۔

عزیزہ نے امیرانج کو انتظامات میں مشغول دیکھ لیا تھا۔ وہ منہ بنائے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔ وہ ضدی، بدتمیز اور منہ پھٹ مشہور تھی لیکن درویش کے کہنے پر اسی نے ان بیماریوں سے جان چھڑائی تھی

لیکن ایک بیماری ابھی تک اسے چھٹی ہوئی تھی۔ وہ تھی بھڑک اٹھنے کی بیماری۔ چنگاری کے آگ بن جانے کی بیماری۔ اس کا دل چاہا کہ امیر کاروان کے پاس جائے اور کھری کھری سنا دے۔

وہ ایسا تو نہیں کر سکی لیکن ایک معمولی سا پتھر اٹھا کر اسے غیر معمولی انداز سے مارے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔ امیر کاروان بھی جلالی انداز سے ملے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ جو لوگ کہتے ہیں کہ توپ کے گولے تباہ و برباد کر دیتے ہیں، وہ لوگ تو کیلے پتھر کمر بکھا کر دیکھیں۔ تباہ و برباد نہ سکی، خانہ برباد یہ بھی کر دیتے ہیں۔

پیچھے عورتیں، مرد، بچے، بوڑھے سب موجود تھے۔ جس طرف نظر اٹھتی تھی انسان ہی انسان دکھائی دے رہے تھے۔ ہاں ایک لڑکی چادر میں منہ چھپا رہی تھی، اور ایسا کرتے ہوئے صاف دکھائی دے رہی تھی۔ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا اس کے قریب آیا۔ اس نے بھی بھاگنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ گولہ مار کر توپ، زمین پر جم کر کھڑی رہی تھی۔

”تم نے مجھے پتھر کیوں مارا۔۔۔۔۔؟“ وہ حیران ہوئی تھی، پریشان بھی ہوئی تھی، گھبرا بھی گئی تھی لیکن۔۔۔۔۔

”آپ سے کس نے کہا کہ میں نے مارا ہے؟“ سوال کو گھمانا نہیں بھولی تھی۔

”میں امیر کاروان ہوں، صحرا کی ہوا اپنا رخ بعد میں بدلتی ہے میں اس کی سمت پہلے پکڑ لیتا ہوں۔“

”ہو نہ! صحرا اور ہوا کے کچھ ملتے۔ ہاں مارا ہے۔۔۔۔۔ مومن ملتا تو اور ماروں گی۔ کوئی جن جن مل گیا تو اہرام اٹھا کر وہ ماروں گی۔ جنوں کی فوج مل گئی تو ساری دنیا کے پہاڑ اٹھا کر وہ ماروں گی۔۔۔۔۔“

لڑکی غصے میں تھی، لیکن اس کی باتیں۔۔۔۔۔ ”میں نے کیا کیا ہے؟“ وہ ہنسنا چاہتا تھا لیکن عقیدہ صورت پوچھ رہا تھا۔

”تم امیرانج ہو لیکن دل کے سیاہ ہو۔۔۔۔۔“

مصر کی شان، قاہرہ کا ہر دل عزیز امیر کارواں، لوگ رک کر اسے سلام کرتے تھے، احترام دیتے تھے، یہ لڑکی اسے دل کا سیاہ کھڑی تھی۔ ”کون ہو تم؟“ کارواں میں شامل ہوئے۔

”ہاں، لیکن تمہارے کارواں میں نہیں۔۔۔۔۔ زندگی کے کارواں میں، جس کا امیر ”رب العالمین“ ہے۔“

وہ لا جواب ہوا تھا لیکن لڑکی کے غصے کی وجہ نہیں سمجھ سکا تھا۔ وہ جا چکی تھی۔ اس کی کمر لگ رہی تھی۔ اس جیسے پہاڑ انسان کے لیے معمولی سا سنگر آگ کا گولہ تو نہیں تھا لیکن پشت جل رہی تھی۔

☆☆☆

وہ گھر آیا تو بچے کارواں کارواں کھیل رہے تھے۔ وہ حج پر جانے والوں کے لیے قرعہ نکال رہے تھے۔ یہ اس کے خالہ زاد بھائی کے بچے تھے۔ اس کا ان سے بہت پیار تھا۔ خاص طور پر احمد سے۔ ٹھٹھڑے پانی کا پیالہ منہ سے لگا کر، نشست پر بیٹھ کر وہ دھچکی سے انہیں دیکھنے لگا تھا۔

اب وہ جانوروں اور انسان کی باتیں کر رہے تھے۔ راستہ دکھانے والے آسمان کے ستاروں اور ریت کے طوفان کی۔ انہیں دیکھ کر وہ ہنستا رہا۔ وہ اس کی نقل اتار رہے تھے۔ جب کارواں کی روانگی کا وقت آیا تو کھیل میں شامل سب بچے اپنا اپنا سامان اٹھا کر اپنے فرضی جانوروں پر سوار ہو گئے۔ اور مٹی میں کھیلنا چھ سالہ احمد، ایک دم سے چل کر ان کی طرف لپکا۔

وہ عام بچوں جیسا نہیں تھا، اسے دماغی مسئلہ تھا۔ اس کی زبان میں نکتہ بھی تھی۔ ابن موسیٰ نے لپک کر احمد کو اپنی گود میں اٹھالیا۔ لیکن وہ چل رہا تھا، رو رہا تھا، سب بچوں کو گالیاں دے رہا تھا کہ وہ اسے چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ ابن موسیٰ نے جلدی جلدی اس کا سامان تیار کیا اور اسے فرضی جانور پر سوار کر کے کارواں میں شامل کرنا چاہا تو امیر کارواں دانیال چلا اٹھا۔

”یہ ہمارے ساتھ نہیں جائے گا چچا۔“
”لیکن کیوں؟ بھائی کو پیچھے چھوڑ کر جا رہے ہو، بری بات ہوئی ہے۔“

”کیونکہ یہ روٹا اور چلتا ہے۔۔۔۔۔۔ یہ گالیاں دیتا ہے۔۔۔۔۔۔ یہ برا انسان ہے۔۔۔۔۔۔“

”یہ برا انسان نہیں ہے۔ اسے اچھے اور برے کی سمجھ نہیں ہے، جلد ہی یہ سمجھ دار ہو جائے گا۔۔۔۔۔۔“

اس نے محل سے سمجھانا چاہا۔
”جیسے اچھے برے کی سمجھ نہیں ہے، اس پر حج بھی فرض نہیں ہے۔“

اس کا دل کٹ کر رہ گیا تھا۔

”حج ہر صاحب حیثیت مسلمان پر فرض ہے میرے بیٹے! بیمار یا تندرست پر نہیں۔“

”یہ بیمار ہے، یہ اتنا لبا سفر نہیں کر سکتا۔“

”یہ بیمار نہیں ہے۔۔۔۔۔۔ تمہارے بھائی کا دامغ اس کا ساتھ نہیں دیتا۔“

”جس کا دامغ ساتھ نہیں دیتا، اسے ہم ساتھ نہیں رکھ سکتے۔ ایسے انسان کا اللہ کے گھر میں کیا کام، جو ہر انسان کو برا بھلا کہے، اسے گالیاں دے۔

کیا بری زبان والے اللہ کا گھر دیکھنے کے حق دار ہیں؟“

”دوسروں کے حق پر لکیر کھینچنے والے تم کون ہوتے ہو۔ یہ نہیں جانتا، یہ کیا کہہ رہا ہے۔“ بچوں کی تنگ دلی پردہ چاکارہ کیا تھا۔

”جب یہ نہیں جانتا کہ یہ کیا کہہ رہا ہے تو پھر وہ کیسے کہے گا جو اسے کہنا چاہیے۔ جو حاجی طواف کرتے ہوئے کہتے ہیں۔“

”انسان اپنی حاضری کی گواہی زبان سے نہیں روح سے دیتا ہے میری جان۔۔۔۔۔۔“

”روح کیا ہوتی ہے چچا جان؟ ہم تو اس کی زبان کو جانتے ہیں جو گندی ہے، مکت زبہ ہے۔ اس کا جسم بدبودار ہے۔ یہ ناپاک ہے۔ یہ اللہ کے پاک گھر میں کیسے جا سکتا ہے۔ صرف اس لیے کہ امیر کارواں اس کا بھائی ہے۔ نہیں۔۔۔۔۔۔ میں یہ نا انصافی

نہیں کروں گا۔“

”گندی، بدبودار، ناپاک۔۔۔۔۔۔“ ابن موسیٰ نے لب بڑبڑایا۔ بچوں کا کارواں اپنے فرضی جانوروں پر آگے بڑھ گیا تھا۔ پیچھے احمد دھاڑیں مار مار کر رونے لگا تھا۔ وہ اس کی گود سے پھسل گیا اور زمین پر لوٹ پوٹ ہونے لگا۔ اس کے رونے کی آواز، اس کے درد کی شدت۔۔۔۔۔۔ اس نے آگے چلے جانے والوں کو اور پیچھے رہ جانے والے کو دیکھا۔

جو پیچھے رہ جاتے ہیں۔۔۔۔۔۔ دراصل وہی آگے والوں سے آگے نکل جاتے ہیں۔۔۔۔۔۔

احمد کے آسودوں سے ترگاؤں نے اس کا دل دوکڑے کر ڈالا تھا۔ وہ بار بار ہاتھ اٹھا کر کارواں والوں کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ کارواں کے امیر نے جھجک کر احمد کو اٹھایا، اپنے سینے سے لگایا اور قافلوں کی گلیوں سے گزرتے ہوئے خود کو کہتے پایا۔

”ایک اللہ کے لیے، ایک اللہ والا لے جاؤ۔۔۔۔۔۔“

نیت، عمل اور ارادے غلط ہو سکتے ہیں لیکن تڑپ ہمیشہ سچی ہوتی ہے۔ تڑپے بغیر کوئی نہیں روتا، بے چین ہوئے بغیر کوئی طلب نہیں کرتا۔ دعا ہو یا دوا، زخم ملے بغیر کوئی نہیں مانگتا۔ امیر کارواں نے قاہرہ کی پتھریلی زمین پر چلتے ہوئے خود سے کہا۔

احمد ابھی تک رو رہا تھا، چل رہا تھا۔ اس کے غم کو چین نہیں تھا۔ اس کے دل کو سکون نہیں تھا۔

وہ درویش کے دروازے پر دستک دے رہا تھا۔۔۔۔۔۔

”مجھے معاف کرو درویش! میں ان تینوں کو کارواں میں شامل کرتا ہوں۔ تم ان سے کہو کہ وہ اپنی شناخت چھپا کر رہیں۔ یہ بات ہم پانچ لوگوں کے درمیان لاشی جا رہی ہے۔۔۔۔۔۔“

دروازہ کھلتے ہی امیر راج نے اپنی نرم آنکھیں پونچھے بغیر کہنا شروع کر دیا تھا۔ سامنے درویشی نہیں ”مزیدہ“ کھڑی تھی۔ وہ حیران امیر راج کی صورت دیکھ رہی تھی۔ وہ شرمندہ تھی، خوش تھی، خوشی

سے تباہ ہو رہی تھی۔۔۔۔۔۔
”کس چیز نے آپ کے اردائے کو بدل دیا؟“ وہ پوچھے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔

امیر راج نے دیکھا کہ اسے پتھر مارنے والی سامنے کھڑی پوچھ رہی ہے۔ اس نے احمد کی طرف دیکھا اور کہا۔

”حق نے۔۔۔۔۔۔“

☆ ☆ ☆

ایک اللہ کے لیے تین اللہ والے۔۔۔۔۔۔
منہ اندھیرے نکل کر انہوں نے خیموں میں سے ایک خیمے میں پناہ لے لی تھی۔ وہیں سے انہیں اونٹوں پر سوار ہو جانا تھا۔ ابن موسیٰ نے ان سے سختی سے کہا تھا کہ انہیں کسی سے بھی بات نہیں کرنی۔ اپنی شناخت چھپا کر رکھنی ہے۔ خود کو گناہنا لینا ہے۔ کوئی ان کی آواز تک سے انہیں پہچان نہ سکے۔ حج کے لیے کیا جانے والا سفر مشکل ہوتا ہے، ان کے لیے کچھ زیادہ ہی مشکل ہونے والا تھا۔

احرام، دینی قرآن پاک، جائے نماز اور کچھ ضروری سامان۔۔۔۔۔۔ یہی تو ہے اصل سامان۔۔۔۔۔۔

سفر حج اور سفر حیات، دونوں کے لیے۔ پھر اس سے زیادہ کیا حج کرنا۔ اس سے زیادہ کی چاہت کیوں کرنی۔

درویش نے انہیں نرم آنکھوں کے ساتھ الوداع کیا تھا۔

”جس دن تم نے تائب ہونے کا فیصلہ کیا تھا، وہ دن میری زندگی کا خوب صورت دن تھا۔ اس دن میرے یقین اور پختہ ہو گیا تھا کہ ہدایت نصیب والوں کو نہیں، توہین والوں کو ملتی ہے۔ اللہ کی کے دل میں رانی برابر بھی ایمان دیکھتا ہے تو اسے پوری ہدایت عطا کر دیتا ہے اور یہ اس تک ہی آتی ہے جسے یہ حاصل ہوتی ہو۔

جسے پیام مل گیا وہ جاہل نہیں رہا، جسے سیدھا راستہ دکھایا گیا، اس نے سب کچھ پایا۔

دین صرف کلمہ نہیں اور حج زیارت نہیں۔۔۔۔۔۔

نماز جسم کی حرکات نہیں اور قرآن لفظوں کا پلندہ نہیں۔۔۔۔۔۔ جو توبہ کرے، تائب ہو جائے، اس پر دین کا بار زیادہ آ جاتا ہے۔ جیسے عالم پر علم کا ذمہ ہوتا، جاہل تو بڑی الذمہ ہو جاتا ہے۔ جو توبہ کر چکے ہوں وہ ایمان سے لڑائی الذمہ نہیں ہونے چاہئیں۔

جو عہد کیے ہیں ان پر قائم رہنا۔ ایمان حاصل کرنا آسان ہے، اسے قائم رکھنا مشکل ہے۔ مومن بال سے باریک، ملو اسے تیز صراط (راستے) پر چلتا ہے۔ دیکھو، تمہاری طرف شیطان نے اپنا نشانہ باندھ لیا ہے، ان نشانوں کو خطا کرنا، لیکن خود خطا کار نہ ہو جانا۔ دین حق کا نام ہے، حق کو قائم رکھنے کا نام ہے۔ نماز پڑھنا آسان ہے، اسے قائم رکھنا مشکل ہے، حج کے لیے کمر بستہ ہونا آسان ہے۔۔۔۔۔۔ اس حج کو ”پا“ لینا مشکل ہے۔ احرام سفید ہوتا ہے کیونکہ یہ اعمال کی سیاہی کو سمیٹ لیتا ہے، چھالیتا ہے۔

سفید۔۔۔۔۔۔ جس سے نکل کر ہر رنگ بنتا ہے۔ لیکن یہ کسی رنگ سے نکل کر نہیں بنتا۔ یہ خاص ہے اور یکتا بھی۔ تمہارے لیے اللہ نے یکارنگ کو پسند کیا اور بہترین رنگ تو اللہ کا ہی رنگ ہے۔ اسے اپنا لوگی تو پھر پیچھے رہ بھی جاؤ گی تو بہت آگے نکل جاؤ گی۔“

درویش نے کہا۔ انہوں نے سنا۔ انہوں نے یاد کر لیا۔ تینوں درویش کی احسان مند تھیں۔ درویش کی بیوی انہیں گلے سے لگا رہی تھی۔ انہیں رخصت کرنے والے بس یہ وہی لوگ تھے۔ کارواں کو رخصت کرنے مصر کا ہر خاص و عام آیا تھا۔ مسجد کے امام نے حاجیوں کے لیے اپنی دعا کروائی تھی۔ حج اور سفر حج کی فضیلت بیان کی گئی تھی۔

جس وقت اونٹوں نے اپنے گھٹے کھڑے کیے، اور حاجیوں کو رخصت کرنے والے ہجوم نے اللہ اکبر کے نعرے بلند کیے تو عزیزہ سے اپنی خوشی سنبھالنا مشکل ہو گئی تھی۔ اس نے اپنے پیچھے بیٹھی آمنہ کو دیکھا۔ دائیں طرف جنت کا اونٹ تھا، وہ ایک خاتون کے ساتھ بیٹھی تھی۔ ان تینوں نے درویش کو ہجوم میں ڈھونڈنا چاہا لیکن درویش کی بیوی تو دکھائی

دی ورویش کہیں نظر نہیں آیا۔

انہوں نے اونٹ کی سواری بہت باریکی سے، وہ گھڑ گاڑیوں میں بھی بیٹھی تھیں، انہوں نے مصر کی بند عمارتوں پر بیٹھ کر چاندنی راتوں میں کھانے بھی کھائے تھے۔ اعلیٰ عہدے داروں کو اپنے سامنے گھٹنوں کے بل جھکے ہوئے پایا تھا لیکن انہیں بھی اپنا آپ اتنا بلند نہیں لگا تھا جتنا اس ایک اونٹ پر بیٹھ کر لگ رہا تھا۔

ظاہرہ کے لوگوں کا بھوم، حج پر جانے والوں کے عزیزوں کی پر جوش آوازیں۔ بچپن کا وف بچانا، ہاتھ بلند کر کے انہیں سفر بخیر کی دعائیں دینا اور اپنا نام لے لے کر دعاؤں کے لیے کہنا..... جب انسان اللہ کے راستے پر آ جاتا ہے تو وہ کتنا معتبر ہو جاتا ہے۔ بلندی تھیب ہوئی ہے اور پستی مٹ جاتی ہے۔

کارواں نے اپنا سفر شروع کیا۔ یہ وہی مصر تھا جہاں سے فرعون اپنا لشکر لے کر حق کو نیست و نابود کرنے نکلا تھا۔ یہ وہی مصر تھا جہاں سے خلاف کعبہ کلام پاک اور حاجیوں کا سب سے بڑا کارواں نکلتا رہا تھا۔۔۔۔۔

وقت بدل رہا ہے، حق آتا ہے اور باطل مٹ جاتا ہے۔

عزیزہ نے وہ نام یاد کر لیے تھے جو چند بوڑھی عورتوں نے چلا چلا کر لیے تھے۔ وہ جانے والوں سے اپنے لیے شفا کی دعا میں کروانا چاہتی تھیں۔ جنت کے دل پر عجب ہی ہیبت طاری تھی۔ دس ہزار حاجیوں کا کارواں، زمین کے ہر کونے سے نکل کر، زمین کے ایک گھر کی طرف جانے والے حجاج کرام۔ وہ بہت جگہ بھی تھی اور ممنون بھی۔ آتے تھے گردن گھما کر پیچھے دیکھا۔

سب کچھ پیچھے رہ جاتا ہے..... ایک بندہ اور
اس بندے کا ”رب“ رہ جاتا ہے۔

☆☆☆

کھلا صحرا، ستاروں بھرا آسمان، اونٹوں اور

گھوڑوں کے چلنے کی آواز، مشعلوں کی روشنی.....

اور بیچ کا ثبات..... بیچ زمین و مکان.....
ان تینوں کی سواریاں پیچھے ہیں۔ دُور آ
تک ایک ہی گیر محسوس ہو دکھائی دیتی تھی۔ صحرا
صوفیانہ خاموشی اور کارروائی کی درویشانہ چال۔
عزیزہ کو محسوس دل، اس منظر پر آفریں تھا۔ وہ ا
جلائی منظر کے قیام و طعام پر اپنے دل کو خوشی سے م
یاتی تھی۔ زمین و آسمان سے سمٹ کر ہر ذرہ روح
کمال کو جا رہا ہے۔ جو کل حاصل نہیں تھا، وہ آ
حاصل کرنے جا رہا ہے۔

سفرِ رُوب..... یہ پیدائش سے موت تک کا سفر ہے
سفرِ رضا..... یہ ایک عمل سے دوسرے عمل کا سفر ہے

نینوں سہاٹھا کر آسمان دیکھ رہا تھا۔ انہیں یہ
 توفیق حاصل ہوئی تھی کہ وہ جان سکیں کہ زمین
 مکاں دراصل جس کیا۔ آسمان کا تھا، چڑاگوں کا
 مکاں، یہ دراصل جس کی عظمت کو بیان کرتا ہے۔ صحرا
 کی وسعت، صحرا کی گرمی، سختی اور نرمی، اس کی
 استادی، اس کی چالاکی، اور چال بازی..... اس کا
 دلار، اس کی مہربانی اور اس کی بزرگی، زندگی کی
 نمائندہ ہے۔ پیغام بدل جاتے ہیں لیکن پیغام ایک
 ہی رہتا ہے..... بندے سے پہلے ”رب“ کہتا ہے،
 میں حاضر ہوں میرے بندے، ہر جگہ، ہر ساعت، ہر
 دعا، ہر مقام..... ہر روح..... ہر شے میری مظہر
 ہے..... ہر شہادت میری گواہ ہے۔ ہر تعریف مجھ
 سے شروع، مجھ پر ختم ہے۔

یہ سفر کا بیسواں دن تھا۔ یہ گرم موسم کے دن تھے۔ کبھی موسم متبدل ہو جاتا تھا تو ان کا سفر تیز اور آرام دہ ہو جاتا تھا۔ وہ دن میں پڑاؤ کرتے اور دن ڈھلتے ہی سفر شروع کر دیتے تھے۔ ایسے سفر کے لیے صاحب حیثیت ہونے کے ساتھ صاحب ہمت ہونا بھی بہت ضروری تھا۔ سفر لیے ہی ہوتے ہیں لیکن جو سفر دشمن اور سخت بھی ہوں وہ جہاد ہوتے

”جس انسان نے اللہ کی عظمت کی معمولی سی
دیکھنی ہو، وہ صحرا کی وسعت میں آسمان کی
تاریکی دیکھے، رات میں دیکھے اور ستاروں کی قربت
دیکھے..... عزیز نے سر کو آئینہ کی سمت جھکا کر
”اور کیا کرے؟“ آئینہ نے سر پیچھے اس کی
ت گھما کر پوچھا۔

”اور پھر وہ کائنات کی آواز سنے..... سنے کہ کائنات کیسے متوجع بیان کر رہی ہے۔“ وہ اپنے کان، کائنات کی صلیج پر مرموز رکھنا چاہتی تھی۔

”کائنات کیسے متوجع کر رہی ہے عزیزہ؟“

”الحمد للہ رب العالمین..... رب العالمین.....
الحمد للہ.....“

ریب العالمین کے جہاں میں..... قلعے نما چار
واری تھی..... کارواں سرائے..... حایوں کے
نوی قیام کے لیے خلیفہ نے بنوائی تھی۔ ایک کنواں
ماء چھوٹی سی مسجد تھی۔ بیٹھے، اونگھنے، آرام کرنے
کے لیے کچھ سایہ دار مقام بنے تھے۔ یہاں پرندوں
کے غول کے غول اتر رہے تھے۔ قافلوں کے نشان
پر دیکھے جاسکتے تھے۔ عارضی چولے اور کچھ
شعل کی چیزیں۔ دیواروں میں ہاتھ برابر کھوہ میں
کچھ برتن رکھے تھے۔ آگے نکل جانے والے، پیچھے
آنے والوں کو اپنی کچھ نشانیاں دے رہے تھے۔ آب
خوردے، عطر کی چھوٹی کپیاں، کپڑے کی پوٹی میں
بندھے اپنی سرزمینوں کے کچھ معمولی زیور، کچھ
نسجیات اور ہاتھ کی کڑھائی سے سجے حجاب۔

عزیزہ کے ہاتھ میں کپڑے کی پٹی آئی تھی۔
وہ اتنی خوش تھی جیسے اسے دنیا جہاں کا خزانہ مل گیا ہو۔
اس کا فلفلے کا رداں کی عورت نے، انجی سر فرشتہ
کی انجی لیکن دوست عورت کے لیے ایک چھدر رکھ
فلفلے اس نے محبت کا ایک پیغام دیا تھا۔ دوستی کا
منہولی لیکن گھر اشارہ.....
عزیزہ نے محبت کا پیغام پالیا تھا، دوستی کا ہاتھ

بڑھادیا تھا۔ وہ کان کے زپور آنکھوں کے سامنے لا کر دیکھ رہی تھی۔

”یہ تم اپنے نکاح پر پہن لینا۔“ بے ساختہ جنت کے منہ سے نکلا تھا۔

”چاہیں کسی نیک بخت خاتون کے زیور ہیں، اس کی نیک بختی کا سایہ تم پر بھی پڑ جائے گا۔“ آمنہ عزیزہ کے لیے خوش تھی۔

عزیزہ بھی بدلے میں کھوہ میں کچھ رکھنا چاہتی تھی لیکن اس کے پاس کوئی زیور نہیں تھا۔ خرچ کے لیے ان کے پاس سکے تھے۔ یہ ان کی محنت کی کمائی تھی۔ درویش نے کہا تھا سفر میں، سفر خرچ کی ضرورت پڑتی رہتی ہے، وہ یہ سکے سنبھال کر رکھیں۔ اس نے کچھ دیرو سچا اور پھر تین سکے نکال کر کھوہ میں رکھ دیے تھے۔ جو دینا چاہتے ہیں وہ بھوکے رہ کر بھی دے دیتے ہیں۔ سخاوت سونے کے پہاڑ دینے کا نام نہیں، سخاوت اپنی بھوک رکھ کر، کسی دوسرے کی بھوک کی مناد دینے کا نام ہے، ضرورت پوری کر دینے کا نام ہے۔ وہ بھی اجنبیوں کو دوستی کا پیغام، ایک عذر تھا دینا چاہتی تھی.....

آمنہ کے ہاتھ کپڑے کے پارچہ پر لکھا ایک خط آیا تھا۔ زبان فارسی تھی، وہ پڑھنے سے قاصر تھی کارواں میں کچھ لوگ یقیناً فارسی پڑھ سکتے ہوں گے لیکن وہ کسی کے پاس نہیں جانا چاہتی تھیں۔ وروث نے منع کر دیا تھا کہ وہ کسی سے بات نہ کریں۔ خط کو اس نے سنہال کر اپنے پاس رکھ لیا تھا۔ جنت کے ہاتھ میں ایک نسخہ آئی تھی۔ یہ نکلوی کے دانوں کی نسخہ تھی وہ نسخہ کی خوبصورتی پر حیران تھی۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ ایسا باکمال نسخہ اسے مل سکتا ہے..... وہ جو اسے صحرا میں اور دریا میں۔

”جو ہماری چیزیں ہوتی ہیں، وہ ہمیں ہی ہیں۔ ان کی حفاظت فرشتے ہمارے لیے کرتے ہیں۔“ عزیزہ نے مسکرا کر کہا۔

آمنہ اور جنت نے نا کجی سے عزیزہ کو دیکھا
 ”کیا واقعی میں؟“

”ہاں..... یہی دیکھ لو کہ اتنے بڑے کارداروں میں یہ سب چیزیں ہمیں ہی نصیب ہوئی ہیں۔ یہ ہماری ہی باتیں ہیں، ہر صورت ہمیں ہی ملتی ہیں۔ انسان کو اللہ کی رحمت پر یقین ہونا چاہیے۔ اللہ اپنے بندوں کو تحائف دینا جانتا ہے اور وہ ان کے نصیب کی چیزوں کو حفاظت میں رکھتا ہے۔“

سورج سر پر تھا، دن بہت گرم تھا۔ کنوئیں کے پانی سے منہ پر چھینٹے مارتے، کارداروں والوں کی آوازوں کا شور سنتے، گرم لوہے کے تھپڑے سبتے وہ سر جانے کی حد تک خوش تھیں۔ درویش نے بالکل ٹھیک کہا تھا، وہ اصل کے مقابلے میں گھائے کا سوداگر رہی ہیں۔ اگر وہ پلٹ کر اصل کی طرف نہیں آئیں تو بہت نقصان میں رہیں گی۔ توفیق کی رحمت نے انہیں گھائے کے سودے سے بچالیا تھا۔ وہ نماز ظہر کے لیے اپنی جائے نماز پہنچا رہی تھیں۔

ادھر ادھر کارداروں کھانے پینے، سستانے میں مصروف تھا۔ اونٹ بان اونٹوں کو پانی پلا رہے تھے۔ گھوڑوں کی تاز برداریاں کی جارہی تھیں۔ اونٹ جتنا اللہ لوک جانور ہے، گھوڑا اتنا ہی شوخا اور لاڈلا۔ پاؤں پاؤں چلنے والا بچہ بھی اونٹ کی ٹیکل پکڑ کر اسے کہیں بھی لے جا سکتا ہے۔ درویشی اور عاجزی اونٹ کی روح پرانی غالب آچکی ہے کہ پیدا ہوتے ہی اس کے چہرے سے ”بزرگی“ بھٹکنے لگتی ہے۔ جانوروں میں ایسی بزرگ صورت صرف اونٹ کو ہی نصیب ہے۔

”کیا یہ لوگ اونٹوں کو نہیں دیکھتے کہ انہیں کیسے پیدا کیا گیا۔“ (القرآن)۔

کلام پاک میں مالک دو جہاں نے ان کا ذکر، آسمانوں، پہاڑ زمین سے پہلے کیا ہے۔ یہ نمازی کی طرح جھکتا اور ایمان والوں کی طرح کھڑا ہوتا ہے۔ اسی لیے یہ نبیوں کی سواری رہا ہے۔

عزیزہ کا سستانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ وہ گھوم پھر کر کارداروں دیکھ رہی تھی۔ اس نے چہرے پر نقاب کھینچا ہوا تھا۔ وہ کارداروں کے لوگوں کو دیکھنا

چاہتی تھی۔ جو اس کے ہم سفر تھے۔ جو اس پر اوٹیں اس کے ہم نشین تھے۔ اس کے لیے یہ کارداروں ایک پورا جہاں تھا۔ وہ ساری دنیا نہیں گھوم سکتی تھی۔ لیکن وہ ساری دنیا سے اکٹھے ہوئے ”جہاں“ کو دیکھنا چاہتی تھی۔

ایک خاتون ٹھہر ٹھہر کر کلام پاک پڑھ رہی تھیں۔ وہ پڑھتی جا رہی تھی، روٹی جا رہی۔ پتا نہیں وہ رب کی عظمت پر آبدیدہ تھیں یا اس کی محبت پر۔ کچھ دور ایک اونٹ بان سر کے نیچے بازو رکھے سو رہا تھا، اس کے دن کے خزانے، رات کے چھنگروں کو مات دے رہے تھے۔ اس کا اونٹ، اس کے سر پر جھکا اس سے لاڈ کر رہا تھا۔ اپنا منہ اس کے منہ کے قریب لا کر اس کے منہ پر کھیل تھا۔ کھیل کھیل کر اس کے منہ پر بادل گر رہا تھا۔ عزیزہ ہنس دی۔

”کیسی بے فکری نیند ہے اس کی۔ جی چاہتا ہے، اس کے سر کے نیچے سے اس کا تکیہ، اس کا بازو کھینچ دوں۔“

”میرا خیال ہے کہ مجھے کچھ کنکریاں اکٹھی کر کے تمہیں دے ماری جاؤں۔ تمہارے اندر کا شیطان ابھی زندہ ہے۔“ آمنہ نے اس کا بازو پکڑ کر پیچھے کر آگے کیا کہ وہ اس بے چارے معصوم کو معصومانہ نیند سولینے دے۔

ادھر ادھر، یہاں وہاں کتنے ہی لوگ ٹولیاں بٹا کر بیٹھے ہوئے بائیں کر رہے تھے۔ عزیزہ نے ذرا غور کیا تو اسے محسوس ہوا کہ ان میں سے بہت سے لوگ ایک دوسرے کی زبان ٹھیک سے سمجھ نہیں رہے۔ لیکن وہ بائیں ایسے کر رہے تھے جیسے زبان اور کلام کوئی مسئلہ ہی نہ ہو۔ انہیں سب سمجھ میں آ رہا ہے۔ انہیں سب معلوم ہو رہا ہے۔ ہاتھ لہرا لہرا کر، جوش سے اشارے کرتے ہوئے، شاید وہ اپنی اپنی سرزمینوں کے قصے کہانیاں سن رہے تھے۔ عزیزہ کو شوق ہوا کہ کوئی قصہ اسے بھی سنائی دے جائے لیکن اس کے لیے اسے ان کے قریب جا کر بیٹھنا تھا۔ جو وہ کر نہیں سکتی تھی۔ جنت نے اسے صاف

صاف دھکی دے دی تھی کہ اگر اس نے یہ حرکت کی تو وہ واپسی پر درویش سے اس کی شکایت کر دے گی۔ ”کچھ کنکریاں تمہیں بھی پڑ جانی چاہئیں۔ تمہارے اندر کا چنچل خور شیطان، جی ابھی تک زندہ ہے۔“ عزیزہ کا منہ بن گیا تھا۔

چنچل خور شیطان گردن کو خم وے کر آگے بڑھ گیا۔ دیوار کے سائے میں بیٹیں بائیں عورتیں بیٹھیں۔ ہاتھیں کر رہی تھیں۔ کچھ شوہر کی، کچھ بچوں کی، باقی ساس کی..... ان کی باتیں لا جواب تھیں۔ نینوں ان کے ساتھ جا کر بیٹھ گئیں اور چغلیاں سننے لگیں۔

”دیکھ لو، کناح ایسا جان کا عذاب ہے۔“ آمنہ نے جنت کے کان میں سرگوشی کی۔

”میرا خیال ہے کہ اصل عذاب صرف ”سناں“ ہے۔“ جنت کو بڑا سزا آرہا تھا۔

”عورتوں کے شکوے کبھی ختم نہیں ہوتے، وہ صحرا کے سفر پر کارداروں کے ساتھ ہی کیوں نہ ہوں، انہیں اپنا پیچھا نہیں بھولتا۔ شوہر، بچے اور عذاب از جان سناں.....“

دنیا میں کوئی عورت اتنی بدنام نہیں جتنی ”سناں“ ہے..... ہے ناعزیزہ؟ ”مجھے کیا پتا، میں نے کون سا کسی بدنام زمانہ سناں کو بھٹکتا ہے۔“

”اچھا چلو فرض کرتے ہیں کہ تمہاری ایک عدد سناں ہے۔ تمہاری جان کا عذاب ہے تو تم کیا کرو گی۔“

”کیا مطلب کہا کروں گی..... خدمت کروں گی، سناں کا دل بدلنے کی کوشش کروں گی، پھر بھی وہ نہ بدلیں تو پھر ان کے ”دانا“ اور ”جون“ دونوں بدل دوں گی۔ عزیزہ نام ہے میرا، سناں نامی معرکہ سر کر کے ہی رہوں گی۔“

نینوں نے تجھہ لگایا لیکن دو تین عورتوں کے کانوں میں عزیزہ کے نیک ارادوں کی بھینک پڑ چکی تھی، وہ سرگھما کر اسے گھور کر دیکھ رہی تھیں۔ وہ اس بدخیز لڑکی کی شکل یاد کرنے کی کوشش کر رہی تھیں تاکہ

بھول کر بھی وہ اسے اپنی بوند نہ بنالیں۔

بھول جانے والی ساری باتیں بھلا کر، وہ نئے سبق یاد کر رہی تھیں۔ صحرا کی کہانیاں سن رہی تھیں۔ عزیزہ ایک ٹیلے پر جا کر کھڑی ہو گئی تھی۔ آمنہ اور جنت بھی قریبی ٹیلوں پر کھڑی ہو چکی تھیں۔ اس نے دیکھا کہ بے آباد صحرا کو انسانوں نے آکر آباد کر دیا ہے۔ یہ صحرا جو اپنی شکل میں پورا تھا لیکن ادھورا تھا، اسے انسان نے آکر مکمل کر دیا تھا۔ زمین اپنے اوپر اور اندر جتنی بھی خاصیتیں رکھتی ہے، پہاڑ، دریا، جانور، صحرا، چرند پرند، خزانے..... ان سب خاصیتوں کو انسان کی روح کی سانس لیتی ہے تو وہ بھی سانس لینے لگتی ہیں۔ ہر شے کہیں نہ کہیں جا کر ”انسان“ سے جانتی ہے۔ ہیر اپنی خاصیت میں کتنا ہی باکمال کیوں نہ ہو..... شان میں بلند تر، خوبصورتی میں ارفع، انسان کا ہاتھ، سانس، آنکھ لگے بغیر پتھر ہے..... پتھر ہے..... صرف پتھر ہے۔ جو ہر کو جو ہری ہی نصیب نہیں ہوگا تو پھر وہ ”جوہر“ بھی کیسے ہوگا۔

”کیا دیکھ رہی ہو؟“

”اللہ کتنا بڑا ہے۔“

”تو یہ تمہیں یہاں آکر معلوم ہوا ہے؟“

”میں نے قاہرہ کے محلوں سے صرف آسمان دیکھا تھا، قاہرہ سے دور یہ صحرا اور آسمان دونوں دیکھے تو مجھ پر آشکار ہوا کہ جس چیز کے کنارے نہ ہوں، وہ بہت بڑی ہوتی ہے۔ میں چھوٹی تھی تو میں نے سمندر کا سفر کیا تھا۔ اس سفر نے مجھ پر عجیب کیفیت طاری کر دی تھی۔ کشتی کے عرشے پر کھڑے ہو کر میں نے دیکھا تھا کہ پرندے دیوانہ وار سمندر کی وسعت پر پرواز کر رہے ہیں۔ صحرا اور سمندر، یہ پرندوں پر بھی ہیبت طاری کر دیتے ہیں۔ اور پھر یہ دیوانہ وار پرواز کرتے ہیں..... یہی ان کی تیج ہے..... یہی ان کی ثناء ہے۔ انسان کو بھی ایسے ہی دیوانہ وار ثناء خواں ہونا چاہیے۔“

”زمین کہیں تو ختم ہو ہی جاتی ہوگی عزیزہ؟“

آمنہ عزیزہ کے مدبر سے متاثر ہوئی تھی۔
 ”کائنات بھی کہیں ختم ہوئی جاتی ہوگی۔ لیکن
 یہ شروع کہاں سے ہوئی ہے۔ اصل عظمت تو اس
 میں ہے۔“

”اب تم عالموں جیسی باتیں کر رہی ہو۔“ جنت
 نے چلا کر کہا کہ آواز اس تک چلی جائے۔

”کیا اسی لیے حج فرض ہے کہ ہر انسان زمین
 کا سفر اختیار کرے، کہ اس پر رب کائنات کی عظمت
 کی نشانیاں آشکار ہوں۔ وہ زمین پر چلے پھرے اور
 دیکھے۔۔۔ دیکھے کہ اس کا رب ہر شے پر غالب
 ہے۔ ہر روح اس کی نمائندہ ہے۔۔۔ میں نے صحرا
 کی رات میں اپنی روح کی آواز سنی ہے۔ وہ کہتی ہے
 ایک مجھہ جسم کرتا ہے، ایک مجھہ روح کرتی ہے،
 انسان کو اپنے نفس کو اس روحانی مجھہ پر مائل کرنا
 چاہیے۔ اسے ایسے جھک جانا چاہیے کہ منگڑی کو مننا
 دینا چاہیے۔ میں نے صحرا کو بڑا فرماں بردار پایا ہے
 اور مجھے اس سے بہت شرم آئی ہے۔ یہ تنہا ہے، جلتا
 ہے، تڑپتا ہے، لیکن یہ اپنی جگہ سے سر نہ اٹھاتا ہے۔
 یہ ہر حال میں فرماں بردار ہے۔ اپنی پیاس کے لیے
 یہ بارش تک نہیں مانگتا۔ نہ غلستان، نہ باغ و
 بہار۔ یہ اپنے حال پر راضی ہے۔ اپنی خواہشوں
 کی تڑپ کے لیے ہمیں صحرا سے سبق سیکھنا ہوگا کہ گرم
 ہوا، جھانپائیاں، کانٹے، سیراب، ریت کے طوفان اور
 نشان بدلتے صحرا کے راہنما۔ اگر ان سب کے
 ساتھ صحرا قائم رہ سکتا ہے تو انسان بھی رہ سکتا
 ہے۔“

”تو کیا اسی لیے حاجیوں کو صحرا کے سپرد کیا
 جاتا ہے تاکہ وہ اس سے سکھ کر آگے جائیں۔“ جنت
 کو عزیزہ کی باتیں سمجھ میں آگئی تھیں۔

”سفر میں ملنے والا ہر نشان آستانہ ہے، راہنما
 ہے۔ زندگی بھی تو ایک سفر ہی ہے۔“

ایک عورت انہیں دیکھ کر ان کے پاس آئی
 تھی۔ وہ انہیں مجھور کے حلوے کی خشک ڈلی دے رہی
 تھی۔

”یہ کھالو، یہ جسم کو چست و توانا کر دیتی ہے۔“
 عزیزہ نے پوری ڈلی فوراً ہڑپ کر لی۔
 ”تھوڑی اور جتنی توانائی ملے گی؟“
 عورت نے ہنس کر اسے دو تین اور پکڑا دیں۔

”تم تو ہوا ہو، تمہارا سستی سے کیا تعلق۔“
 ”بیوی بیوی ہو جو یہ ہو ویسے تم۔۔۔ اکیلی ہی تین کھا
 گئیں۔“ عورت کے جانے کے بعد آمنہ نے منہ بنا
 کر کہا۔

عزیزہ نے قہقہہ لگایا۔ ذرا دور گزرتے ابن
 موسیٰ کے پاؤں چلتے چلتے خیم سے گئے۔ اس نے
 گردن کو ہلکا سا خم دے کر اسے دیکھا۔ غیر محسوس اس
 کی کمر سلگ اٹھی تھی۔ لیکن۔۔۔ وہ زیر لب مسکرا بھی
 دیتا تھا۔۔۔ پتا نہیں کیوں اسے سچی کی بات یاد آتی تھی
 کہ اسے شادی کر لینی چاہیے۔

”لیکن تم جیسے اکثر مزاج انسان کے ساتھ کوئی
 لڑکی خوش نہیں رہ سکے گی۔“ سچی نے جل کر کہا تو اس
 نے مجھور کو سچی کو دیکھا۔

”میں تو دعا کرتی ہوں کہ تمہیں کوئی ایسی لڑکی
 ملے جس کی ترجیحی نظر تمہاری آدمی جان نکال
 دے۔“

”اور جس کی برجمی نظر آپ کی پوری جان۔“
 اس نے جل کر کہا تھا۔

عزیزہ کی پشت پر پوری نظر ڈال کر، وہ آگے
 بڑھ گیا تھا۔ لیکن انسان دیکھ جیسے رہا ہو، اور قدم
 آگے بڑھا رہا ہو تو کہیں نہ کہیں اچھگر گری جاتا ہے،
 وہ بھی اونٹ کی منہال سے اچھگر گر پڑا اور اونٹ بان
 جو لوہیوں میں بیٹھتے تھے، منہ کھول کر ہنسنے لگے تھے۔
 امیرانج بھی گرتے ہیں، یہ دیکھ کر انہیں بہت خوشی
 ہوئی۔

”والد کہتے ہیں جس انسان کے قدم زمین پر
 اور نظر آسمان کی طرف ہو، وہ انسان دیوانہ ہوتا ہے۔
 آپ کی دیوانگی کی کیا وجہ ہو سکتی ہے امیرانج؟“
 ”اپنے ذاتی اندر رکھو، ورنہ یہ دیوانہ نہیں
 باہر نکال دے گا۔“ امیرانج واقعی میں دیوانہ تھا۔

”آپ تو غصے میں بھی ہیں۔۔۔ اکیلا انسان
 غصے کا تیز ہوتا ہے۔ آپ نکاح کیوں نہیں کر لیتے۔“
 امیرانج کا بکا اونٹ بان کو دیکھ کر رہ گیا تھا۔ کیا
 اب زبان قفل بھی اس کے نکاح کی ہی بات کرے
 گی۔

”کیا قاہرہ کا کوئی خاندان آپ کو اپنی فرزندہ
 میں لینے کے لیے تیار نہیں ہے؟“ اونٹ بان کا مذاق
 ختم ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔

”قاہرہ کے خاندان مجھے فرزندہ میں لیں یا نہ
 لیں، لیکن قاہرہ کے قید خانے تمہیں شرف ”قید“ میں
 لینا پسند کریں گے۔“

”اوہ! اچھا اچھا۔۔۔ لیکن کیا ہی اچھا ہو جو آپ
 حاجیوں سے کہہ دیں کہ وہ آپ کے لیے نکاح کی دعا
 کریں۔ کیا پتا اللہ کے گھر میں ہی آپ کا نکاح ہو
 جائے۔ امام کعبہ کو خوشی ہوگی امیرانج کا نکاح
 پڑھانے میں۔“

خوشی تو اسے بھی ہوگی لیکن۔۔۔ لیکن۔۔۔

امیرانج نے سر کو جھٹکا۔ والدہ ہوتیں تو اور بات
 تھی، وہ کارواں کا امیر بن کر، اپنے پیچھے اپنی اولاد کو
 پیچیم کرنے کے لیے نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ یہ اس کا خوف
 تھا۔ وہ ابھی تک اس خوف سے نہیں نکلا تھا۔ اسے لگتا
 تھا کہ اس کا بیٹا بھی اس کی واپسی کا انتظار کرے گا اور
 پھر قاہرہ کی خاک کو اپنے سر میں ڈالے گا۔ وہ بھی روتا
 جانے گا اور کہتا جائے گا۔

”اب میں بھی چو لیے کی راکھ اور زمین کی
 خاک سے بدتر ہوں۔۔۔ بدتر ہوں۔۔۔“

☆☆☆

”صرف چھ مہینے میں ہم کہاں سے کہاں آ پہنچے
 ہیں۔ اسے کہتے ہیں رب کی شان۔“ جب سے سفر
 شروع ہوا تھا، جنت بہت خوش باش رہتی تھی۔ وہ ان
 دونوں سے اپنے جذبات کا اظہار کر رہی تھی۔

”رب کی شان کی نشانیاں اکٹھے کرنے ہی تو
 حاجی سفر حج اختیار کرتے ہیں۔“
 عزیزہ زیر لب بولی۔ اس کا دل تدبر کی

گہرائیوں میں ڈوب ابھر رہا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ
 ہیر اور پتھر وزن میں برابر ہو بھی جائیں تو خاصیت
 میں نہیں ہو سکتے۔ ہو سکتا ہے کچھ لوگ اعمال کی حققت
 میں بہت آگے ہوں لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے وزن کے
 میزان میں ان لوگوں سے آگے نکل جائیں جن کے
 اعمال میں ہیروں کی خاصیت ہو۔ اس لیے حساب
 کتاب میزان کے پیرو ہے۔ وزن میں۔۔۔ حققت
 میں نہیں۔۔۔ کچھ سچی ہیں اور کچھ عالم ہیں۔ کچھ
 نمازی، اور کچھ برہیز گار، کچھ اخلاق والے اور کچھ
 انصاف والے۔ کچھ گناہ کرتے ہیں، توبہ کرتے ہیں،
 توبہ توڑتے ہیں، پھر توبہ کرتے ہیں، لیکن کوئی نہیں
 جانتا کہ کبھی نہ گناہ کرنے والا میزان میں اٹھ جائے
 والا ہے، یا بار بار گناہ کر کے توبہ کرنے والا جھک
 جانے والا ہے۔ کون خاصیت میں زمرہ ہے، کون
 چاندی، کون سونا، کون ہیر اور کون ”کوہ نور“۔

تین کوہ نور۔۔۔ تین ہیرے۔۔۔ ورنہ تین
 خاک نصیب۔۔۔ اپنی اپنی سواریوں پر سوار، سر اٹھا
 کر، سر جھکا کر، حقیق میں مصروف ہیں۔

انہوں نے اب جانا ہے کہ خاک کے پتلے کو
 سکون بھی خاک ہو کر ہی ملتا ہے۔ خاک چھان کر ہی
 ملتا ہے۔ در بدر خاک چھان۔۔۔ پھٹک کر ہی ملتا
 ہے۔۔۔ ورنہ اس راہ میں، انعام تو ملتا ہے، لیکن
 ”مقام“ نہیں ملتا۔

اپنے مقام، اپنے رہنے کی شان کو برقرار رکھتے
 ہوئے امیر کارواں، گاؤں گائے کی حفاظت سے غافل
 نہیں تھا۔ سب کچھ ٹھیک ٹھاک جا رہا تھا۔ وہ پوری
 طرح سے چوکنا تھا۔ قافلے والے خوش بھی تھے اور
 مطمئن بھی۔ وہ کھانا کھا چکا تھا، پانی کے لیے ٹھک کو
 منہ سے لگا یا تھا کہ ابن منصور اس کے سامنے آ کر
 کھڑا ہو گیا تھا۔ اس کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ اس
 کے دل کا حسد بڑھ کر کینہ میں بدل چکا ہے۔ کد تلواریں
 کی طرح وہ خود کو ناکارہ سمجھنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ یہ
 سفر کا کچھ سوال دن ہے۔

”جن تین حاجیوں کے تم نے نام لکھوائے تھے،

تم نے ان کے بارے میں بتایا نہیں کہ وہ کون ہیں؟“
امیر کارواں نے اطمینان سے پانی کی مشک کا
منہ بند کیا۔ ”میں نے کوئی نام نہیں لکھوایا۔“
سجید کی کہنا۔

یہ انسان حج کی تیاریوں کے پہلے دن سے اس
کے پیچھے لگا ہوا تھا کہ کہیں کوئی موقع آئے اور وہ
اسے ”امیر الحج“ کے عہدے سے دھکا دے کر خود
اس کی جگہ آکر کھڑا ہو جائے۔ یا کم از کم اسے سب
بڑوں کی نظروں میں ہی گرا دے۔

”کیا بات ہے تمہاری۔۔۔۔۔ یا دیا، تم نے لکھوائے
نہیں تھے، بلکہ خود لکھے تھے۔ سواری کے لیے دو اونٹ تم
نے شاہی اصطبل سے لیے تھے۔ کن کے لیے لیے تھے
ابن موسیٰ؟“ وہ اسے امیر الحج نہیں کہتا تھا۔

”تم اندراج کی جانچ پڑتال کرتے رہے ہو؟
تم میری ٹوہ میں رہتے ہو؟ کس لیے؟ اس لیے کہ اس
سال بھی امیر کارواں کا قرضہ میرے نام نکلا ہے۔
حسد کرنا چھوڑ دو۔ ہو سکتا ہے یہ میری زندگی کا آخری
کارواں ہو جس کا میں امیر بنا ہوں۔ آج کی رات
میری آخری رات ہو، جو نماز میں نے پڑھی ہے، وہ
بھی آخری ہو۔ پھر؟“

”تم مجھ پر اپنی زندگی کی بے ثباتی ثابت
کر کے مجھے متاثر نہیں کر سکتے۔ مجھے میرے سوالوں
کے جواب دو۔“

”تمہارے سوال صحرا کے کائناتوں کی طرح
نوکلیے اور ناگوار ہیں۔ صحرا کے ڈاکوؤں کی طرح
خواہش کے غلام نہ بنو! یہ منصوبہ اسے نفس پر قابو پانا
سیکھو۔“ اطمینان بھی اور مسکراہٹ بھی۔ ابن موسیٰ
نے ابن منصور کو جلا کر تھوڑ کر دیا تھا۔

”تم نے کارواں میں لوگوں کو جگہ دی ہے
ابن موسیٰ۔۔۔۔۔“ اس کی آواز بلند ہوئی۔

”میں تمہاری تشویش پر حیران ہوں۔ یہ
کارواں حج ہے اور جو مسلمان اپنی سواری رکھتا ہے،
کھانا پینا اور کچھ خرچ وہ اس میں شامل ہو سکتا ہے۔
تمہیں اتنی فکر کیوں ہے؟“

”مجھے شک ہے کہ تم نے بدوؤں کے
جاسوسوں کو کارواں میں جگہ دی ہے۔ یہ جاسوس
کارواں پر حملہ کروا دیں گے۔ وہ اپنے سردار کو
کارواں کے راستے کی خبر دیتے ہوں گے۔“

ابن موسیٰ نے بے یقینی سے اس پاگل کو دیکھا
اور پھر ایک دم سے توجہ لگا دیا۔

”تمہارا دماغ ٹھیک ہے؟ میری والدہ بدوؤں
کے ہاتھوں شہید ہوئی تھیں۔ میں بدوؤں سے
سو دے بازی کروں گا؟ تم پاگل ہو چکے ہو۔۔۔۔۔ ہاں
ہو چکے ہو۔“

”ایمان بدلتے دیر نہیں لگتی۔۔۔۔۔“

”لیکن عقل آنے میں بہت دیر لگ جاتی
ہے۔“ اس نے اس کے شانے پر چمکی دی۔ ”چاؤ چا
کر صحرا کی سانس کے ساتھ سانس ملاؤ، شاید صحرا
تمہیں کچھ حکمت سکھا دے۔ مجھ پر نظر رکھنے سے بہتر
ہے کہ تم اپنے دل پر نظر رکھو، کیونکہ عقل کا دشمن ہے،
حسد اعمال کا، اور عدوات جان کی۔ اپنی اپنی تینوں
خصالتوں پر رحم کرو، اور انہیں مشقت سے نکال لو۔“
ابن منصور منہ پھیر کر چلا گیا۔ لیکن اس کی چال
بتا رہی تھی کہ وہ باز آنے والا نہیں ہے۔

وہ ساری رات سفر کرتے، آسمان کے ستارے
ان کے اشارے تھے، انہیں راستے بتاتے تھے۔ صحرا
کے ایک چھوٹے سے گاؤں سے گزرتے ہوئے ان
کے ساتھ چار حاجی شامل ہوئے تھے۔ گاؤں والوں
نے چار حاجیوں کو کچھ ایسے رخصت کیا تھا کہ دس ہزار
کا کارواں مہربت رہ گیا تھا۔ گاؤں کے لوگوں نے
ان کا استقبال بھی کھلے دل سے کیا تھا۔ یہاں کنوئیں
سے پانی پیتے ہوئے ہنسنے پھرتے ہوئے اس کی
نظر امیر الحج کی طرف گئی تھی۔ وہ تینوں اس کا شکریہ
ادا کرنا چاہتی تھیں لیکن انہیں کوئی موقع ہی نہیں مل رہا
تھا۔ عزیزہ کو تو معذرت بھی کرنی تھی اس کا گناہ بھی
بڑا اور عظیم تھا۔

”امیر الحج اچھا انسان ہے، تم نے خواہ مخواہ
اسے پتھر مارا۔۔۔۔۔“ آمنہ کی یادداشت کی یہ خرابی تھی،

ہر خراب بات یاد رکھتی تھی۔

”اس پتھر پر ایسی کا نام لکھا تھا، اس پتھر کو ایسی کو
جا کر لگنا تھا۔“ عزیزہ کو ابھی تک پتھر مارنا حق بجانب
لگ رہا تھا۔

”دیکھنا کسی سانپ پر تمہارا نام نہ لکھا ہو، سنا
ہے، صحرا سانپوں کا گھر ہوتا ہے۔ تمہیں کاٹنے میں وہ
سانپ بھی حق بجانب ہوگا۔“

صحرا سانپوں کا گھر تھا یا نہیں لیکن وہ عجائبات کا
مرکز ضرور تھا۔ صحرا کی راتیں حسن کی پیشانی پر چوتھا
چاند تھیں۔ جب تک ان کی نظریں اپنے حسن و جمال
پر رہی تھیں، وہ کائنات کے حسن تک نہیں پہنچ سکتی
تھیں۔ انسان خالق کی ثواب ہی بیان کرے گا۔
جب وہ اس کی تخلیق پر غور کرے گا، ورنہ وہ خود میں
ہی الجھ رہے گا۔

”میں ایسی رات میں ہزاروں سال تک سفر کر
سکتی ہوں۔“ عزیزہ نے جذب کے عالم میں کہا۔

”اچھا۔۔۔۔۔ اونٹ سے نیچے اترتے ہی تم اپنی کر
سلے لگتی ہو۔ تمہاری ہڈیوں کے جھنجھکے کی آوازوں سے
جانور تک بدک جاتے ہیں۔“ دن میں صحرا کی ریت گرم
ہوتی تھی، رات میں آمنہ کی زبان گرم ہو جاتی تھی۔ وہ
بچ (طنز) کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتی تھی۔

”میں حج کے لیے جا رہی ہوں اور تم مجھ پر طنز
کر رہی ہو۔ عزت دو مجھے۔۔۔۔۔“

”عزت کی حق و اترم اکیلے ہو کیا۔۔۔۔۔ کل تم نے
میرے پیٹ میں کیا چھو ہوا تھا، میری جان حلق میں
آگئی تھی۔“

”پتا نہیں تمہیں اونٹ پر بیٹھ کر غنیمت کیسے آجاتی
ہے، تمہارے خراثوں سے اونٹ کی چال ڈنگا رہی تھی۔
اونٹ بان بھی کچھ خوف زدہ سا تھا۔ اس لیے میں نے
تمہیں ایک بے ضرری لکڑی کی شاخ چھو دی تھی۔“

”تم ایسے بے ضرر ہتھیار بھی اپنے ساتھ رکھتی
ہو۔ تم حج پر جا رہی ہو یا جنگ پر۔۔۔۔۔ کچھ شرم ہے یا
نہیں؟“

”شرم کا کہہ کر مجھے شرمندہ نہ کرو۔ لکڑی کی وہ

شاخ ابھی ابھی میرے پاس ہے۔۔۔۔۔ چپ کر کے
بیٹھو، جاہل۔۔۔۔۔“

آمنہ نے گھور کر اسے دیکھا اور سر کو جھٹک کر، منہ
پھلا کر سامنے دیکھنے لگی۔ وہ کئی بار جنت سے کہہ چکی تھی
کہ وہ عزیزہ کے ساتھ بیٹھ جائے، لیکن جنت اس
خاتون کے ساتھ ہی چمکی ہوئی تھی۔ انہیں اپنی والدہ بنا
لیا تھا۔ ہر وقت ان کی خدمت میں لگی رہتی تھی۔ اونٹ
سے اترنے کے بعد، قیام کے دوران وہ ان کے جسم کو
آرام دینے کی کوشش کیا کرتی تھی۔ خاتون بیمار تھیں
لیکن اپنی بیماری کو ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھیں۔ بیمار کو
کارواں میں شامل ہونے کی اجازت نہیں تھی۔ ان کی
بیماری کی نوعیت عجیب سی تھی، جسم اچانک بہت گرم ہو
جاتا، کان اور ناک سے خون نکلنے لگتا تھا۔ پورا جسم کا پٹنے
لگتا تھا، سر بہت زیادہ بٹنے لگتا تھا۔ اسی لیے وہ ہر وقت
اپنا سر تختی سے باندھ کر رکھتی تھیں۔

”آپ کو تندرست ہو کر سفر کرنا چاہیے تھا۔
انسان کو خود پر بار نہیں ڈالنا چاہیے۔“ آمنہ نے کہہ
دی دیا تھا۔

”ٹھیک کہہ رہی ہو لیکن پچھلے کئی سالوں سے
میری یہی حالت ہے۔ دوا بھی بہت کھائی ہے لیکن
بیماری شاید مجھے پسند کر بیٹھی ہے، جانے کا نام نہیں
لے رہی تھی۔ میں نے کہا تو پھر میں بھی تمہیں حج کر
کے دکھائی ہوں۔ تم میری جان ہی کیوں نہ لے لو۔
بیماری جسم چھوڑ کر جاتی یا نہ جاتی، اگر روح جسم کو چھوڑ
جاتی تو میں کیا کرتی۔“

تینوں خاتون کی ہمت کی داد دے بغیر نہیں رہ
سکتی تھیں۔ جنت تو اپنی ہی پوری کوشش کرتی تھی کہ
ان کا زیادہ سے زیادہ خیال رکھ سکے۔ ایک بار عزیزہ
اور آمنہ کے سامنے وہ جنت کی تقریریں کر رہی تھیں کہ
”بہت بیماری لڑی ہے۔ بہت سکھ دیا ہے مجھے۔“

”میرا خیال ہے، یہ جنت کو اپنے بیٹے کے
نکاح میں لینا چاہتی ہیں۔ بار بار کہہ رہی ہیں کہ کسی کا
اصل دیکھنا ہو تو ستر میں دیکھو۔ جنت مجھے گھری لگی
ہے۔ کئی بار اپنے بیٹے کا ذکر بھی کر چکی ہیں۔“

”نکاح“..... عزیزہ چوکی تھی۔ ”نکاح کا پیغام بھی آگیا۔“ وہ جنت کو دیکھ رہی تھی جو خاتون کو پانی پلا رہی تھی۔

”پیغام نہیں پاگل..... اشارہ.....“

”ہاں نکاح..... اب ہمیں جلد سے جلد ان کے نکاح کا انتظام کر دینا چاہیے۔“ درویش کی بیوی نے درویش سے کہا تھا تو درویش نے ایک گہری سانس لی تھی۔

”بڑے دل والے، بڑی مشکلوں سے ملتے ہیں..... جو اللہ کی رضا.....“

درویش کی بات سن کر اسے یقین ہو گیا تھا کہ سب فرائض ادا ہو سکتے ہیں لیکن ان کے نکاح کا فرض ادا نہیں ہو سکے گا۔ کوئی انہیں اپنے نکاح میں نہیں لے گا۔ انہیں ساری زندگی چکی ہی ٹپسی ہوگی جو انہیں بخوشی قبول ہے۔ انسان کی خواہشیں بھی ختم نہیں ہوتیں۔ جنت کے گالوں کی شرم دیکھ کر، اس کے دل میں ایک ٹپس اٹھی تھی، شاید خاتون نے اسے بھی کوئی اشارہ دیا تھا۔ اس نے دل ہی دل میں دعا کی تھی کہ کاش ایسا ہو جائے کہ یہ خاتون اپنے بیٹے کے لیے جنت کا نکاح منظور کر لیں۔ حج پر جانے والوں کے دل کشادہ ہوتے ہیں اور صاف تھی۔ اس نے سوچا کہ وہ حج سے واپسی پر خاتون کو ساری حقیقت بتا دے گی۔ پھر درویش سے ملو دے گی۔ اگر ان میں سے کسی ایک کا نکاح بھی ہو جاتا ہے تو یہ بہت بڑی بات ہوگی۔

جنت کی خدمت بے لوث تھی، اسی لیے اس میں اثر تھا۔ خاتون پچھلے دس دنوں سے بیمار نہیں ہوئی تھی۔ وہ جانتی و چونہ اور تروتازہ تھیں۔ وہ اس کی پیشانی چوکی تھیں۔ اسے دعائیں دیتی تھیں لیکن کیا خبر حقیقت معلوم ہو جانے پر وہ اسے ایک نظر دیکھنا بھی پسند نہ کریں۔

☆☆☆

”سوال معمولی ہی کسی ابن موسیٰ! تم جواب دے کر اپنی جان چھڑا لو۔ بس.....“

ابن موسیٰ کا غصہ سے برا حال تھا۔ وہ تصور بھی

نہیں کر سکتا تھا کہ ابن منصور نے یہ بات کارواں کے ساتھ آنے والے مصر کے خاص عہدے داروں تک پہنچا دی ہوگی۔ وہ سب باجماعت بیٹھے ہوئے اس کی سست سوالیہ دیکھ رہے تھے۔

”کیا آپ لوگ مجھ پر شک کر رہے ہیں؟“ وہ حیران سب کی سوالیہ نظریں دیکھ رہا تھا۔

”تم پر اتنا یقین ہے کہ شک کی گنجائش نہیں..... لیکن تاریخ گواہ ہے، پشت پر خنجر ہمیشہ اپنوں نے ہی گھونے ہیں۔“

”نہ میں کسی جنگ کا حصہ ہوں نہ جنت کا..... میری حیثیت کو بچھاؤ..... خنجر اور عداوت کی باتیں کر کے میری توہین نہ کریں۔“

ابن منصور نے طنز ادا کیا۔

”تو آپ میرے دشمن کیوں بن گئے ہیں؟ کیا صرف اس لیے کہ میں اب تک وہ اکلوتا امیر امیر ہوں جس کے ساتھ اعلا خاندانی حسب نسب منسوب نہیں ہے۔ جس کے خاندان کی یا کسی عزیز بزرگ کی خلیفہ تک پہنچ نہیں ہے۔ میں اپنی لیاقت اور سمجھ سے اس عہدے تک پہنچا ہوں۔ آپ اس کا بدلہ مجھ سے نہیں لے سکتے کہ میں عالم اسلام کے ایک بڑے عہدے پر فائز ہوں۔ یہ اللہ کی مرضی تھی ہے اور میری لیاقت تھی.....“

”تم اتنا بھڑک کیوں رہے ہو ابن موسیٰ! بس مجھے اتنا بتا دو کہ شہزیادہ تم نے کن کے لیے تھے؟“

”امیر امیر ہونے کی حیثیت سے میں جتنے چاہے اونٹ لے سکتا ہوں۔ جسے چاہوں کارواں میں شامل کر سکتا ہوں۔“

”لے سکتے ہو لیکن کن کے لیے؟“

ابن موسیٰ بری طرح سے جڑ بڑھ رہا تھا، وہ درویش کی بیٹیاں ہیں..... وہ سمجھ گیا تھا کہ حج جانا ہی ہوگا۔

ایک لمحے کے لیے سناٹا چھا گیا تھا۔ ”قاہرہ کے درویش کی بیٹیاں؟ اس دیوانے کی بیٹیاں جسے غلی

لوہوں میں اللہ اللہ کرنے سے فرصت نہیں..... جو اتنا غریب ہے کہ اپنے جوتوں کی مرمت بھی خود کرتا ہے۔ اور جس کے گھر کی غورتوں کے ہاتھ کا سا ہوا آٹا قاہرہ کی صاحب حیثیت عورتیں ازراہ ہمدردی خرید لیتی ہیں۔“

”آپ کا درویش کے لیے ایسا دلچسپہ سمجھ سے بہرہ ہے۔ وہ اللہ والے ہیں اور یہ کوئی گناہ نہیں.....“

”درویش کی دو بیٹیاں ہیں اور جہاں تک مجھے معلوم ہے وہ چھوٹی ہیں۔ یہ کون سی بیٹیاں ہیں جنہیں درویش نے اکیلے ہی بھیج دیا ہے۔“ ابن منصور کو اصل بات تک رسائی چاہیے تھی۔ اس کی دھنسی ہوئی آنکھیں حسد سے لالہ تھیں۔

”بیان کے بھائی کی بیٹیاں ہیں.....“

ابن منصور نے سر ہلایا۔ ”کیا تمہیں کسی نے بتایا ہے کہ جھوٹ بولتے ہوئے تمہارا پسینہ چوٹنے لگتا ہے۔“

ابن موسیٰ نے کڑی نظروں سے دیکھا۔ ”کیا تمہیں کسی نے خبردار کیا ہے کہ امیر امیر کو کچھ قتل معاف ہیں۔“

یہ بات زہر میں بجھے تیر کی طرح ابن منصور کو لگی تھی۔

”تم مجھے قتل کرو گے..... مجھے.....؟“

”اب اپنی بکواس بند رکھو..... ہم کارواں حج میں شامل ہیں۔ مسکو اکلے اور حمل شریف ہمارے ساتھ ہیں۔ بہتر ہوگا کہ تم اپنا ذاتی عداور میان میں نہ لاؤ۔ میں کارواں کا امیر ہوں، مجھ سے دوبارہ اس لب و لہجے میں بات نہ کرنا۔ حاجیوں کو اپنے شر سے بچاؤ۔“ کہہ کر وہ غصے سے چلا گیا تھا۔

وہ جب سے امیر امیر بنا تھا، ان سب لوگوں کے دلوں پر سانپ لوٹ رہا تھا۔ وہ پہلا امیر امیر تھا جو کسی بڑے عہدے دار کا بیٹا، بیٹھیا، بھائی یا داماد نہیں تھا۔ وہ پہلا امیر امیر تھا جس کی قابلیت اور لیاقت نے اسے اسے کارواں کی سربراہی عطا کی تھی۔ اس کے استاد محترم خلیفہ کے دستوں میں سے تھے، اور یہیں سے اس کے لیے امیر امیر بننے کے راستے بنے تھے۔ اس نے اپنے استاد محترم کو مایوس نہیں کیا تھا۔

انسان پیدا بھی نہیں ہوا تھا اور حسد پیدا ہو گیا تھا۔ حسد اتنی پرانی بیماری ہے۔ اس حسد نے شیطان کو کہیں کا نہیں چھوڑا تو یہ حسد انسان کو کہاں چھوڑے گا۔ اسے خلیفہ کے حاسدین کی پرواہ نہیں ہوئی تھی۔ وہ صرف چند لوگوں کو جواب دہ تھا۔ درویش نے ٹھیک کہا تھا، لوگ اسلام پر ایمان تو لے آئے ہیں لیکن وہ اپنے دلوں میں اسلام نہیں لائے۔ جو مذہب امن و سلامتی ہے، اسے یہ اپنے لیے جنگ و جدل کا میدان بنا رہے ہیں۔ بڑے عہدوں کے ساتھ بڑی ذمہ داریاں اور بڑے دشمن آتے ہیں۔ ابن موسیٰ کا سب سے بڑا دشمن ابن منصور تھا۔

ابن منصور.....

اسے بڑے کارواں میں سے ان لوگوں کو ڈھونڈنا آسان نہیں تھا جو درویش کے گھر سے تھے۔ ایک ایک کا نام لینا بھی ٹھیک نہیں تھا۔ اندراج موجود تھا لیکن وہ امیر امیر کے قبضہ میں تھا۔ لیکن تب یہ آسان ہو گیا تھا جب کارواں کے سفر کے ستائیسویں دن، بڑاؤ کے وقت، تین لڑکیاں امیر امیر کے پاس کھڑی کچھ کہہ رہی تھیں۔

”یہ صرف آپ کی وجہ سے ہوا ہے کہ ہم اس جگہ، اس مقام پر کھڑے ہیں۔ ہم نے زمین کے مختلف حصوں پر نمازیں ادا کی ہیں، تلاوت قرآن پاک کی ہے..... انجمنی ہواؤں کے سلام وصول کیے اور بیٹھے کنوؤں کے پانی پیے ہیں..... یہ سفر..... یہ صرف آپ کی وجہ سے ممکن ہوا ہے۔“

”میری وجہ سے.....“ اس نے عزیزہ کو دیکھا۔

”لیکن تم نے کہا تھا تمہارا امیر ”رب العالمین“ ہے۔ یہ اس کی وجہ سے ہوا ہے۔“

”درویش کا کہنا ہے کہ اللہ ہمیں جو آسانیاں عطا کرتے ہیں، اس کا ذریعہ کوئی نہ کوئی ضرور بنتا ہے۔ ہمارا اس آسانی کا ذریعہ آپ بنے ہیں۔ اس لیے ہم آپ کا شکر ادا کر رہی ہیں۔“ عزیزہ اس کی یادداشت پر حیران تھی۔ کیا انسان تھا، درگزر کرنے کے لیے تیار ہی نہیں تھا۔

”شکریہ..... پتھر مار کر..... یا پتھر مارے بغیر.....“ ایک دم سے اس کے منہ سے نکل گیا تھا۔ وہ سنجیدہ صورت کھڑا تھا، کاروان کا سر براہ تھا، ایسا مذاق یا طنز اسے زرب نہیں دیتے تھے..... تو پھر وہ سب نازیبا کام ہی کیوں کر رہا تھا۔

عزیزہ نے جھٹکے سے سر اٹھایا تھا۔ ”ایک معمولی سا پتھر تھا، بھول بھی جائیں اسے۔“ وہ شرمندہ کم ہوئی تھی، ہل زیادہ کھایا تھا۔ جنت اور آمنہ خاموش کھڑی تھیں لیکن دل ہی دل میں ہنس رہی تھیں، عزیزہ کتنی جلدی بھڑک اٹھتی ہے۔ آمنہ سوچ رہی تھی۔

”پتھر تو معمولی ہی ہوتے ہیں، لیکن جس نیت سے مارے جاتے ہیں، وہ نیت غیر معمولی ہوتی ہے۔“ ابن موسیٰ نے بات کہہ کر حیرت سے اپنی بات کو محسوس کیا۔ وہ ایسی باتیں ایک لڑکی سے کیسے کر سکتا ہے۔ اتنا شرمندہ کس لیے کرنا.....

”میں کوئی شیطان تو نہیں تھا جسے نکلے مارا۔“ کہنے سے بازو پھر بھی نہیں رہا تھا۔

عزیزہ کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کرے، کہاں جا چھپے۔ ”اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جب ہمیں ٹھوکر لگتی ہے تو ہم ذرا سنبھل کر چلنے لگتے ہیں۔“ ٹھوکر اور نکل میں فرق ہوتا ہے۔ تم نے کہا تھا کہ مجھ پر پہاڑ اٹھا کر دے بارودی۔ اہرام بھی.....

جنت نے تو کچھ سنجیدگی ظاہر کر دی لیکن آمنہ اپنی ہنسی قابو میں نہیں رکھ سکی تھی۔ وہ ایک دم سے منہ پر ہاتھ رکھ کر کھسک گئی تھی۔ عزیزہ سخت سے دونوں کو دیکھ کر رہ گئی اور امیر انج کے قریب سے دور ہٹ گئی۔ ”کچھ گناہ (نکل) بہت بھاری پڑتے ہیں۔“

وہ زرب لب بڑبڑاتی تھی۔ پاؤں جھٹک جھٹک کر چل رہی تھی۔ ابن موسیٰ مسکرائے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔

ابن منصور بھی آنکھوں کو اندر دھنساے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ وہ ان چاروں کو باتیں کرتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ پھر وہ ان تینوں کے پیچھے لپکا تھا۔

”درویش نے مجھ سے کہا تھا کہ میری بیٹیوں کا خیال رکھنا، لیکن میں چوک گیا۔ میں تمہارا چچا ہوں،

درویش کا عزیز دوست، ابن منصور۔“ وہ ان تینوں کے قریب جا کر کھڑا ہوا تھا۔ تینوں کے چہروں پر چادر کے پلو کھینچے ہوئے تھے۔ وہ تینوں تذبذب کا شکار تھیں۔ انہیں درویش نے ایسا کچھ نہیں کہا تھا کہ کوئی ابن منصور نام کا چچا ہے، ان کا دوست ہے۔ لیکن پھر وہ درویش کو کیسے جانتا تھا اور ان تینوں کو بھی۔

”کوئی مشکل ہو تو تم مجھ سے کہہ سکتی ہو۔“ وہ ان کے تذبذب کو دیکھ رہا تھا۔

”جی کیوں نہیں.....“ آمنہ نے کہا تو ابن منصور کے چہرے پر مسکراہٹ در آئی تھی۔ یقینی وہ تینوں درویش کی ہتھیائیاں ہی تھیں۔

”تم تینوں کہیں ہو؟“ تینوں کے چہرے کے رنگ بدلے جو ابن منصور سے چھپے نہیں رہ سکے تھے۔

”جی..... ہمیں ہی سمجھ لیں.....“ عزیزہ نے فوراً کہا۔

”ہمیں ہی سمجھ لیں.....“ ابن منصور زرب لب بڑبڑایا۔ ”والد کیا کرتے ہیں، کیا نام ہے ان کا؟“

قاہرہ میں ہی ہوتے ہیں؟“ تینوں کے رنگ اجڑ کر سیاہ ہو چکے تھے۔ ان کے چہرے چھپے ہوئے تھے لیکن ان کے ہاتھوں کی کپکپاہٹ ابن منصور کو حیران کر گئی تھی۔ تینوں جواب دیے بغیر پلٹ کر جانے لگی تھیں۔ ابن منصور حیران انہیں دیکھ رہا تھا۔ تیزی سے جاتے ہوئے، اپنی چادر کو درست کرتے ہوئے گھبراہٹ میں عزیزہ کا ہاتھ کچھ زیادہ ہی سر کی سمت بلند ہو گیا تھا..... کہ اس کے ڈھیلے کرتے کی آستین ڈھلک کر کبھی تک جا پہنچی تھی..... اور.....

ایک رسم ہوا کرتی ہے، جس بچی کو خیمہ خانے لایا جاتا ہے، گرم سلاخ سے اس کے جسم پر ایک نشان داغ دیا جاتا ہے..... کچھ کے گردن کے نیچے، کچھ کے شانے پر اور کچھ کے کبھی سے ذرا اوپر بازو پر..... کبھی سے ذرا اوپر بازو پر..... عزیزہ کا وہ نشان، ابن منصور کے سامنے نمایاں ہو کر چھپ چکا

تھا۔ وہ لڑکیاں آگے جا چکی تھیں، عزیزہ کچھ پیچھے تھی، وہ لپک کر عزیزہ کے سامنے جا کر کھڑا ہو چکا تھا۔ ”تو تمہیں اپنے باپ کا نام معلوم نہیں ہے، نہ ہی پتہ.....“ اس نے ہاتھ بڑھا کر جھٹکے سے اس کا نقاب پھینچ دیا تھا۔ عزیزہ ہکا بکا رہی گئی تھی۔

”طوائف اپنی چال سے، ورنہ اپنی خوشبو سے..... ورنہ اپنی کھال سے پہچان لی جاتی ہے.....“

اس کا ہاتھ کھینچ کر آستین کو کبھی کے اوپر جھٹکے سے چڑھا کر وہ اس کے نشان کی سمت اشارہ کر رہا تھا۔

کڑی درویش سے شروع ہو کر ابن موسیٰ سے جا ٹکی تھی۔ عزیزہ ششدر ابن منصور کو دیکھ رہی تھی۔ وہ اتنی حواس باختہ ہو چکی تھی کہ گردن موڑ کر جنت اور آمنہ کو بھی نہیں بلا سکتی تھی۔

”طوائفیں حج پر جا رہی ہیں..... ہم پر خدا کا قہر نازل ہو گا..... ہم صحرائیں شاہ و بر باد ہوں گے۔“

ابن منصور نے بلند آواز سے کہا تھا۔ جنت اور آمنہ کے کانوں میں لفظ ”طوائف“ بڑا تو انہوں نے حیرت سے پلٹ کر ابن منصور کو دیکھا۔

”آپ کو شرم آتی چاہیے ایسی باتیں کرتے ہوئے.....“ عزیزہ کی آواز گنپ رہی تھی۔

”شرم تو تم تینوں کو آتی چاہیے، ورنہ ابن موسیٰ کو..... طوائفان ہم سے ٹکرائیں گے۔ ہم ذلیل و رسوا ہوں گے۔ اس کاروان کے ساتھ خلاف کعبہ ہے اور اسی کاروان کے ساتھ ”تین طوائفیں.....“ ہم اللہ کے عذاب کے حق ہیں۔ تق ہے امیر کاروان پر۔“

آمنہ اور جنت جہاں کی جہاں کھڑی رہ گئی تھیں۔ عزیزہ ابن منصور کی نفرت انگیز باتوں کی تاب نہیں لا پا رہی تھی۔

”ہم تو بے گناہ ہیں.....“ وہ رو رہی دی تھی۔

”تم ہمیں برباد کر دینے والی ہو.....“ ابن منصور نے نفرت سے ان تینوں کو دیکھا۔

☆☆☆

بڑے عہدے جو بڑے دشمن لاتے ہیں، وہ ان ہی دشمنوں میں گھرا ان کے سوالوں کا جواب

دین

ماہنامہ

فروری 2019ء کا شمارہ شائع ہو گیا

مذہب دار و راز پر پیر اور
دیکھیں مضامین
کے ساتھ



• اداکارہ ”گل رعنا“ سے شاہین رشید کی ملاقات،

• اداکارہ ”کنزہ ہاشمی“ کہتی ہیں ”میری بھی سنے“،

• آواز کی دیوانے ”محمد طبابت سائر“ اس ماہ مہمان ہیں،

• اس ماہ ”صفیہ ناز“ کے ”مقابل ہے آئینہ“

• ”ہوا کیوں رخ بدل گئیں“ گفت عبد اللہ کا

سلے دار ناول،

• ”شب غم کی سحر“ رخ چوہدری کا سلسلہ دار ناول،

• ”سامر کنارے“ ام طیفور کا مکمل ناول،

• ”شام رنگ سیاہ“ انکس رضا کا ناول،

• ”مشن آتش“ ندا حسین کا مکمل ناول،

• ”فروری فیری ٹیل“ فطاح حسن علی کا ناول،

• سیما بخت عاصم، طیبہ غفر مغل، دانیہ آفرین

کے افسانے اور مستقل سلسلے،

دے رہا تھا۔

”وہ مسلمان ہیں..... ہر مسلمان کا اللہ کے گھر پر حق ہے.....“ وہ اپنا غصہ ضبط کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔
”وہ طوائفیں ہیں.....“

”وہ انسان ہیں..... بس انسان.....“
”ان کے جسموں پر ماضی کے نشان موجود ہیں..... ان کے گناہ.....“

”میں کسی نشان کو نہیں جانتا۔ میں یہ جانتا ہوں کہ اگر کوئی جج پر جانا چاہتا ہے، تو کارواں میں اسے شامل کیا جاتا ہے۔“

”جج پر حاجیوں کو لے کر جایا جاتا ہے..... ایسے ذلیل لوگوں کو نہیں۔“
”دلوں کے حال اور اعمال کا حساب اللہ پر چھوڑ دیں۔“

”اللہ نے معاملات طے کرنے کا اختیار انسان کو دیا ہے۔“
”امیر راج ہونے کی حیثیت سے میں نے جو مناسب سمجھا وہ کیا۔ میں نے کچھ غلط نہیں کیا۔“

”اگر یہ سب درست تھا تو تم نے چھپا کر کیوں رکھا؟“
”اس لیے کہ آپ کی سوچ تنگ ہے۔“

”یہ تمہارا کاروان نہیں ہے، یہ کاروان مصر ہے..... تم جواب دہ ہو اور تمہیں اس غلطی کا خمیازہ بھگتنا ہوگا۔“

”اگر آپ نے غلطی ثابت کر دی تو میں سزا بھی بھگت لوں گا۔ بہتر ہوگا کہ مجھے مصر والی تک دو بارہ کسی سوال کے لیے زحمت نہ دی جائے..... وہ بیٹیوں لڑکیاں بھی کارواں کے ساتھ ہیں۔ مجھے ان کے ماضی سے کوئی مطلب نہیں ہے، جیسے مجھے آپ سب کے ماضی سے کوئی مطلب نہیں ہے۔ مجھے کسی حاجی کے اعمال اور اس حاجی کے دل کے حال سے بھی کوئی سروکار نہیں ہے۔ میں امام کعبہ سے اس سلسلے میں ضرور بات کروں گا اور ان سے درخواست کروں گا کہ وہ خطبہ جج میں اس مسئلے پر بھی روشنی ڈالیں۔“

ابن منصور کا چہرہ غصے سے سرخ ہو چکا تھا۔ ”تم ڈھیٹ ہو۔ تم اس عہدے کے لائق نہیں ہو۔“

”ہاں ابن منصور! میں ڈھیٹ ہوں لیکن اس عہدے کے لائق بھی میں ہی ہوں کیونکہ میرا دل صاف ہے۔ اب میں سمجھا کہ امیر راج..... امیر کیوں کہلاتا ہے کیونکہ وہ ہر مافی بات پر غالب آتا ہے۔ وہ صحرا کے ڈاکوؤں اور شیطان کے حملہ آوروں، ددلوں سے لڑتا ہے..... جب وہ جیت جاتا ہے تو پھر وہ ”امیر“ کہلاتا ہے۔“

”یہ تمہارا آخری کاروان ہے جس کے تم امیر ہو۔“ ابن منصور نے دانت نہیں کر کہا۔
☆☆☆☆

حاجیوں کا کارواں چلا رہا۔ ان بیٹیوں کے اونٹ انہیں اپنا سوار بنا کر آگے بڑھتے رہے۔ انہیں گمان بھی نہیں تھا کہ جس سفر پر وہ نکلی ہیں، وہ سفر دراصل کتنا لمبا ہو جانے والا ہے۔ یہ سفر، اس کی منزل انہیں کہاں لے جانے والی ہے۔ انہیں اونٹ کے کوہان سے آسمان قریب لگتا تھا۔ صحرا کی ریت پر بچہ کرتے، اللہ کا قرب نصیب ہوتا تھا۔ انہیں یہ یقین حاصل ہو چکا تھا کہ دنیا میں جتنے خوش قسمت لوگ موجود ہیں، وہ ان میں سب سے زیادہ خوش قسمت ہیں۔

وہ خوش قسمت تھیں، لیکن وہ یہ نہیں جانتی تھیں کہ وہ کارواں کے ساتھ جج پر جانے والی نہیں تھیں۔ آج کی رات سے اگلی رات..... وہ اس سفر سے نکال دی جانے والی تھی۔

وہ بیٹیوں..... بیٹیوں ہی..... کوڑیوں کے مول فروخت ہو جانے والی تھیں۔
آمنہ..... جنت اور عزیزہ.....

سر بازار..... ان کی وہ قیمت لگنے والی تھی۔ جو آج سے پہلے کسی انسان کی نہیں لگی تھی۔

(دوسری اور آخری قسط آئندہ ماہ)

خوانین اور شہزادوں کیلئے اپنی طرف کا پہلا باب۔

خوانین ڈائجسٹ

فروری 2019ء
کے شمارے کی ایک جھلک



- ✽ ”الف“ عمیرہ احمد کانول،
- ✽ ”حالم“ نمرہ احمد کاکمل ناول،
- ✽ ”میرے پاس رہو“ افشین نعیم
- ✽ کاکمل ناول،
- ✽ ”آخری کنارے تک“ سدرہ حیات
- ✽ کاکمل ناول،
- ✽ ”میری طلب کا چاند“ فرح بیٹو
- ✽ کانالٹ،
- ✽ نگہت سیما، شازیہ الطاف ہاشمی، حبیبہ عمر،
- ✽ نقاش حسن علی، حیات بخاری اور نورین زہرہ
- ✽ کے افسانے،
- ✽ نیوز کاسٹ اور مقبول شاعر ”وجیبہ ثانی“
- ✽ سے ملاقات،
- ✽ سانوری کی شمع ”سحر اختر“ سے باتیں،
- ✽ ”کرن کرن روشنی“ پیارے نبی ﷺ
- ✽ کی پیاری باتیں،
- ✽ ہمارے نام، نفسیاتی ازدواجی الجھنیں،
- ✽ عدنان کے مشورے اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں،

خوانین ڈائجسٹ کا فروری 2019ء کا شمار آج ہی شروع ہوا



شہزاد غیر معمولی حسن کی مالک نہیں تھی لیکن حالات کی تنگیوں نے اس کی شخصیت کو مضبوط بنا دیا تھا، اس کے اعتراف میں اس کی شخصیت کو دل کشی عطا کی تھی۔

فرین ہنس ایک عورت اور مرد مقرر کر رہے تھے ان کے ساتھ ایک بچی بھی تھا۔ عورت اور مرد کو احساس تھا کہ موت ان کے تعاقب میں ہے ان کے تمام گھر والوں کو مار دیا گیا تھا۔ گاڑی ایک انجین برقی تو ماں نے فیصلہ کیا کہ بچے کو کسی جگہ چھوڑ دے تاکہ اس کی جان بچ سکے۔ اس نے بچے کو ایک بیچ کے نیچے رکھ دیا اور خود فرین کی بھری پار کرتے ہوئے حادثہ کا شکار ہو گئی۔

میرزاؤں میں محترم علی اور خاتون علی کا خاندان آباد ہے۔

محترم علی خان ایم اے ہیں، ان کے تین بیٹے و باج، برہان اور شاہ میر ہیں۔ بیٹی ایک ہی ہے جس کا نام در شہوار ہے۔ خاتون علی نے دو شادیاں کی ہیں، پہلی بیوی شارقہ بیگم سے دو بیٹیاں انابیہ اور طوبی ہیں۔ بیٹے کے لیے انہوں نے ندرت بیگم سے دوسری شادی کی لیکن ان سے کوئی اولاد نہ ہو سکی۔

خاتون علی کی بہن فوزیہ اور ان کے شوہر ایک فضائی حادثے میں چل بسے تو ان کے دونوں بچے یتیم ہو گئے اور ارسل پرورش ندرت بیگم نے ہی بچے یتیمہ کو لگائی۔ بھالی کی عادت ہے۔



ان کے گھر کے سامنے جنگل ہے جہاں طوبی اور در شہوار امتحان میں کامیابی کے لیے برگد کے درخت پر دھاگا باندھنے رات کو جا رہی ہیں اور شاہ میر انہیں پکڑ لیتا ہے۔ شاہ میر گھر والوں کے سامنے ان کا بھانڈا اچھوڑ دیتا ہے جس کی بنا پر ان کو گھر والوں سے بہت ڈانٹ پڑتی ہے۔

انابیہ کا نکاح برہان سے ہو چکا ہے، لیکن برہان کا سر درد یہ اسے افسردہ کرتا ہے۔

ٹیٹا بیگم فیشن انڈسٹری کی ایک معروف شخصیت تھیں، دو شادیاں ناکام ہو چکی تھیں، آج کل وہ تیسرے شوہر سے جان چھڑانے کے پکر میں تھیں۔ معروف یورو کریٹ سیف الرحمن کے ساتھ ان کا نام لیا جا رہا تھا۔

پہلے شوہر سے ان کی دو بیٹیاں تھیں، بڑی شہزادہ جے اعلا تعلیم کے لیے انہوں نے باہر بھجوا دیا تھا۔ رومیہ چھوٹی تھی اور اس کی اپنی ماں سے بالکل نہیں بنتی تھی۔ ان کے آنے دن کے اسکیٹل اس کے لیے مسئلہ بنتے تھے۔

اس نے خود کشی کی دھمکی دے کر شہزادہ کو پاکستان آنے پر مجبور کر دیا۔ شہزادہ کی آمد ٹیٹا بیگم کو شدید ناگوار گزری۔ شہزادہ پاکستان آئی تو ایک پرانی فون کال نے اسے ڈسٹرب کر دیا۔ طوبی اور در شہوار غلطی سے براہ راست گھر میں داخل ہوئیں تو پتا چلا کہ جو گھر پچھلے ایک ماہ سے خالی پڑا تھا، وہاں محمد ہادی آچکا ہے۔ محمد ہادی فاریسٹ آفیسر ہے، تعلق ایک امیر اور اعلا تعلیم یافتہ گھرانے سے ہے۔ وہ اپنی دوست سہد کو بھی اپنے بیٹے میں لے آیا ہے۔

محترم علی کا بیٹا و باج شادی شدہ ہے لیکن گھر کی ملازمت صندل پر بری نظر رکھتا ہے۔ رومیہ نے گھر میں شدید توڑ پھوڑ کی اور ٹیٹا بیگم سے شدید نفرت کا اظہار کیا۔ شہزادہ سے ماہر نفسیات کو کھانے کا مشورہ دیتی ہے۔

در شہوار اور۔۔۔ طوبی محمد ہادی کے بیٹے میں جاتی ہیں اور درخت پر چڑھ کر خوبانیاں توڑتی ہیں، محمد ہادی سختی سے پیش آتا ہے تو در شہوار سے دھمکی دیتی ہے، ان دونوں کے درمیان ٹکڑن جاتی ہے۔

تیسویں قسط



کمرے میں موجود تینوں مکین ایک دوسرے سے نظر نہ کر پائے بیٹھے تھے۔

سزعالیہ قریشی کے چہرے پر شدید صدمے کی کیفیت تھی جبکہ قریشی صاحب اور ان کی بہن فائزہ بیگم دونوں شرمندگی سے نظریں چرائے یوں بیٹھے تھے، جیسے ان کے پاس کہنے کو کچھ باقی نہ رہا ہو۔

سزعالیہ قریشی جو ایک ماہر قانون دان تھیں، جنہوں نے ساری زندگی مکہ و عدالت میں اپنے مخالفین کو کبھی کبھار کر لیے خلاف بولنے کا موقع نہیں دیا، جن کے کرپٹ پروڈر جنوں ہائی پرو فائل کامیاب کیسز تھے، جن کا نام ہی کامیابی کی ضمانت سمجھا جاتا تھا، جن کا دعوہ تھا کہ سو برسوں میں چھپی ہوئی چیز بھی ان کی آنکھوں سے اوجھل نہیں رہ سکتی، وہ انتہائی مشکل اور پیچیدہ کیسز میں سے بھی کوئی نہ کوئی نکتہ نکال کر سب کو حیران کرنے کے ہنر سے واقف تھیں۔ لیکن وہ اس وقت پہلی چوٹی لگا ہوں سے اپنے شوہر اور سائیز میز پر رکھی منجر ہادی کی تصویر کو نگے جارہی تھیں۔ ان کا دماغ اس بات کو ماننے سے انکاری تھا کہ ہادی ان کی سگی اولاد نہیں اور یہ کیسے ممکن تھا کہ پچھلے چوبیس پچیس سالوں میں کبھی ایک لمحے کو بھی ان کے ذہن میں ایسا خیال نہیں آیا۔

وہ ہمیشہ اس کے نقوش کو بھی اپنے اور بھی قریشی صاحب سے ملانے کی کوشش کرتیں۔ انہوں نے اپنے بچے کی زندگی کا ایک ایک لمحہ انجوائے کیا تھا اور اس کی پیدائش کے تقریباً دو تین سال تک اپنی لاء کی پریکٹس بھی چھوڑ دی تھی۔ ان کے پاس ہادی کی زندگی کا ہر یادگار لمحہ تصویروں کی صورت میں محفوظ تھا اور اس وقت وہ وہی الم اپنی گود میں کھولے ہوئے بیٹھی تھیں۔

”ہادی ان کی سگی اولاد نہیں۔“

اس رنگوں کو کاٹ دینے والے انکشاف نے انہیں انگلی دس منٹ میں ہاسپٹل پہنچا دیا تھا، عبداللہ صاحب اور ان کی بہن فائزہ تو بیکھلا کر رہ گئے جبکہ ہادی نے شخص ان دونوں کو شکایتی نظروں سے دیکھا کیونکہ اس حقیقت کو جاننے کے بعد سزعالیہ قریشی کا بلڈ پریشر ایک شاکٹ کر گیا تھا۔

اگلا پورا دن وہ ہاسپٹل میں رہیں، وہ بار بار ماضی کو کھنگال رہی تھیں، اتنا تو انہیں بھی یاد تھا کہ ان کی پریکٹس خاصی پیچیدہ تھی اور بیٹے کی پیدائش کے بعد ان کو بھی بتایا جا رہا تھا کہ بچہ زسری میں ہے کیونکہ دنیا میں آنے کے بعد وہ صحت کے حوالے سے کافی مسائل کا شکار تھا، انہوں نے اپنے بیٹے کو کافی دن کے بعد دیکھا تھا کیونکہ وہ خود بھی کافی بیمار ہو گئی تھیں اور اس موقع پر ان کی اکلوتی ننڈ ڈاکٹر فائزہ نے ان کا بھرپور ساتھ دیا تھا۔

سزعالیہ قریشی کو جب سے اس حقیقت کا اور اک ہوا، وہ مسلسل روئے جارہی تھیں، ان کو مسلسل ٹریکولائزر دے کر نیند میں رکھا جا رہا تھا، اڑتالیس گھنٹوں کے بعد وہ اس قابل ہوئی تھیں کہ کسی سے بات کر سکتیں۔

”ہادی کہاں ہے؟“ انہوں نے مکمل ہوش میں آنے کے بعد بڑھ حال لہجے میں پوچھا۔

”آپ کی میڈیسن لینے گیا ہے، بس آتا ہی ہوگا۔“

فائزہ بیگم کی اس اطلاع پر عالیہ نے شکایتی نظروں سے اپنی اس اکلوتی ننڈ کی طرف دیکھا، جوان کی بہترین دوست بھی تھیں اور ان ہی کی وجہ سے ان کا اور عبداللہ صاحب کا رشتہ ہوا تھا۔ وہ ان کی نظروں میں چھپا گلہ بھانپ کر جذباتی انداز میں گویا ہوئیں۔

”خدا کی قسم بھابھی! میں اگر ایسا نہ کرتی تو آپ کسی اس تلخ حقیقت کو قبول نہ کرتیں۔ خود سوچیں تیرہ سال کے بعد آئی وی ایف پرو۔ بچر کے بعد پیدا ہونے والی اولاد دنیا میں قدم نہ رکھتے ہی اپنی سانوں سے رشتہ توڑ لے تو وہ ماں زندہ رہنے کے لیے کیا جواز دھوئے گی۔“

”اور غلطی ساری فائزہ کی نہیں، میری بھی ہے، میں نے ہی اس سے کہا تھا کہ اپنے ہاسپٹل یا آس پاس میں

سے کوئی بچہ لا کر تمہاری گود میں ڈال دے، کیونکہ میں تمہیں اپنے بچے کے انتقال کی خبر دے کر مزید کسی فانی اذیت سے دوچار کرنا نہیں چاہتا تھا۔“ عبداللہ صاحب نے ان کی جامد خاموشی سے گھبرا کر اپنی بات میں مزید اضافہ کیا۔

”عالیہ! ذرا سوچو، تم نے تیرہ سالوں میں اولاد حاصل کرنے کے لیے کیا کچھ نہیں کیا، ہر علاج، ہر ٹوکا اور دنیا جہان کے وظیفے کڑا لے۔ میں نے تمہیں راتوں کو اللہ کے سامنے گڑا گڑا کر روتے ہوئے دیکھا، تم نے بس ضد باندھ لی تھی کہ تمہیں ہر حال میں اولاد دیا جائے اور میں تمہیں اس حالت میں دیکھ کر خوف زدہ ہو گیا تھا، تم نے اپنا کیریر، اپنی ذہانت اور ہر چیز پس پشت ڈال دی تھی۔“ وہ انہیں ماضی کا وہ دردناک دور یاد دلارہے تھے۔

”جب ڈاکٹر نے تمہیں آئی وی ایف کر دینے کا مشورہ دیا تو تم اس کے لیے بھی تیار ہو گئیں لیکن تمہارے پہلے دو پریوجرز، تاکام ہونے کے بعد جب تیسری دفعہ ہمیں خوش خبری ملی تو تب میں نے بہت دعاؤں کی تھیں کہ اللہ پاک تمہیں مکمل اور بھرپور خوشی سے نوازے، لیکن ایسا نہیں ہو سکا، ہمارا بچہ دنیا میں آنے کے فوراً بعد ہی چل بسا۔“ ان کا لہجہ نرم ہوا اور وہ خاموش ہو گئے۔

”ہادی کس کا بچہ ہے؟“ سزعالیہ قریشی نے نظریں چرا کر دندھے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

”یہ میری بیٹ فرینڈ ڈاکٹر باب کے ریفرنس سے میرے پاس آیا تھا، اس کے شوہر ہریلوے پولیس میں تھے اور بونی کے دوران انہیں یہ بچہ ایک اسٹیشن ماسٹر نے دیا تھا، باب نے جس رات مجھ سے ذکر کیا، اس رات آپ آرٹیشن تھیٹر میں تھیں اور آپ کے بے بی کے انتقال کی خبر مل چکی تھی اور میں اور بھائی جان دونوں ہی خوف زدہ تھے کہ آپ یہ صدمہ کیسے برداشت کریں گی۔“ فائزہ کی آنکھیں نم ہوئیں۔

”اور تم لوگوں نے اسے میری جھولی میں ڈال دیا؟“ سزعالیہ قریشی بشکل گویا ہوئیں۔

”بھابھی! اس بچے کو آپ ہی کی گود میں آنا تھا کیونکہ سر دیوں کی اس ٹھنڈی ہوئی رات کو ایک سنیان اسٹیشن کے بیچ کے نیچے لیٹا ہوا بچہ اگر پوری رات کسی جانور سے محفوظ رہا تو اس میں اللہ کی کوئی نہ کوئی حکمت تھی، آپ کو شاید یاد نہ ہو، لیکن یہ جب ہمارے پاس آیا تو اسے نمونہ ہو چکا تھا اور ڈاکٹر کے مطابق اسے فوری طور پر ماں کے دودھ کی ضرورت تھی، اور میں ان دنوں منائل کو فیڈ کر رہی تھی لیکن میں نے آپ کی اور اس بچے کی جان بچانے کی خاطر اسے اپنا دودھ پلایا تاکہ یہ ہمارے خاندان کا حصہ بن جائے۔“ وہ شرمندگی سے انہیں ساری بات تفصیل سے بتا رہی تھیں۔

”لیکن خدا کی قسم میرا مقصد آپ کو کسی قسم کا دھوکا دینا نہیں تھا، بچے کے لیے آپ کی دیباگی ہم میں سے کسی سے بھی ڈھکی چھپی نہیں تھی اور آپ کے اسی جنون نے ہمیں یہ قدم اٹھانے پر مجبور کیا تھا۔“ فائزہ کی آنکھوں سے آنسو پھیلے۔

”مجھے تمہاری محبت اور غلوں پر کوئی شبہ نہیں ہے فائزہ! لیکن تم لوگ یہ بات صرف اور صرف مجھے بتاتے۔ ہادی کے سامنے ذکر نہ کرتے۔ کیا سوچنا ہوگا میرا بچہ؟ یہ تلخ حقیقت جان کر اس کے دل پر کیا گزرے گی؟“

وہ دونوں ہاتھوں سے اپنی کپٹیاں دبا رہی تھیں۔ ان کے چہرے پر اذیت کے تاثرات تھے، عبداللہ صاحب کے دل پر گھونٹہ پڑا۔

”تم ہادی کی ٹینشن مت لو عالیہ!“ ان کے شوہر نے نرمی سے انہیں دلاسا دیا۔

”کیوں ٹینشن نہ لوں؟ میں مانتی ہوں، میں نے اسے پیدا نہیں کیا لیکن خدا کی قسم میرے دل و دماغ میں کبھی ایک لمحے کو بھی یہ خیال نہیں گزرا کہ میری گود میں پلنے والا بچہ میرا اپنا خون نہیں، میں نے ایک سگی ماں سے بڑھ کر اس کی پرورش کی، اس کے لیے اپنا کیریر چھوڑ دیا، جب تک میرے بچے نے پاؤں پاؤں چلنا نہیں سیکھا،

میں نے ایک قدم اپنے گھر سے باہر نہیں نکالا، جب تک وہ اسکول جانے کے قابل نہیں ہوا، میں نے کورٹ میں جھانک کر نہیں دیکھا، میں اس کی بیماری کے دنوں میں راتوں کو جاگی ہوں، اپنا دن کا سکون برباد کیا ہے، میں کیسے ٹینشن نہ لوں۔“ وہ جذباتی انداز میں رو پڑیں۔

”جہاں اتنے سال آپ نے اس حقیقت کو چھپائے رکھا، کاش باقی زندگی بھی ایسے ہی چپ رہتے۔“ ان کی آنکھوں سے آنسو ایک لڑی کی صورت میں بہہ رہے تھے۔ ہر وقت کمپوزر بننے والی مسز عالیہ قریشی بہت برے طریقے سے ٹوٹی تھیں، وہ تو بڑی سے بڑی بات پر بھی بہت محل کا مظاہرہ کرتی تھیں۔

”ہادی اب بھی ہمارا ہی بیٹا ہے عالیہ۔“ قریشی صاحب نے محبت سے ان کا ہاتھ پکڑ کر تسلی دی۔
”آپ لوگ کیا سمجھتے ہیں، یہ حقیقت جاننے کے بعد میں اب ہادی کو اپنی سکی اولاد نہیں سمجھوں گی تو یہ آپ کی بھول ہے۔“ وہ ایک دم بھڑک اٹھیں۔

”میرے نزدیک جنم دینے والے سے زیادہ پالنے والے کا حق ہوتا ہے، اور میرا اللہ گواہ ہے کہ وہ بچہ میرے لیے کیا ہے؟ میری سانسوں کی ذور اس کے ہونے سے جڑی ہوئی ہے۔ میرے زندہ رہنے کا سب سے بڑا جواز ہے وہ، اور اس حقیقت کو جاننے کے بعد اگر وہ مجھ سے دور ہوا تو میں آپ دونوں کو کبھی معاف نہیں کروں گی۔“ جذباتی انداز میں بولتے ہوئے مسز عالیہ قریشی کی آواز بلند ہوئی اور کمرے میں داخل ہوتے ہادی نے ان کے یہ تمام جملے بھائی ہوش و خواص سنے۔

وہ ان کی میڈیسن لے کر ابھی گھر پہنچا تھا، اس نے ہاتھ میں پکڑا الفا فو سائڈ میز پر رکھا اور مسز عالیہ قریشی کے ہینڈ پر ہینڈ کر بڑی محبت سے اپنا بازو دھپکا کر انہیں خود سے قریب کیا، وہ ان کے سارے خوف جانتا تھا۔ مسز قریشی کا جسم ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔ ہادی کا اپنا چہرہ افسردگی میں ڈوبا ہوا تھا لیکن وہ ایک مرد تھا، اس لیے خود کو کافی حد تک سنبھال چکا تھا۔

”میرا اس میں کوئی قصور نہیں ہے بیٹا! اللہ گواہ ہے، میں بھی اس حقیقت کو نہیں جانتی تھی۔“ وہ ہادی کی خاموشی سے گھبرا کر خود ہی صفائی دینے لگیں۔
”ممی! مجھے آپ سے کوئی گلہ نہیں۔“ وہ آہستگی سے گویا ہوا۔

”میں جانتی ہوں بیٹا! یہ بات جان کر تمہیں مجھ سے زیادہ تکلیف ہوئی ہوگی، لیکن یقین مانو، مجھے اس چیز سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ تم کسی کی اولاد ہو۔ میں نے تمہیں ہمیشہ اپنے وجود کا حقہ سمجھا ہے اور سستی رہوں گی۔“ وہ روتے ہوئے اسے اپنی محبت کا یقین دلارہی تھیں اور اس سے زیادہ برداشت کرنا ہادی کے بس میں نہیں تھا اور اس کے ضبط کا پیمانہ جھلک ہی پڑا۔

”بابا! آپ جانتے ہیں؟ میں یہ حقیقت کچھ سال پہلے جان چکا ہوں۔“
ہادی کے اس جملے پر مسز عالیہ قریشی کے سر پر ایک اور آسمان ٹوٹا، وہ سخت بے یقینی اور صدمے بھری کیفیت کے ساتھ اس کی طرف دیکھتی چلی گئیں، آج کی تاریخ میں ملنے والا یہ دوسرا شاک تھا، جو پہلے سے زیادہ ان پر عذاب بن کر ٹوٹا تھا اور وہ ایک جھٹکے سے پیچھے ہٹ کر بیٹھیں اور کھٹکی سے اس کی طرف دیکھنے لگیں، وہ مگر کبھی اس بات کا یقین نہیں کر سکتی تھیں کہ ہادی اس حقیقت سے باخبر ہوگا۔

”کیا کہا تم نے؟ تم اس سچائی کو جانتے تھے؟“ ان کا تعجب میں ڈوبا ہوا انداز ہادی کو گفت میں مبتلا کر گیا۔
”آئی ایم سوری ممی! مجھے لگتا تھا کہ کہیں آپ بابا یا دنیا میری حقیقت کھلنے کے بعد مجھے دھتکار نہ دے۔“
اس کی بات پر مسز عالیہ قریشی کے کلیجے میں ہاتھ پڑا۔
یہ اس کے خود ساختہ خوف ہی تھے جنہوں نے اسے حریم کے سامنے محبت کا اظہار کرنے سے روک دیا تھا،

وہ جزوہ کا بیٹ فریڈ تھا اور اچھی طرح سے جانتا تھا کہ اس کے والد حسب نسب کے بہت قائل تھے اور انہوں نے جزوہ کی محبت کی حقیقت جاننے کے بعد بھی سب سے پہلے شہر زاد کے بیک گراؤنڈ اور اس کے والدین کے بارے میں پوچھا تھا اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ عبداللہ قریشی صاحب نے اسے یہ سچ حقیقت بتانے کے بعد وعدہ کیا تھا کہ وہ اپنی لائف پارٹنر اور اس کے خاندان سے اس بات کو نہیں چھپائے گا کیونکہ قریشی صاحب، زندگی کے سب سے بڑے معاملے کی بنیاد جھوٹ پر رکھنے کے قائل نہیں تھے، اور اس بات نے ہادی کو اتنا ڈرا دیا تھا کہ وہ چاہ کر بھی حریم کے سامنے اپنی چاہت کا اظہار نہیں کر پایا۔

”آپ نے کب بتایا ہادی کو؟“
فائزہ کا تعجب میں ڈوبا ہوا لہجہ اس بات کا گواہ تھا کہ انہیں بھی اس بات کا علم نہیں، وہ تو سمجھتی تھیں کہ دونوں ماں بیٹائی اس حقیقت سے لاعلم ہیں۔

”پانچ چھ سال پہلے میں نے ہادی کو اعتماد میں لے کر یہ ساری بات بتادی تھی۔“ قریشی صاحب کے اس انکشاف پر عالیہ بیگم نے کبھی سی ناراضی سے ان کی طرف دیکھا، صدمہ کی کیفیت پر اب غصہ غالب آ گیا تھا۔
”اس کا مطلب ہے، آپ سب لوگ مل کر مجھے بے وقوف بناتے رہے، بہت آنسوؤں کی بات ہے قریشی صاحب! کم از کم میں آپ سے اس بات کی توقع نہیں رکھتی تھی، کیا آپ کو میرا طرف اتنا چھوٹا لگتا تھا آپ مجھے اس قابل ہی نہیں سمجھتے تھے۔“ وہ ناراضی ہو گئیں۔

”آئی ایم سوری عالیہ! میرا مقصد ہمیں ہرٹ کرنا نہیں تھا۔“
”ہرٹ تو آپ دونوں باپ بیٹا مجھے کر ہی چکے، اب پیچھے ہٹنا ہی چاہیے کیا ہے، آپ خود سوچیں، اس سارے معاملے میں سب سے زیادہ بے وقوف تو مجھے ہی سمجھا گیا۔“ انہوں نے غصے سے کھل تان لیا اور درخ نمود کر لیت گئیں۔ عبداللہ صاحب نے پریشانی سے ہادی کی طرف دیکھا۔
”ممی! آپ میری بات تو سنیں۔“ ہادی نے ہلکا سا جھجک کر انہیں مخاطب کیا تو انہوں نے غصے سے کھل اتار پھینکا۔

”ماں سمجھتے تو کیا کیا کرتے میرے ساتھ؟ مجھ سے اتنی بڑی بات چھپاتے؟ تمہیں میں اتنی گھٹیا لگتی تھی جو یہ بات جاننے کے بعد تمہیں دھتکار دیتی۔ تم نے میری زندگی کی سب سے بڑی محرومی کو ختم کیا، تمہاری وجہ سے میں نے دوبارہ اپنے کیرئیر پر فوکس کیا اور تمہیں کیا لگتا تھا کہ میں اننگی سے پکڑ کر تمہیں گھر سے نکال باہر کروں گی۔“ غصے کی زیادتی پر جذبات غالب آ گئے، وہ ایک دفعہ پھر رو پڑیں۔

”بس کرو دیں ناں ممی! کیوں خود کو اور مجھے اذیت دے رہی ہیں؟ میں نے محض آپ کو اس لیے نہیں بتایا کیونکہ مجھے خود سے کھن محسوس ہوتی تھی، مجھے ایسا لگتا تھا کہ شاید میں کسی گناہ کی پیداوار تھا جسے اس کی ماں نے اپنے وجود سے توج کر وہاں پھینک دیا ہوگا، میں نے مڑ کر بھی اپنی اصل شناخت تلاش کرنے کی کوشش نہیں کی، میری ولدیت کے خاتمے میں عبداللہ قریشی تھا جسے ”اللہ کا بندہ“ اور اللہ نے مجھے آپ کی ویران گود کو آباد کرنے کے لیے بھیجا تھا تو میں کیوں دائیں بائیں بھٹکتا اور میں تو مگر کبھی آپ لوگوں کا یا احسان نہیں بھول سکتا۔“
اس نے اپنے لہجے کی لڑش پر قابو پاتے ہوئے بمشکل اپنی بات مکمل کی تو مسز عالیہ قریشی کو نہ جانے کیوں لگا کہ ان کا دل پھٹ جائے گا۔

”اور میرا اللہ گواہ ہے، میں نے یہ حقیقت جان کر اور زیادہ دل سے آپ کی عزت کی تھی اور میں چاہتا تھا کہ یہ بات بھی کھل کر آپ کے سامنے نہ آئے۔ آپ کو کبھی زندگی میں یہ خیال نہ آئے کہ میں اگر آپ کی سکی اولاد ہوتا تو شاید اس سے زیادہ آپ کا خیال کرتا۔“

وہ جذباتی ہوا۔ سزا عالیہ قریبی نے بے اختیار اسے اپنے گمے سے لگالیا، وہ بگ بگ کر رونے لگا۔ عبداللہ صاحب اور فائزہ بیگم کی آنکھیں بھی نم ہو گئیں۔

☆☆☆

گھر کی کھٹی دوبارن چکی تھی شاید چوکیدار گیت پر نہیں تھا۔ ٹیٹا ہاؤس میں وہ طوفان اچکا تھا جس کے خوف سے رومیہ اپنا گھر چھوڑ کر اسل کے ساتھ بروٹائی جا چکی تھی، جیسے ہی بیہراس کی ماں کو پتا چلی، تب سے پورے گھر کی شامت آئی، ہوئی تھی، شہر زاد نے ملازمہ کو باہر جانے کا اشارہ کیا۔

”وہ اپنے شوہر کے ساتھ ملک چھوڑ کر چلی گئی۔ اور مجھے کسی نے بتایا تک گوارا نہیں کیا۔“

ٹیٹا بیگم کی سرخ ہوئی ہوئی رنگت ان کی دلی اور ذہنی کیفیت کی گواہ تھی، شہر زاد نے پوری ہمت مجتمع کر کے ٹیٹا بیگم کی طرف دیکھا، جن کا چہرہ غصے و ہانت سے تپ اٹھا تھا۔ انہوں نے سائیڈ میز پر رکھا کرسل کا شوپس اٹھا کر پوری قوت سے زمین پر دے مارا، وہ اپنے ہوش و خواص کھورہی تھیں اور ان کا غصہ کسی صورت بھی کم ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا، ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ رومیہ کو گردن سے پکڑ کر اوپس لے آئیں۔

”شری! مجھے تم سے اس بات کی توقع نہیں تھی۔“ انہوں نے کتنی نظروں سے اپنی بیٹی کی طرف دیکھا۔

”نام! اس کا پاکستان سے چلے جانا ہی بہتر تھا۔“ وہ رسان سے بولی۔

”اب تم مجھے بتاؤ گی کہ کیا چیز بہتر ہے اور کیا نہیں؟ میں مان ہوں تم دونوں کی اور تم دونوں نے اتنا بڑا فیصلہ کرنے سے پہلے مجھے دودھ میں سے بھی کی طرح نکال باہر کیا۔ بس یہی ہے میری اوقات۔“ انہوں نے استغماہیا انداز میں ہنوس اچکا نہیں۔ غصے کی زیادتی سے ان کا جسم ہلکا ہلکا کانپ رہا تھا۔

”رومیہ کا کیس ختم ہو چکا تھا مام! اور جس خاندان میں اس کی شادی ہوئی، اس کے ساتھ میرے پریشانیوں پر اسے اختلافات ہیں، وہ لوگ کسی بھی وقت اسے نقصان پہنچا سکتے تھے اور اب تو وہ ارسل کے بچے کی ماں بھی بننے والی تھی، آپ خود دیکھیں، ایسی جویش میں اس کا یہاں رہنا ٹھیک تھا کیا؟“ اس نے بڑی سمجھ داری سے گیندان کے کورٹ میں ڈال دی۔

”تم کچھ بھی بھوشیری! لیکن تم دونوں نے میرے ساتھ زیادتی کی ہے، اور یاد رکھنا رومی اپنے اس فیصلے پر بہت پچھتائے گی، وہ خاندان اس قابل نہیں کہ اس پر اعتبار کیا جائے۔ میں تم لوگوں سے بہتر جانتی ہوں انہیں۔“ وہ اپنے مخصوص رخ بولے میں بولیں جو ان کی شخصیت کا حصہ بن چکا تھا۔

”مام! آپ کو اعتراض رومی کے باہر جانے پر ہے یا اس کی میر حاکم علی کے نواسے ارسل سے شادی پر ہے؟“

شہر زاد کا دھیما لہجہ سنگ روم میں داخل ہوتے میر خاقان کے پیروں کی زنجیر بنا۔ وہ ملازمہ کے ساتھ ڈرائنگ روم کی طرف آ رہے تھے، آج وہ لچا آئی چکا تھا جس سے ٹیٹا بیگم ساری زندگی ڈرتی آئی تھیں۔

خاقان صاحب کی سیٹنگ روم کے پاس سے گزرتے ہوئے نظر شہر زاد اور ٹیٹا بیگم پر پڑی اور وہ ڈرائنگ روم میں جانے کے بجائے ادھر ہی چلے آئے، شہر زاد کی آنکھوں میں آنے والی حیرانی، تعجب اور پھر ناگواری میں بدلی، جبکہ ٹیٹا بیگم تو کچھ لمحوں کے لیے لنگ سی رہ گئیں۔ ظالم وقت ایک بار پھر ان دونوں کو ایک دوسرے کے سامنے لے آیا تھا۔ شہر زاد کے اشارے پر ملازمہ گھبرا کر کمرے سے نکل گئی جبکہ ٹیٹا بیگم کی آنکھوں سے نفرت کے شعلے نکلے۔

میر خاقان وہ شخص تھا جس کے لیے وہ اپنے باپ فاروق سہگل کے سامنے ڈٹ گئی تھیں اور پھر ان کے

ساتھ شادی کی، باپ کی وفات کے بعد ان کی والدہ نے بھرپور ان کا ساتھ دیا لیکن خاقان انہیں بچہ راستے میں چھوڑ گئے، اس کے بعد انہوں نے مڑ کر اس شخص کی طرف دوبارہ نہیں دیکھا جبکہ خاقان صاحب نے بے اختیار ان سے نظریں چرا گئیں۔

”تم؟“ ٹیٹا بیگم نے انگلی اٹھا کر وارننگ کے انداز میں ان کی طرف دیکھا، ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اپنے ناخنوں سے سامنے کھڑے شخص کا چہرہ نوچ لیں۔ ”تمہاری ہمت کیسے ہوئی میرے گھر آنے کی؟“

”میری ہمت کو چھوڑ دو، بتاؤ، رومیہ کی شادی کس نے کی ہے ارسل کے ساتھ؟“ انہوں نے بے ترتیبی سے دھڑکتے دل پر قابو پاتے ہوئے انتہائی سنجیدگی سے پوچھا، جبکہ شہر زاد ابھن بھرے انداز میں ان دونوں کی طرف دیکھ رہی تھی۔

”اچھا؟ تمہیں نام یاد ہے اپنی اولاد کا؟“

ٹیٹا بیگم کے زہر آلود الفاظ پر شہر زاد کی رنگت یک لخت بدلی اور لنگ سی کیفیت کے ساتھ اپنی ماں کے سینے سامنے کھڑے شخص کو دیکھنے لگی جو کسی مجرم کی طرح کٹھنرے میں کھڑا تھا۔

”یہ وہی رومی ہے، جس کی پیدائش پر تم نے مجھے طلاق کا پروانہ تھے میں بھجوا دیا تھا کیونکہ تم بیٹیوں کی پیدائش سے خوف زدہ تھے، تمہیں اس بات کا ڈر تھا کہ بیٹا نہ ہونے کی وجہ سے تمہاری نسل ختم نہ ہو جائے، تمہیں اپنا وارث چاہیے تھا لیکن تم بھول گئے تھے کہ اللہ کی لاجی بے آواز ہے، کئی شادیاں کیں؟ کئی جائز اور ناجائز اولادیں پیدا گئیں، سب کی سب بیٹیاں۔“ ٹیٹا بیگم نے تو گویا ان کے جسم پر چا بک مارا۔

”دیکھو ٹیٹا! غلط بات مت کرو۔“ وہ بد وقت کہہ پائے۔

”فیلڈ جنرل کا آغاز تو تم نے کیا تھا میر خاقان، میں نے تو اپنے باپ کا سارا غرور اور دان روئد کر تمہارے ساتھ شادی کی اور مکمل دیانت داری کے ساتھ اس رشتے کو بھانے کی خوشی کی، لیکن شہر زاد کی پیدائش پر ہمارے رشتے میں کھلی دڑار پڑی، یہ سامنے کھڑی ہے تمہاری وہ بیٹی، جس کے پیدا ہونے پر تم پورے دو ماہ گھر نہیں آئے تھے اور رومیہ کے پیدا ہونے پر تو تمہارے ضبط کا پیمانہ ہی چھلک پڑا تھا۔ بھول گئے کیا؟“

ایک تیز گزرا ہٹ کے ساتھ شہر زاد کے جسم سے ٹرین گزرتی چلی گئی، جبکہ میر خاقان کی خاموشی اس بات کا ثبوت تھی کہ ٹیٹا بیگم کا حرف حرف سچائی پر مبنی ہے۔ وہ غصے سے میر خاقان کی طرف بڑھیں اور انگشت شہادت سے ان کی پیشانی کو چھو کر تھوڑا اونچا کیا۔

”اب نظریں جھکائے کیوں کھڑے ہو؟ ہمت ہے تو آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرو اور تسلیم کرو اپنی اولاد کے سامنے کہ تم ایک انتہائی بزدل، کم ظرف اور پست ہمت انسان تھے۔ تم نے شخص اولاد زینہ کے لیے مجھ سے محبت کا ڈھونگ رچایا اور کئی عورتوں کو برباد کیا، اب بتاؤ کہاں سے تمہارا ولی وارث؟ کس کے نام کے ساتھ چلے گی تمہاری اگلی نسل؟“ ٹیٹا بیگم کا زہر آلود لہجہ، میر خاقان کو چھری کی مانند لگ رہا تھا اور شہر زاد لنگ سی کیفیت میں ان دونوں کو دیکھنے چلی جا رہی تھی۔

”اور مان لو اس بات کو، تم نے اپنے بھانجے کے ذریعے گھٹیا سازش کی۔ اس نے میری بیٹی کو غلا کر نکاح پڑھوایا اور اسے لے کر راتوں رات ملک چھوڑ کر بھاگ گیا، تمہارا بھانجا بھی تمہاری طرح ہی بزدل۔ نکلا۔“

انہوں نے ہاتھ جھاڑ کر طنز کیا۔

اس الزام پر خاقان صاحب نے تڑپ کر اپنے سامنے کھڑی اس عورت کی طرف دیکھا، جس سے انہوں نے حقیقتاً محبت کی تھی لیکن میر حاکم علی کے خوف سے اس کو چھوڑ دیا تھا کیونکہ دوسری بیٹی کی پیدائش پر حاکم صاحب نے صاف کہہ دیا تھا کہ ان کی دوسری بیوی اور اولاد کی اس گھر میں کوئی گنجائش نہیں ملتی اور اس کے بعد تیسری

شادی انہوں نے حاکم صاحب کی رضا مندی سے عذرت بیگم سے کی جن سے ان کی کوئی اولاد نہیں ہوئی اور اس کے بعد ان کے مختلف اسکینڈلز سامنے آتے رہے لیکن شادی کرنے کی غلطی دوبارہ انہوں نے زندگی میں کبھی نہیں کی۔

”میں اپنے سارے گناہ اور ساری غلطیاں مانتا ہوں تاہم! لیکن تم نے جو میری اولاد کو میرے ہی خلاف کورٹ میں لاکھڑا کیا، اس سے گھٹیا کام تم نہیں کر سکتی تھیں۔“ اب بولنے کی باری خاقان صاحب کی تھی۔ اس الزام پر بیٹا بیگم کا چہرہ سرخ ہوا۔

”میں نے بابا جان کی ناراضی کے باوجود تمہیں اپنا کیا، کیونکہ میں تم سے محبت کرتا تھا اور میں نے تمہارے تحفظ کی خاطر کبھی انہیں کانوں کان خبر نہیں ہونے دی کہ میری دوسری بیوی کون ہے اور کس خاندان سے اس کا تعلق ہے، وہ صرف اور صرف تمہارا نام جانتے تھے یا میری بیٹیوں کی پیدائش کی اطلاع، وہ بھی میں نے انہیں خود دی تھی۔“ وہ غصے میں سانس لیے بغیر بولتے چلے گئے۔

”میرا اللہ گواہ ہے کہ میں نے تمہارے لیے اسٹیڈی لینے کی کوشش کی، میں مانتا ہوں، میں بزدل تھا اور اپنے والد کے سامنے زیادہ دیر تک نہیں ٹھہر سکا اور مجھے مجبوراً تمہیں ڈائیوڑس دینا پڑی کیونکہ مجھے ڈر تھا کہ وہ تمہاری کھوج لگا کر تم تک پہنچ نہ جائیں اور تمہیں یا میری اولاد کو کوئی نقصان نہ پہنچا دیں۔ تم نے ڈائیوڑس، پیپر ز پر جو جو شرائط لکھوائیں۔ میں نے مانیں۔“ انہوں نے اپنے کٹ کی جیب سے ایک خاکی رنگ کا بوسیدہ لفافہ ان کے سامنے پھینکا۔

”تم نے مجھ سے لکھوایا کہ میری اولاد کا مستقبل میں مجھ سے کوئی لینا دینا نہیں ہوگا، میں نے دل پر جبر کر کے دوبارہ کبھی مڑ کر نہیں دیکھا۔“ انہوں نے جذباتی انداز میں بیٹا بیگم کی طرف دیکھا، جن کی آنکھوں میں ان کے لیے شفر کے سوا کچھ نہیں تھا۔

”تم نے اپنی بیٹیوں سے کہا کہ تمہارا باپ مر چکا ہے اور میں نے جیتے جی اس بات کو تسلیم کیا، تم نے مجھ سے وعدہ لیا کہ میرا خاندان تمہارے یا بچیوں کے خلاف کچھ ایسا دیا نہیں کرے گا تو میں نے اس بات کو بھی نبھایا، آئے دن تمہارے اسکینڈلز اخبارات کا حصہ بنتے تھے لیکن میں اس پر بھی چپ رہا کہ تمہاری ذاتی زندگی ہے، تم کچھ بھی کرنے کا حق رکھتی ہو لیکن۔“ وہ سانس لینے کو رکے۔

”تم نے میری ہی بیٹی کو میرے ہی خلاف کورٹ میں لاکھڑا کیا، میں جب تک اس حقیقت سے باخبر نہیں تھا میں چپ رہا، لیکن اب بات بہت بڑھ چکی ہے بیٹا بیگم! تمہاری نفرت، تمہاری بے رخی میرے لیے ہوئی چاہے، مجرم میں ہوں، مجھ سے بدلہ لو، لیکن میں تمہیں اپنے پورے خاندان کی عزت سے کھیلنے کی اجازت نہیں دوں گا۔“ ان کا ناراضی میں ڈوبا لہجہ اب پتھر پلا ہوا اور اس سے زیادہ چپ رہنا شہزاد کے لیے ممکن نہیں تھا۔

”ایکسکوز می۔“ وہ پر اعتماد انداز میں ان کے سامنے آن کھڑی ہوئی۔

”میرے پروفیشن اور میرے معاملات سے میری ماں کا کوئی لینا دینا نہیں، آپ اس حوالے سے ان پر مزید کسی قسم کی الزام تراشی نہیں کر سکتے، یہ تو وہ عورت ہے جس نے ہمیشہ مجھے اس خاندان سے دور رہنے کا مشورہ دیا، لیکن اس دوری کے پیچھے کیا راز کا فرما تھا، وہ آج کل کر سامنے آ گیا، آپ کو جو مسئلہ ہے مجھ سے بات کریں۔“ شہزاد نے ہنسنے پر قابو رکھا۔

خاقان صاحب نے چونک کر اس کی طرف دیکھا، وہ میر حاکم کی طرح دو ٹوک انداز میں گفتگو کرنے کی قائل تھی۔ تاہم تازہ ملنے والے اس جذباتی دھچکے سے باہر نکل کر اب وہ ایسے کھڑی تھی جیسے ایک عام سی بات ہو۔ اس کی آنکھوں میں موجود بغاوت، سختی اور ہٹ دھرمی نے میر خاقان کے ہونٹوں پر خاموشی کی مہر ثبت کر دی،

”چند لمحے جا چنتی اور تولتی ٹکا ہوں سے اس کی طرف دیکھتے رہے۔“

”تم کیا چاہتی ہو؟“

”وکالت ہیرا پروفیشن ہے اور میرا کسی سے کوئی ذاتی عناد یا لینا دینا نہیں، میں اپنی پروفیشنل لائف کے فیصلے کسی کی پسند یا ناپسند پر نہیں کرتی، چاہے وہ میری سگی ماں ہی کیوں نہ ہو۔“ وہ ڈھکے چھپے الفاظ میں بہت کچھ کہہ گئی۔

”اس کا مطلب ہے کہ تم بابا جان کے خلاف کیس لڑو گی؟“ وہ ناراض ہوئے۔

”میری ماں بھی اگر کوئی غلط کام کرے گی تو میں اسے کبھی کوئی فیور نہیں دوں گی۔ ویسے بھی آپ کے خاندان سے یا آپ سے میرا کوئی تعلق نہیں اور بہتر ہوگا کہ آپ بھی دوبارہ اس سلسلے میں ہم سے رابطہ کرنے کی کوشش مت کریں۔“ اس نے دو ٹوک انداز میں اپنے باپ کی غلط فہمی کو دور کیا۔

خاقان صاحب کو دھچکا لگا، وہ صدمے کی کسی کیفیت سے اسے دیکھتے چلے گئے، وہ ان کی سب اولادوں میں سب سے زیادہ نڈر اور بے باک تھی، اور وہ اپنی اولاد کو ایسا ہی دیکھنا چاہتے تھے لیکن اتنا یہ اور طوفانی میں سے کوئی بھی ان کی امیدوں پر پورا نہیں اتر پائی اور جس نے ان کے خواب کو پورا کیا تھا۔ وہی ان کے صبر کا امتحان بن کر ان کے سامنے بھی ناوراضی میں کیے جانے والے غلط فیصلوں میں سے ایک فیصلہ ان کے پورے خاندان کے لیے پھندا بننے والا تھا۔

☆☆☆

فائرہ بیگم کی آمد کی اطلاع ملتے ہی منابل فوراً ہاسٹل سے گھر پہنچ گئی۔

جیسے ہی اسے اس حقیقت کا ادراک ہوا تو وہ بھی کئی لمحے تنگ کیفیت کے ساتھ اپنے سامنے کھڑے ہادی کو دیکھتی چلی گئی، جو اس سے نظریں چرائے کھڑکی کے پاس کھڑا تھا اور اس کی نظر آسمان پر موجود چاند کی طرف تھی، جو در سے کسی گھڑیال کی مانند نظر آ رہا تھا۔

”ایسے کیوں دیکھ رہی ہو منابل۔“ وہ زبردستی مسکرایا۔

”میں حیران ہوں، یہ سب جاننے کے بعد تم نے اپنے اصل والدین کو تلاش کرنے کی کوشش کیوں نہیں کی۔“ وہ جھجک کر بولی۔

”ان والدین کو جو اپنے معصوم بچے کو زمانے کے رحم و کرم پر چھوڑ کر چلے گئے تھے۔“ وہ تنہا ہوا۔

”چاہے تو چلے آ کر ایسی گون سی قیامت ٹوٹ گئی تھی ان پر، جو تمہیں اس رات اکیلا چھوڑ کر چلے گئے۔؟ وہ تمہاری ماں تھی یا تمہارا باپ تھا، یا کوئی اور فرد؟“ منابل کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ ایک منٹ میں اس کے اصل والدین کا کھوج لگا لے۔

”جج پوجھو تو میرا دل بھی چاہا ہی نہیں، مہی، پاپا نے زندگی میں مجھے وہ سب کچھ دیا جو شاید میرے اصل والدین بھی مجھے نہیں دے سکتے تھے اور میں تو اس بات سے بھی خوف زدہ تھا کہ پتا نہیں میری سچائی کیا ہوگی، اور پتا نہیں وہ سب جان کر میں کسی سے نظر ملانے کے قابل رہوں گا بھی کہ نہیں۔“ وہ افسردگی سے بولا ہوا فائرہ بیگم کو انتہائی معصوم بچہ لگا، وہ ان دونوں کو ڈرنے کے لیے بلانے آئی تھیں۔

”مجھے لگتا ہے تمہارے پرنس کا تعلق کسی ہائی فائی خاندان سے تھا، کیونکہ تمہارا لباس اور تمہارے وجود سے لپٹی ہوئی برائڈ ڈیزیز جی جیج کرتا رہی تھیں کہ اس بچے کو یہاں پھینکنے کے پیچھے غربت یا ایسی کوئی کہانی نہیں۔“ فائرہ بیگم کی بات پر وہ چونکا۔

”آپ کو کس نے بتایا؟“ وہ بے تابی سے گویا ہوا۔

”میری دوست ڈاکٹر باب کے شوہر نے مجھے بتایا تھا اور انہیں شک ہے کہ تمہاری ماں نے شاید خودکشی کر لی تھی کیونکہ اس سے اگلے دن ایک عورت کی کٹی پٹھی لاوارث لاش بھی کچھ میل کے فاصلے پر ملی تھی۔“ اس اطلاع پر ہادی بے چین ہوا۔

”ہادی، تمہیں انکل معزز سے ضرور ملنا چاہیے کیونکہ ان کے پاس ایسا کچھ نہ کچھ ضرور ہوگا جو تمہیں اپنی اصل شناخت تک پہنچنے میں مدد دے سکتا ہے۔“ منائل نے اسے اسکا یا اور یہ بات فائزہ بیگم کو سخت بُری لگی۔

”تم کیا اسے الٹی سپردی پٹیاں پڑھا رہی ہو، اس کے بغیر نہیں پچھا بھی اور بھائی جان ہی ہیں، اسے کیا ضرورت پڑی ہے، خواہ مخواہ کی درد مری پالنے کی اور ہادی تم ایسا ویسا کچھ نہیں کرو گے۔“

فائزہ بیگم کی جھاڑن کر منائل ایک دم چپ کر کے بیٹھ گئی، جبکہ ہادی کا تو ویسے ہی دل دو ماغ ماؤف ہو چکا تھا۔

☆☆☆

پچھلے چند رہنمائی سے وہ اس کے پاس بالکل خاموش بیٹھی تھی۔

میجر حمزہ نے تاسف بھری نگاہوں سے شہر زاد کی طرف دیکھا جو اضطراری انداز میں ہاتھ میں پکڑا کچل بھی کھول اور بھی بند کر رہی تھی۔ وہ ذہنی طور پر یہاں موجود ہونے کے باوجود کہیں اور تھی اور آج حمزہ کے بے پناہ اصرار کے بعد یہاں آئی تھی، وہ فون پر اسے میر خاقان والا سارا قصہ بتا چکی تھی۔

”کیا سوچ رہی ہو شہر زاد!“ حمزہ نے نرمی سے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا تو وہ زبردستی مسکرائی۔

”تم جب بھی زبردستی مسکرائی ہو تو عجیب لگتی ہو۔ کسی بھی معاملے میں جبر تم پر چلتا نہیں ہے، اس لیے جو کام بھی کیا کرو، دل سے کیا کرو۔“

اس کی بات پر شہر زاد نے بے اختیار نظریں جرائیں۔ اس کی آنکھوں میں موجود چمکتے آنسو حمزہ کے لیے امتحان بننے لگے۔ وہ اس کے سامنے شاید ایک آدھ بار ہی جذباتی ہو کر روئی تھی کیونکہ اسے رونے بالکل اچھا نہیں لگتا تھا۔

”سوچ رہی ہوں حمزہ! زندگی کی بعض حقیقتیں کتنی تلخ ہوتی ہیں، ان پر جتنی دیر پردہ پڑا رہے تو اچھا ہوتا ہے۔ کاش میرے باپ کا تعلق معاشی طور پر کسی کمزور خاندان سے ہوتا، وہ کوئی بھی ہوتا لیکن میرا حاکم کی جگہ سے نہ ہوتا۔“

اس نے پہلی بار کسی کے سامنے اس دکھ کا اظہار کیا، درد نکل خاقان صاحب کے جانے کے بعد ٹیٹا بیگم خاصی ڈسٹرب ہوئی تھیں اور انہوں نے شہر زاد کو اپنے ماضی کے بارے میں بھی بتانے کی کوشش کی تھی، لیکن اس نے انہیں صاف منع کر دیا۔

”اب پتا چلا، میں اور تمہاری مام ہمیشہ اس خاندان سے فاصلے پر رہنے کا مشورہ کیوں دیتے تھے۔“ وہ روانی میں اس کے سامنے بول تو گیا لیکن شہر زاد کے تارک یک پڑتے چہرے کو دیکھ کر اسے اپنی غلطی کا فوراً احساس ہو گیا۔

”کیا کہا تم نے؟“ شہر زاد کو لگا جیسے اس کی ساتوں نے دھوکا کھایا ہے۔ ”کیا تم اس حقیقت کو جانتے تھے کہ اس خاندان کے ساتھ میرا کیا تعلق ہے؟“

حمزہ کے اثبات میں سر ہلانے پر شہر زاد کے ہاتھ سے کچھ چھوٹے چھوٹے بچا، بے یقینی کی کیفیت اب صدمے میں ڈھل رہی تھی۔

”کب سے؟“ شہر زاد کو اپنی آواز کی گونج میں سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔

”جانتا تو بہت عرصے سے تھا اور دل ہی دل میں اس بات سے خوف زدہ بھی تھا کہ کہیں حاکم صاحب تمہاری حقیقت نہ جان لیں، اس لیے میں نے تمہیں مصلحتاً ان کے خاندان کے خلاف کچھ بھی کرنے سے ہمیشہ منع کیا لیکن پھر تمہاری ضد کے آگے مجبور ہو جانا تھا۔“

وہ بچیداری سے کہہ رہا تھا۔

”لیکن مجھے اس بات کا قطعاً علم نہیں تھا کہ ارسل بھی اسی خاندان کا فرد ہے اور جب ارسل کی حقیقت کھلی تو اس دن مجھے احساس ہوا کہ بے رحم تقدیر کسی دن تمہیں بھی اس خاندان کے سامنے لے آئے گی، جو کسی نہ کسی حوالے سے تمہاری شناخت کا ایک حصہ ہے۔“

”میں نہیں مانتی اس شناخت کو۔“ اس نے تلخ انداز میں اس کی بات مسترد کی۔

”میرے آئی ڈی کارڈ میں گارجین کے آگے میرے نانا فاروق سہگل کا نام تحریر ہے اور میں نے زندگی میں کبھی یہ جاننے کی کوشش بھی نہیں کی کہ میرا باپ کون تھا یا اس کا تعلق کس خاندان سے تھا، اور آج جب یہ معاملہ گھیرا گیا ہے تو اب مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“ وہ بے زاری سے گویا ہوئی۔

”اگر فرق نہیں پڑتا تو پھر اتنی ڈسٹرب کیوں ہو، اس چیز کو اپنے ذہن سے نکال دو۔“ وہ نرمی سے اسے سمجھانے کی کوشش کرنے لگا شہر زاد کی آنکھیں نمکین پانیوں سے بھر گئیں۔ حمزہ کو دل دکھا کا احساس ہوا۔

”میرے اختیار میں ہوتا تو سب سے پہلے اس خاندان کا خون اپنی رگوں سے نکالتی، مجھے ساری زندگی اس بات کا انوس رہے گا کہ میرا باپ ایک کرپٹ اور انسانیت سے عاری خاندان کا فرد ہے۔“ اس کی آواز بھرا گئی۔

”آئی ایم سوری شہر زاد! میرا مقصد ہرگز تمہیں ہرٹ کرنا نہیں تھا۔“

اس نے محبت سے اس کے میز پر رکھے ہاتھوں کو تھامنے کی کوشش کی، لیکن شہر زاد نے ایک جھٹکے سے اس سے اپنا ہاتھ چمڑا لیا، وہ میز پر رکھا اپنا کچل اٹھا کر کھڑی ہوئی۔

”تم مجھ سے کیوں خفا ہو رہی ہو؟“ وہ بھی پریشانی سے کہہ اٹھا۔

”تو اور کس سے خفا ہوں؟ مام سے؟ جو کل سے اپنا غم غلط کرنے کے لیے سیٹی اٹھانے کے ساتھ مری گئی ہوئی ہیں یا رومیہ سے، جسے میں نے خود یہاں سے بھجوا دیا ہے تاکہ کوئی ایک تو سکون کی زندگی گزار سکے۔“ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی تلخ ہوئی۔

”تم اس بات کو ضرورت سے زیادہ اپنے حواسوں پر سوار کر رہی ہو؟“

”تم یہ کیوں سمجھتے ہو حمزہ! میں لوہے کی بنی ہوئی ہوں اور مجھے کسی دکھ یا تکلیف کا احساس نہیں ہوتا، تم مجھے ایک عام لڑکی سمجھ کر ری ایکٹ کرنے کا مار جن کیوں نہیں دیتے ہو۔“ وہ اس کے ساتھ تیز چلتے ہوئے دھکی انداز میں گھر کر رہی تھی۔

”اس لیے کہ تم ایک عام لڑکی نہیں ہو۔ تم مجھ سے زیادہ پریکٹیکل اور زندگی کے بارے میں پوٹینو اپروچ رکھتی ہو، اس لیے میں تم سے ان عام چیزوں کی توقع نہیں رکھتا۔“ حمزہ نے جذباتی انداز میں اس کا ہاتھ پکڑا تو شہر زاد نے ہچکچاہٹ سے اپنا ہاتھ چمڑا لیا کی کوشش کی۔

”کیوں بار بار ہاتھ پکڑ لیتے ہو میرا؟“ وہ بے زاری سے گویا ہوئی۔

”اس لیے کہ مجھے ڈر ہے کہ کہیں تم سچ سچ ہاتھ چمڑا کر نہ چلی جاؤ۔“ اس نے مذاق میں بات کو اڑانے کی کوشش کی۔

”جانے والوں کو کون روک سکا ہے اور دیکھ لیتا کسی دن خاموشی سے اس سارے قصبے سے نکل جاؤں گی۔“ اس کی زبان پھسل گئی۔

”اور میرا کیا ہوگا؟“ حمزہ نے اس کا موڈ بہتر کرنے کے لیے شرارت سے پوچھا۔

”تمہاری ویسے ہی پوسٹنگ آنے والی ہے، کہیں دور پہاڑوں پر چلے جانا، اور وہاں بیٹھ کر میری جدائی میں لمبی لمبی نظمیں لکھنا، جسے پڑھ کر لوگوں کو اشتیاق ہو کہ یہ شہر زادوں کو بھی کہاں سے آئی اور کس دیس چلی گئی۔“ اس کے انداز میں کچھ تھا، حمزہ کو لگا جیسے کسی نے اس کا دل بھی میں لے کر مسل دیا ہو۔

”تمہاری بکواس ختم ہو گئی تو ہم چلیں۔“ وہ جھجھکا ہوا۔

”اتنی ہی بات پڑ گئی؟“ فضا میں شہر زاد کا اداسی میں لپٹا ہوا قہقہہ گونجا۔

”محبت کو صرف ایک ہی چیز توڑ داتی ہے اور وہ ہے جدائی، تمہیں پتا ہے کسی محبت کرنے والے کی زندگی جنم بنانی ہو تو اسے اس شخص سے دور کر دو، جسے وہ زندگی میں سب سے زیادہ چاہتا ہو۔“ حمزہ نے اس کے لیے گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے تنبیہ کی سے کہا۔

”کیا تمہیں بھی اب یہ پتا نا پڑے گا کہ میں مذاق کر رہی تھی۔“ اس نے گاڑی میں بیٹھنے ہی اپنے سن گلاسز آنکھوں پر لگائے۔

”دوبارہ مذاق میں بھی ایسی بات مت کرنا۔“ حمزہ نے گاڑی اشارت کرتے ہوئے اسے التجائیہ نظروں سے دیکھا۔

”شکر ہے زندگی میں کوئی ایک بندہ مجھ سے بے غرض محبت کرتا ہے۔“ وہ اسے مطمئن کرنے کے لیے ہلکے پھلکے انداز میں مسکراتی تو حمزہ تھوڑا پرسکون ہوا۔ ورنہ اس کی کچھ چیزیں اسے بار بار چونکا رہی تھیں وہ آج پہلی بار اس کے ساتھ ہوتے ہوئے بھی اس کے ساتھ نہیں تھی۔

☆☆☆

”تم میرا حکم کے خلاف کیس واپس نہیں لے سکتیں؟“ اگلے دن ناشتے کی میز پر ٹینا بیگم نے اس کی طرف دیکھتے ہی پریشان انداز میں کہا تو اس نے جا چٹتی ہوئی لگا ہوں سے ان کا چہرہ مٹولا، جہاں نظر اور پریشانی کے سارے ہی رنگ نمایاں تھے۔

”آپ کو میرا خاقان نے کوئی دھمکی دی ہے یا ان کے والد صاحب نے کسی کے ذریعے پیغام رسانی کی ہے۔“ وہ سامنے رکھا فریش اور نچ جوس، جگ سے گلاس میں اٹھ پلتے ہوئے انتہائی سرسری انداز میں بولی، جیسے اس چیز سے اسے کوئی فرق نہ پڑتا ہو۔ ویسے بھی کل ساری رات اس نے اسی کس پر کام کیا تھا اور سچ میں ایک دو بار اس نے مزہ عالیہ قریبی سے بھی رابطہ کرنے کی کوشش کی لیکن ان کا نمبر مسلسل آف چار ہوا تھا۔

”مجھے ان میں سے کسی نے بھی ایسا کرنے کو نہیں کہا۔“ وہ بے ذارگی سے گویا ہوئیں۔

”تو پھر ٹینشن کس بات کی ہے؟“ شہر زاد کو ان کی پریشانی سمجھ میں نہیں آئی۔

”دیکھو شیر، میرا تعلق بھی کسی عام گھرانے سے نہیں تھا اور اس کے باوجود میں نے اس خاندان سے بڑا لینے کی کوشش نہیں کی۔ تمہارے نانا نے میری اس شادی کی سب سے زیادہ مخالفت کی تھی کیونکہ وہ ایک جہاں دیدہ انسان تھے اور خاقان کی کم زور شخصیت کو ایک ہی ملاقات میں سمجھ گئے تھے۔“ انہوں نے بات شروع کرنے کے لیے ایک لمبی تنہید باندھنے کی کوشش کی۔

”مام پلیز کم تو ڈالو پائونٹ۔“ وہ اس تفصیل سے اکٹا کر بولی۔ ”آپ کو جو بات کرنی ہے، صاف صاف کریں، مجھے ماضی کے ان قصوں سے کوئی دلچسپی نہیں، جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔ میں ماضی میں نہیں حال میں جینے کی قائل ہوں۔“

”صاف صاف بات یہ ہے کہ تم اس خاندان سے دور رہو۔“ انہوں نے بھی صاف گوئی کی انتہا کر دی۔

”مام! میں کون سا بازو پھیلائے ان کے سامنے کھڑی ہوں اور آپ کیوں اتنی خوف زدہ ہو رہی ہیں۔“

اس کے لہجے میں طعنے کی آمیزش شامل ہوئی۔

”میں اس لیے خوف زدہ ہوں کیونکہ میں اس خاندان کی حرام زدگیوں کے قصبے جانتی ہوں۔“ وہ جھنجھلا کر گویا ہوئیں۔

”پلیز مام، اتنی رف لینکو کچ تو پوز نہ کریں۔“ اس نے ہاتھ میں پکڑا گلاس ہلکی سی برہمی کے ساتھ میز پر بچھا۔

”کاش میرے بس میں ہوتا تو یہ سارا زہرا ان کے سامنے خاک رکھتی، تم نہیں جانتی ہو، خاقان کے باپ نے اپنی ضد اور ہٹ دھرمی میں اپنے سب سے چھوٹے بیٹے کا پورا گھر تباہ کر دیا تھا۔“ وہ روانی میں بولیں تو شہر زاد کے ہونٹوں پر استہزائیہ مسکراہٹ دوڑی۔

”اسی بیٹے کے خاندان کو ہی تو انصاف دلانا ہے، لیکن آپ کیسے جانتی ہیں ان سب کو؟“

”اسی بات سے خوف زدہ ہو کر تو تمہارے باپ نے مجھے چھوڑا تھا، اسے لگا تھا کہ میرا حکم میرے ساتھ بھی کچھ غلط کر دے گا۔“ ان کا لہجہ تھوڑا دھیمہ ہوا۔

”پھر تو انہوں نے آپ کو چھوڑ کر بہت بڑا احسان کیا تھا آپ پر۔“ وہ شہر زاد کے طنز کو سمجھ نہیں پائیں۔

”ہاں اگر سوچا جائے تو یہ واقعی اس کا بہت بڑا احسان تھا، اس نے ساری زندگی اپنے فرعون باپ کے سامنے کبھی اس بات کی بھاپ نہیں لگائی کہ اس کی دوسری بیوی کون تھی اور اس کا تعلق کس خاندان سے تھا، وہ صرف میرا نام اور بچپن کے بارے میں جانتے تھے اور ویسے بھی میں ڈائریس کے بعد لاہور سے اسلام آباد شفٹ ہو گئی تھی۔“ ٹینا بیگم نے اس کی معلومات میں اضافہ کیا۔

”اب آپ مجھ سے کیا چاہتی ہیں؟“ اس نے دو ٹوک انداز میں پوچھا۔

”تم اس کیس سے دست بردار ہو جاؤ اور میری بات مانو تو واپس لندن چلی جاؤ، اب تو میں شکر ادا کرتی ہوں کہ رومی یہاں سے چلی گئی، ورنہ اس نے علیحدہ اس بات پر طوفان کھڑا کر دیتا تھا۔“ ان کے مشورے پر شہر زاد ہلکا سا ہنسی۔

”آپ کے کہنے کا مقصد یہ ہے، میں ان لوگوں سے ڈر کر اپنا ملک، اپنا گھر اور اپنی ماں کو چھوڑ کر یہاں سے ہماگ جاؤں؟ آئی ایم سوری مام! میری رگوں میں ایک بزدل مرد کا خون سہی لیکن میری پرورش ایک بہادر عورت نے کی ہے۔ جس نے نہ صرف زندگی کے ہر محاذ پر اکیلے مقابلہ کیا بلکہ بزنس اور فیشن کی دنیا میں اپنی ایک الگ پہچان بھی بنائی۔“

”شیر! تم بات کو سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کر رہی ہو، مجھے سبھی نے صاف صاف کہا ہے کہ اگر تم یہ کیس واپس نہیں لو گئی تو وہ لوگ تمہیں نقصان بھی پہنچا سکتے ہیں۔“ ٹینا بیگم کی آواز جھنجھلاہٹ سے بلند ہوئی۔

”مام! جو کہتے ہیں، وہ بد سے نہیں، ڈونٹ دوری ایسا کچھ نہیں ہوگا، میں آؤں گے لیے لیکن رہی ہوں، شام میں آکر بات ہوگی۔“ وہ ہاتھ میں پکڑا نوٹس پلیٹ میں رکھ کر کھڑی ہوئی اور اپنا سیل فون اٹھا کر ڈائنگ روم سے نکل گئی۔ ٹینا بیگم کے ماتھے کی شکن مزید گہری ہوئی۔ وہ جانتی تھیں کہ ضد اور ہٹ دھرمی میں وہ اپنے باپ کے خاندان پر ہی تھیں ہے اور ڈرنا تو گویا اس نے سیکھا ہی نہیں تھا۔ اس کی وہ تمام عادتیں جو انہیں کسی دور میں بہت بھائی تھیں، اب وہی ان کے لیے پریشانی کا باعث بن رہی تھیں۔

☆☆☆

ایکشن کے نتائج نے میراؤں میں تو گویا بھونچال ہی برپا کر دیا۔

مونیکا کیس کو حاکم صاحب کے مخالفین نے کھل کر ان کے خلاف استعمال کیا، اور وہ مونیکا کے بھائی دلاور کو اپنے سیاسی جلسوں میں لانے میں کامیاب ہو گئے، جس کی جذباتی تقریروں نے ماضی کے کئی گزے مردے اکھاڑ کر سامنے رکھ دیے تھے۔ شہزاد اپنے تعلقات کے استعمال سے میر حاکم کے خلاف ایف آئی آر کو اسے میں کامیاب ہو گئی تھی اور پورا گھر انداس کیس کی وجہ سے شدید تناؤ کا شکار تھا۔

ارسل اپنا گھر چھوڑ کر چاچا تھا اور میر خاقان نے شہزاد کے حوالے سے اپنی زبان سے ایک لفظ بھی نہیں نکالا تھا۔ وہ آج بھی اندر ہی اندر اپنے والد سے اتنے ہی خائف تھے لیکن اب معاملہ ان کی اولاد کا تھا اور اولاد بھی ایسی جو جھگڑنے اور پیچھے ہٹنے کی قائل نہ تھی۔

ارسل کے گھر چھوڑ کر جانے کے بعد ندرت بیگم بیمار ہو گئی تھیں اور نمبر ۷ کو بھی چپ سی لگ گئی تھی۔ اگرچہ ارسل نے بروٹائی پختہ ہی کال کر کے اس کی رومیہ سے بھی بات کروائی تھی، لیکن دونوں کو کسی بل بھی سکون نہیں آ رہا تھا۔ ان دونوں حاکم صاحب چونکہ اپنے معاملات میں الجھے ہوئے تھے۔ اس لیے ارسل اور اس کی شادی کا قصہ وہی طور پر ان کے دماغ سے محو ہو چکا تھا۔

میر حاکم اپنے شہر کی آبائی سیٹ ملتان سے اور خاقان صاحب اسلام آباد سے نئی طرح ہار گئے تھے۔ بہت سالوں بعد اس خاندان کو سیاست کے میدان میں اتنی نئی شکست کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ حاکم صاحب کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ مونیکا کے بھائی کو سر عام گولی سے اڑا دیں، لیکن دلاور کے پاس سب سے بڑا ہتھیار امریکی پاسپورٹ اور اس کی ایکسیسی کی سپورٹ تھی۔ دوسری طرف کریجین کیوٹی اور میر جلی کے مخالفین نے بھی کھل کر دلاور کا ساتھ دینے کا اعلان کر دیا تھا۔ لی وی کے سیاسی ٹاک شو کا یہ آج کل پسندیدہ موضوع تھا، جہاں میر جلی کی سیاسی زندگی کے زوال اور مونیکا کیس میں تیزی سے ہونے والی پیش رفت کو بڑے بے باک انداز میں ڈسکس کیا جا رہا تھا۔ یہ باتیں سن کر حاکم صاحب کو ڈپریشن ہونا ایک فطری عمل تھا۔

میر ہاؤس کے کینٹون کو ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے حاکم علی کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت بالکل مفلوج ہو کر رہ گئی ہے۔ وہ گھر کی خواتین کا لحاظ کیے بغیر سر عام اپنے مخالفین کو گالیاں دینے لگتے اور لی وی کے کئی ریموٹ کنٹرول وہ غصے میں توڑ پھینکے تھے لیکن اس کے باوجود وہ باقاعدگی سے نیوز چینل دیکھنے سے باز نہیں آتے تھے، ملک کا سیاسی منظر نامہ تبدیل ہو چکا تھا۔ الیکشن کی گہما گہمی کے بعد وزارتوں کی بھاگ دوڑ شروع ہو چکی تھی۔ اپنے سیاسی کیریئر میں پہلی بار میر خاندان اس دوڑ سے باہر ہوا تھا۔

اس دن تو حاکم صاحب کی برداشت کی حد بالکل ہی ختم ہو گئی، جب انہوں نے ایک نیوز ٹیلیشن میں اپنے مرحوم باپ مراد علی شاہ کے مزار پر ہونے والی لائیو کوریج میں اپنے سب سے چھوٹے بیٹے کو دیکھ لیا، جو وہاں پر سائیں بابا کے نام سے مشہور تھا اور لوگ دور دور سے اس کے پاس دعا کے لیے آتے تھے۔ وہ کئی کھٹے خاموشی سے ٹھنڈوں میں سردے بٹھا رہا تھا اور کبھی کبھی اٹھ کر عالم وجد میں جھومنے لگا۔

مونیکا کیس کی قائل کھلنے کے بعد ایک گھاگ صحافی مونیکا کے شوہر ڈاکٹر گلشن تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو چکا تھا اور اب ان کا چینل، ناظرین کے سامنے پیچ پیچ کر سب سے پہلے اس خبر کو بریک کرنے کا اعزاز اپنے نام کر رہا تھا۔

”لوگ پاگل تو نہیں ہو گئے، بنا کرواؤ، یہ کون لوکا بٹھا ہے۔“ حاکم صاحب آگ بگول ہوئے۔

اسکرین پر گئے میں رنگ برنگی مالا میں پہنے پچھنے ہوئے چوٹے میں ملبوس سائیں بابا سے صحافی ادب پٹانگ سوالات کیے جا رہا تھا اور سائیں بابا کے چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ وہ ان سوالات کے مفہوم کو سمجھنے سے قاصر تھے، ان کی آنکھوں کی روشنیاں تو بہت سال پہلے بجھ چکی تھیں، جب انہوں نے اخبارات میں

اپنی بیوی کی کئی پٹنی لاش دیکھی تھی اور ان کے بیٹے کی لاش کہیں سے نہیں ملی تھی اور قریبی لوگوں کا خیال تھا کہ اسے کوئی جانور اٹھا کر قریبی جنگل میں نہ لے گیا ہو، ان صدقات نے ان کا دماغ الٹا کر رکھ دیا تھا، وہ اس کی اسے کاڑھا لکھا شخص اپنے ہوش و حواس سے بیگانہ ہو کر ملتان کی گلیوں میں اپنے بیٹے کو تلاش کرتا۔ تنگ آ کر ان کے بھائی انہیں مری لے آئے جہاں وہ اپنے دادا کے مزار کو اپنا مستقل ٹھکانا بنا چکا تھا۔

لی وی کیمرے کی لائٹ اور لوگوں کے ہجوم سے گھبرا کر سائیں بابا نے ہاتھ میں پکڑا ہتھکڑا دلاؤنڈاز میں پر زور سے مارا اور اللہ ہو کا نعرہ لگا کر گول گول چکروں کی صورت میں جھومنے لگے اور جرنلسٹ بوکھلا کر اپنے سارے سوالات ہی بھول گیا۔

☆☆☆

در شہوار کافی گالگ ہاتھ میں تھا اسے اپنے بیڑوم کی کھڑکی کے پاس کھڑی تھی۔

اس کے کمرے کی کھڑکی کے عین سامنے ہادی کا کمرہ تھا اور درمیان میں صرف چند فٹ کا فاصلہ تھا اس لیے دونوں گھر بہت صاف دکھائی دیتے تھے اور اس وقت سامنے کا منظر در شہوار کو بے چین کر رہا تھا۔

راکنگ جیٹر پر موجود ہادی کے چہرے پر گہری اداسی کی چھاپ تھی اور اس کے ہاتھ میں موجود جہاں سگریٹ پورے کمرے کو دھواں دھواں کر چکا تھا۔ ایک کے بعد ایک سگریٹ سلگائے وہ کسی ذہنی پڑمردگی کا شکار لگ رہا تھا۔

در شہوار نے جب اسے سگریٹ کے دوسرے پکٹ کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے دیکھا تو اس کے دل میں اضطراب لہریں لینے لگا اور اس نے ڈھیٹ بن کر اپنے میل فون پر ہادی کا نمبر ڈائل کیا اور ساتھ ہی اپنے روم کی تمام لائٹس بھی آن کر دیں۔

ہادی جو کہ سبز عالیہ قریبی کی بیماری کی وجہ سے خاصا اب سیٹ تھا، کیونکہ کچھلے کچھ دنوں سے وہ اپنے جیمبر بھی نہیں جا رہی تھیں ان کے دماغ میں یہ خوف بیٹھ چکا تھا کہ کہیں ہادی اپنے اصل والدین کو تلاش کر کے ان کے پاس نہ چلا جائے، اس سوچ نے ان کا فشار خون خاصا بلند کر رکھا تھا۔

ہادی انہیں بھرپور تسلی دینے کے بعد مری واپس چلا آیا اور اس نے آتے ہی اپنے فرانسفری در خواست دے دی تھی، وہ اب سبز عالیہ قریبی کے ساتھ رہ کر ان کے دل سے یہ خوف نکالنا چاہتا تھا، فون کی گھنٹی نے ہادی کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ اس نے بے زاری سے اسکرین پر در شہوار کا نمبر دیکھا اور کچھ سوچ کر کال انیڈ کر لی۔

”اگر سگریٹ سے کام نہیں چل رہا تو اپنے مرحوم دادا کا حقہ بھجوا دوں، ہندوستان سے لے کر آئے تھے وہ۔“

ہادی اس کی بات پر اضطراب سے مسکرایا اور اپنا میل فون اٹھا لے کر کھڑکی کے پاس پہنچ گیا، اس نے در شہوار کو سامنے کھڑے ہو کر دیکھا تھا۔

”میرے خیال میں اس حقے کی ضرورت ان دنوں تمہارے دادا کی کو زیادہ ہے تاکہ اس کے دھوکے میں وہ اپنی عبرت ناک شکست کا غم اڑا سکیں۔“ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی طنز کر بیٹھا اور اس کی اس بات نے در شہوار کو دھکی دیا۔

”اگر میری فیملی کی شکست کا مذاق اڑا کر آپ کی ذہنی ٹینشن دور ہو سکتی ہے تو یقیناً مانیں، میں آپ کا اس معاملے میں بھی بھرپور ساتھ دوں گی۔“ اس کے لہجے میں چھپا گلہ ہادی کو شرمندہ کر گیا۔

”آئی ایم سوری، مذاق کر رہا تھا میں۔“ اس نے فوراً ہی معذرت کی۔

”میں جانتی ہوں، آپ کے نزدیک میری اہمیت ایک مذاق سے زیادہ نہیں۔“ در شہوار کی آنکھوں میں نمی

اتری۔

”مذاق تو بہت سال پہلے تقدیر نے میرے ساتھ کیا تھا۔“ وہ آہستگی سے بڑبڑایا لیکن آگے بھی درشہوار تھی، ہادی کے معاملے میں تو اس کا پورا وجود جسم ساعت بن جاتا تھا۔

”میں آپ کی بات کا مطلب نہیں سمجھی۔“ اس نے آستین سے آنکھیں صاف کیں۔ نہ جانے کیوں آنسو لہے چلے آ رہے تھے۔

”بات کا مطلب تو بعد میں سمجھاؤں گا لیکن تم رو کیوں رہی ہو؟“ وہ کھڑکیوں کے درمیانی چند فٹ کے فاصلے کے باوجود اسے اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے دیکھ چکا تھا، اس کے فکر مند انداز پر درشہوار کا دل یک بارگی دھڑکا۔

”ہادی! میں بہت بُری لڑکی ہوں ناں، بلکہ میرے خیال میں تو لڑکیوں کو محبت کرنے کا حق ہوتا ہی نہیں چاہیے۔“ اس کا دل جذبات سے بوجھل ہو رہا تھا۔

”درشہوار! بات لڑکے یا لڑکی کی نہیں ہے، اس جرأت کی ہے جو ہمارا معاشرہ لڑکیوں کے حوالے سے کبھی قبول نہیں کرتا۔“ ہادی اس کے شکایتی انداز سے نظریں چرا کر بولا۔

”ہمارا معاشرہ لڑکیوں کو انسان ہونے کا مار جن کیوں نہیں دیتا، غلطی تو کسی سے بھی ہو سکتی ہے۔“ درشہوار دھکی ہوئی۔

”اس کا مطلب ہے، مجھ سے محبت تمہاری زندگی کی سب سے بڑی غلطی تھی۔“ وہ ہنسی اچکا تا جیسے اس صورت حال سے لطف اٹھانے لگا۔

”محبت کرنا غلط نہیں تھی، اس کا اظہار کرنا اور اس کے لیے پورے گھر کی عزت کو داؤ پر لگانا ایسا گناہ تھا، جسے شاید اللہ تو معاف کر دے لیکن اس کے بندے کبھی نہیں کریں گے۔“ درشہوار نے لہجے کی نرزش پر قابو پاتے ہوئے بمشکل اپنی بات مکمل کی۔

”خیر اپنے گھر کی عزت کو تو تم نے واقعی داؤ پر لگایا ہے وہ سارے ڈاکو منٹس مجھے دے کر، دیکھا نہیں اس ایک کیس نے پورے ایکشن کی بساط پلٹ دی۔“

وہ اب ہلکے پھلکے انداز میں اسے چھیڑ رہا تھا۔

”لیکن وہ میں نے آپ کے لیے نہیں کیا، یہ بات اپنے دماغ سے نکال دیجیے گا۔“ وہ ترنت بولی تو دوسری طرف ہادی بے ساختہ مسکرایا۔

”اچھا تو پھر کس کے لیے کیا تھا۔“

”دیکھیں ہادی، میری ماں کہتی ہے کہ میں ایک انتہائی جذباتی اور بے وقوف لڑکی ہوں۔“

”بالکل ٹھیک کہتی ہیں وہ۔“ اس نے مسکرا کر بچہ پن میں لقمہ دیا۔ اس کا موڈ اب کافی بہتر ہو چکا تھا۔

”میں اگر محبت میں بغیر سوچے سمجھے قدم اٹھا سکتی ہوں تو کسی کو اس کے ظلم کی سزا دینے کے لیے بھی آخری حد تک جا سکتی ہوں، چاہے دوسری طرف میرا کوئی خونی رشتہ ہی کیوں نہ ہو۔“ اس کی صاف گوئی ہادی کو اچھی لگی۔

”تم ایک اچھی لڑکی ہو درشہوار! اگر دل کے ساتھ ساتھ اپنے دماغ کو بھی ساتھ لے کر چلو۔“ اس کے سادہ انداز پر وہ ہنسی، ایک شفاف اور ٹھنک دار ہنسی۔

”اب تو بتا دیں، کس غم کو مسکریٹ کے دھوئیں میں اڑا رہے تھے آپ۔“ درشہوار کا دماغ اسی منظر میں اٹکا ہوا تھا۔

”اپنی بے قدری اور شناخت کے غم کو، تمہیں پتا ہے میں اپنے پیرئٹس کی لے پاک اولاد ہوں۔“ وہ نہ جانے کیوں اپنی زندگی کا سب سے بڑا غم اس لڑکی کے ساتھ شیئر کر گیا، جس سے وہ سب سے زیادہ چڑتا تھا۔

”اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟“ اس نے بات کو چٹکیوں میں اڑایا۔

”تمہارے نزدیک اس چیز سے کوئی فرق ہی نہیں پڑتا کہ تمہارے پیرئٹس کون تھے۔ تمہاری اصل شناخت کیا تھی؟“ وہ ڈرا سا لہجہ لہا گیا۔

”بعض وفد انسان کی شناخت ہی اس کی زندگی کا سب سے بڑا دکھ بن جاتی ہے، جیسے میرے بس میں ہوتا تو میں شاید میر خاندان میں بھی پیدا نہ ہوتی، جن کا دین محض پیسہ اور اقتدار ہے، چاہے اس کی کتنی ہی بھاری قیمت کیوں نہ ادا کرنی پڑے، ہمارے ہاں لاشوں پر سیاست ہوتی ہے اور سمیت کے سر ہانے بیٹھ کر رشوت کے لفافے چلتے ہیں۔“ آپ خود اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر انصاف کو آواز دیں، اگر میرا تعلق اس خاندان سے نہ ہوتا تو کیا آپ جب بھی میرے ساتھ اس قدر رہے رہتی سے پیش آتے۔“ درشہوار پر آج کچ بولنے کا دورہ پڑا ہوا تھا۔ دوسری طرف ہادی اس کی بات پر ایک دم چپ کر گیا۔

”اس لیے جس چیز پر اللہ نے پردہ ڈال دیا ہے اسے کھوجنے کی کوشش نہ کریں۔ آپ کون ہیں اور آپ کا حسب نسب کیا ہے، وہ انسان کی شخصیت سے اور اس کی اچھی تربیت سے عیاں ہو جاتا ہے، ورنہ تو اچھے خاصے حسب نسب والے ایسا کرتے ہیں کہ انسانییت منہ چھپائے پھرتی ہے۔“ اس کے لہجے میں نہ جانے کیوں غلی اند آئی۔

”خیر تم پریشان مت ہو، یہ سب تو زندگی کا حصہ ہے۔“ وہ ہلکے پھلکے انداز میں اسے بہلاتے ہوئے بولا۔

”مسئلہ سارا اسی زندگی کا ہی تو ہے، جو کچھ لوگوں کو کسی بھی معاملے میں کوئی رعایت دینے کو تیار نہیں ہوتی۔“ درشہوار کے چہرے پر اضطراب بڑھا اور اس نے خدا حافظ کہہ کر فون بند کر دیا۔ ہادی کو پہلی بار اس کال کے یوں ختم کیے جانے پر افسوس ہوا۔

☆☆☆

تاج دار رنگم آج بڑی فرصت سے ہال کمرے کے تخت پر مہارانیوں کے انداز میں بیٹھی تھیں۔

بابا جان کی گھست نے اصل لطف تو انہیں دیا تھا، وہاں کی موت کے بعد ان کے سوچنے کا انداز بالکل مختلف ہو چکا تھا اور وہ دل میں ٹھان چکی تھیں کہ وہ مزید اس گھر کے غلط فیصلوں پر چپ نہیں رہیں گی۔ میر حاکم نے اس معاملے میں مصالحتانہ خاموشی اختیار کر رکھی تھی، اور ویسے بھی یکے بعد دیگرے ہونے والے واقعات نے انہیں بولنے کے قابل ہی کہاں چھوڑا تھا۔

ان سارے پریشانی میں ڈوبے ہوئے دنوں میں انابیہ کے امید سے ہونے کی خبر نے آج بہت دن بعد ان کا موڈ خوش گوار کیا تھا۔ برہان کا رویہ کافی حد تک انابیہ کے ساتھ بہتر ہو چکا تھا اور کل تو وہ اسے خود ڈاکٹر کے پاس چیک اپ کے لیے لے کر گئے تھے۔

”سنائے آپ کے سر صاحب نے آج ٹی وی کی اسکرین ہی تو ڈی۔“ شاہ میر اپنا بیک اٹھائے ہال کمرے میں داخل ہوا، اسے گیٹ پر ہی یہ اطلاع مل چکی تھی کہ حاکم صاحب انتہائی غصے میں ہیں۔ وہ یونٹ سے ایک ہفتے کی چھٹی پر لوٹا تھا۔

”بے فکر رہو، وہ دن دور نہیں، جب تمہارے دادا کا دماغ بھی تمہارے بچا کی طرح الٹ جائے گا اور شاہ صاحب کے حمار پر ایک اور سانپ کا اضافہ ہو جائے گا۔“ اپنی بات پر لطف لینے کے انداز میں وہ خود ہی ہنسیں اور شاہ میر نے جراتی سے ان کی طرف دیکھا، اسے وہ تہہ نہ تھوڑا عجیب لگا۔

”بہت بُری بات ہے ای! ایسے مذاق نہیں اڑاتے۔“

”ارے مذاق تو اسنے سالوں سے انہوں نے ہم سب کا بنا رکھا تھا اور میں حیران ہوں کہ کیوں ہم سب ٹھکس گھوڑے بنے ان کے احکامات پر سر ہلاتے رہتے تھے۔ انہیں ان کی غلط باتوں کا احساس کیوں نہیں دلایا۔“ وہ تلخ انداز میں گویا ہوئیں۔

”انکیشن کی شکست کو تو انہوں نے دماغ پر سوار کر لیا ہے۔۔۔ وہ اپنے جو گرز کے قصے کھولتا ہوا افسردگی سے بولا۔

”اس شکست سے زیادہ تو انہیں جیل کی سلاخوں کا خوف کھائے جا رہا ہے، تمہارا کیا خیال ہے، اتنے بے گناہ لوگوں کی موت کا حساب نہیں دینا پڑے گا انہیں، مختتم بتا رہے تھے، کسی بھی وقت ان کی گرفتاری کے آرڈر آ سکتے ہیں۔“

”ہاں یہ خبریں تو ہر طرف گرم ہیں، پتا نہیں کیا ہوگا۔“ وہ ماں کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گیا تو وہ محبت سے اس کے گھنے بالوں میں اپنی انگلیاں پھیرنے لگیں۔

اسی وقت طوفانی رُے میں دو چائے کے کپ رکھے کمرے میں داخل ہوئی، شاہ میر کی طرف دیکھ کر وہ ہلکا سا مسکرائی تو اس نے بھی ماں کی گود میں سر رکھے ہوئے اس دُکھ جاں پر ایک بھر پور نظر ڈالی۔

”تمہاری طرف بڑوں سے سلام دعا کا کوئی رواج نہیں۔“ شاہ میر نے بہت دنوں بعد اسے اس انداز میں چھیڑا تھا۔ ورنہ وہ ہرج کی موت کے بعد تو وہ گویا ہستنا ہی بھول گیا تھا۔

”کیوں اس بے چاری کے پیچھے بڑے رہتے ہو۔“ تاج دار بیگم نے محبت سے طوفانی کی طرف دیکھا، جس کے چہرے پر پھیلا گلابی پن ان کے سینے کا سر ہون منت تھا اور انہوں نے دل ہی دل میں دونوں کو نظر بد سے بچنے کی دعا دی۔

”چلیں، میں پیچھے ہٹ جاتا ہوں، آپ خاقان چچا اور شارقہ چچی کے سامنے درخواست کر لیں، معاملہ ہی ختم ہو جائے۔“ اس کے شرارتی انداز پر طوفانی بوکھلا کر کمرے سے نکل آئی اور تاج دار بیگم نے مسکرا کر اسے تسلی دی۔

”شارقہ سے تو میں بات کر چکی ہوں، اسے تو کوئی اعتراض نہیں، اچھا ہے دونوں بہنیں ایک ہی گھر میں آ جائیں گی تو ایک دوسرے کا خیال بھی رکھیں گی، باقی خاقان آج کل اپنی ہی کسی پریشانی میں گم ہے، کسی دن موقع دیکھ کر اس سے بھی بات کروں گی لیکن بہتر ہے فارحہ کی حدت ختم ہو جائے۔“

”فارحہ بھابی سے یاد آیا، کہیں دانی اب مجھے پھانسی کے پھندے پر چڑھانے کی کوشش نہ کریں۔“ اسے اپنی فکر ہوئی۔

”وہ دن گئے جب خلیل خان، فاخر اڈا کرتے تھے۔“ تاج دار بیگم ہنوز طنز یہ انداز میں گویا ہوئیں۔

”عذرت چچی کی طبیعت ٹھیک ہوئی؟“ اسے اچانک یاد آیا۔

”عذرت نے تو ارسل کے ملک سے باہر جانے کو سر پر ہی سوار کر لیا ہے، شکر نہیں کرتی اس جہنم سے کوئی تو نکل کر گیا، اچھا ہے اپنی زندگی بنالے گا، یہاں تو سیاست کی جو تُوڑ ہے ہی زندگیاں برباد کر رہی ہیں۔“

”میری بات ہوئی تھی ارسل سے، وہ میرے ڈاکو متیں ہوا کر اسے بلوا رہا ہے۔“ شاہ میر کی اطلاع پر وہ چونکیں۔

”چلو اچھا ہے، اسے بھی کھل کر سانس لینے کا موقع ملے گا۔“ تاج دار بیگم کے تلخ انداز پر شاہ میر ہنسکے۔

انداز میں مسکرایا، وہ جانتا تھا اسنے سالوں کی گھٹن کو پہلی بار کھل کر نکلنے کا موقع ملا ہے۔

☆☆☆

”اوہ ماں کا ڈ۔“

ہادی کے منہ سے نکلنے والی اس داستان نے حمزہ کو دنگ کر کے رکھ دیا۔ وہ دونوں اس وقت دامن کوہ پر منال ریسٹورنٹ میں موجود تھے۔ حمزہ کی آنکھوں میں پہلے حیرانی اور پھر بے یقینی اتر آئی۔

”کس فلم کی اسٹوری سنار ہے ہو مجھے۔“ اسے یقین نہیں آیا۔

”اگر ایک ایسی فلم جس کے بندے کو بھی اس بات کا یقین نہیں آ رہا تو یقیناً یہ پھر ایک فلم کی اسٹوری ہی ہوگی۔“ ہادی نے اپنا مذاق خود اڑایا، اور سامنے رکھا میو اٹھا کر یونہی دیکھنے لگا، وہ نہ جانے کیوں پچھلے چند دن سے عجیب سی افسردگی کے حصار میں تھا۔

”چچ بتاؤ کیا واقعی کچھ کہہ رہے ہو تم۔“ حمزہ نے اس کے ہاتھ سے میو کا ڈھکچھن کر ایک طرف رکھا۔

”کاش یہ سب جھوٹ ہوتا۔“ ایک جگہ سے توقف کے بعد ہادی نے اس کی کھوجی نظروں کی تاب نہ لا کر افسردہ لہجے میں کہا۔

”اور کاش تم یہ بات اسی وقت مجھے بتا دیتے تو میں تمہارے خاندان کا اتنا پتا پتال سے بھی نکال کر لے آتا، لیکن افسوس تم نے اپنے بیٹے فریڈ کو اس قابل ہی نہیں سمجھا۔“ حمزہ نے اس سے شکوہ کیا تو وہ ہچکے سے انداز میں مسکرا دیا۔

”چچ کہوں تو مجھے کبھی اس بات میں انٹرسٹ پیدا ہی نہیں ہوا تھا لیکن فائزہ پچھو کی اس بات نے مجھے بے چین کر دیا کہ اس رات کسی عورت نے فرین سے کوڈ کر خوشی کی تھی، اگر وہ واقعی میری ماں تھی تو پھر مجھے یہ جانتا چاہیے کہ اس کے پیچھے ایسی کیا وجہ تھی۔“ وہ جی الامکان اپنے لہجے کو نارمل بناتے ہوئے بولا۔

”تم ابھی اور اسی وقت اپنی پچھو کو نوں کر دو اور ان سے معزز صاحب کا کاٹیکٹ نمبر لو، ہم دونوں ان سے ملنے کے لیے چلتے ہیں۔“ حمزہ نے سیکنڈوں میں فیصلہ کیا تھا اور ہادی اس بات پر حیران ہوا۔

”کیا تم سیر نہیں ہو۔؟“ اس کی بے یقینی پر حمزہ مسکرایا۔

”تمہارا پتا نہیں لیکن میں شہر زاد کے بعد اگر کسی معاملے میں سیریس ہوا ہوں تو وہ یہی ہے۔“ اس نے دانستہ ہلکا پھلکا انداز اپنایا۔

اسی رات ہادی نے بمشکل فائزہ بیگم سے ان کی فریڈ کے میاں کا نمبر لیا، وہ کسی بھی قیمت پر دینے پر راضی نہیں ہو رہی تھیں لیکن ہادی اور منال نے انہیں جیسے تیسے کر کے منائی لیا تھا۔ معزز صاحب سے اس نے فائزہ بیگم کے حوالے سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا تو اسے علم ہوا کہ وہ آج کل لاہور میں مقیم تھے اور انہوں نے چند ایک باتوں کے بعد انہیں اپنے گھر آنے کی دعوت دی تھی۔

ہادی اگلے ہی دن پہلی فلائٹ سے حمزہ کے ساتھ ان کے گھر لاہور جا پہنچا، معزز احمد ریلوے پولیس سے ایس بی کے عہدے سے ریٹائرڈ ہوئے تھے اور ہادی نے جب انہیں اپنا مکمل تعارف کروایا تو انہوں نے بہت گرم جوشی کے ساتھ اسے اپنے گھر لگایا اور بتایا کہ وہ اکثر اپنی بیوی سے اس کے بارے میں پوچھتے رہتے تھے جو کہ ہادی کی پچھو کی بیٹے فریڈ تھیں اور انہیں اس بات کا مکمل اطمینان تھا کہ وہ بچہ محفوظ ہاتھوں میں ہے۔ ہادی نے ان کی گفتگو کے بعد ان سے ڈائریکٹ اس دن کے واقعے کے بارے میں پوچھا۔ جس کے لیے وہ انتہا لبا سز کر کے یہاں پہنچا تھا۔

”انکل! آپ کو اس رات کا واقعہ یاد ہے ناں۔“ ہادی کی آنکھوں میں امید کا ایک جہان آباد تھا۔

”بیٹا! میں کیسے بھول سکتا ہوں کیونکہ وہ میری پروفیشنل لائف کا سب سے حیران کن اور عجیب واقعہ تھا کہ کوئی عورت اپنے چند دن کے بچے کو ایک ویران اسٹیشن پر چھوڑ کر چلی جائے، اس کے لیے بہت بڑا حوصلہ اور ہمت چاہیے، بھینا اس کے پس منظر میں کوئی بڑی بات ہوگی۔“

”کیا آپ تفصیل سے بتا سکتے ہیں کہ اس رات کیا ہوا تھا؟“ ہادی کی بے تابی پر وہ ہلکا سا مسکرائے۔
”ہاں ہاں کیوں نہیں، میں تو اس دن اتفاق سے اپنے ریلوے کے ٹکٹے کے کسی اہم کام سے اس قصبے میں موجود تھا اور میرا قیام اسٹیشن کے پاس ایک ریسٹ ہاؤس میں تھا اور واقعے کی اعلیٰ سطح میں اسٹیشن ماسٹر واجد کے آفس پہنچا تو وہاں جا کر مجھے اس واقعے کا علم ہوا۔“

”آپ کو کیسے پتا چلا کہ اس بچے کو کسی ٹرین کے مسافر نے وہاں چھوڑا ہے؟“ حمزہ نے اپنی تسلی کے لیے پوچھا۔

”اس لیے کہ اس اسٹیشن پر کسی بڑی گاڑی کا اسٹاپ تھا ہی نہیں، اس دن کوئی کر اس بڑ گیا تھا تب ہی خبر میل گاڑی وہاں کچھ منٹ کے لیے رکی تھی اور یہ بات مجھے اسٹیشن ماسٹر واجد صاحب نے بتائی تھی جو میرے بہت اچھے دوست بھی تھے۔ انہیں وہ بچہ ایک قلی نے لا کر دیا تھا، جس نے رات کے کسی پہر ایک عورت کو اس ٹرین میں سوار ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔“ معیز احمد کی بات پر وہ دونوں زبردست انداز میں چونکے۔

”کیا اس قلی نے اس عورت کا چہرہ دیکھا تھا؟“ ہادی بے تابی سے گویا ہوا۔

”نہیں۔ وہ اس وقت ہلکی سی نیند میں تھا، لیکن اسے اس بات کی کافی خبر تھی کہ وہ عورت کیوں اس گاڑی میں سوار ہو رہی ہے، جس کا یہاں طے شدہ کوئی اسٹاپ نہیں تھا، پھر اس نے خود ہی اندازہ لگایا کہ وہ شاید نکلے سے پانی وغیرہ لینے کے لیے اسی ٹرین سے اتری ہوگی۔ وہ وہیں پلیٹ فارم کے ایک بیچ پر کھلے اور صاف سوراخ تھا اور صبح سویرے اس کی آنکھ کسی بچے کے رونے کی آواز سے کھلی، اور یہ آواز اسے شیشم کے درخت کے نیچے موجود سنگ مرمر کے بیچ کے پاس سے آ رہی تھی۔ اس نے فوراً جا کر دیکھا تو اسے ایک بچہ سلپنگ بیگ میں لیٹا ہوا نظر آیا۔“

معیز احمد سانس لینے کو رک کے اور ہادی کو لگا جیسے اس کا سانس رک جائے گا، وہ بے تاب نظروں سے ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”خون جمائی ہر دی کی شدت سے بچے کی حالت بگڑ رہی تھی، وہ قلی گھبرا کر اس بچے کو اپنے کبیل میں لپیٹ کر اسٹیشن ماسٹر کے آفس میں لے آیا، اور اس وقت میں بھی وہیں موجود تھا۔“ انہوں نے اپنی یادداشت کھنگال کر مزید بتایا۔

”پہلے تو ہم لوگ اس بچے کو لے کر ایک کلینک میں گئے۔ کہاؤ ڈرنے کہا کہ فوراً کسی اسپیشلسٹ کو دکھایا جائے کیونکہ بچے کو منہ کی شکایت لگ رہی تھی، اور وہ سانس بھی رک کر رہے تھا، میں نے اپنی مسز سے رابطہ کیا جو خود بھی ڈاکٹر تھیں، انہوں نے فوری طور پر اسے اپنے ساتھ لانے کا مشورہ دیا، میں یہی سوچ کر اس بچے کو اپنے ساتھ لے آیا کہ اس کا علاج کروا کے اسے کسی ختم خانے میں چھوڑ دوں گا کیونکہ پولیس ڈیپارٹمنٹ کے حالات مجھ سے بہتر کون جان سکتا تھا اور مجھے اس بات کا بھی خوف تھا کہ بچہ کہیں غلط ہاتھوں میں نہ چلا جائے۔“ وہ رکے۔

”آپ نے اس کے پرنس کو تلاش کرنے کی کوشش کیوں نہیں کی؟“ حمزہ بے چین ہوا۔

”بیٹا! جو ماں اپنے بچے کو خود ایسے بے آسرا چھوڑ کر چلی جائے۔ اس کو میں کس امید پر تلاش کرتا، اوپر سے بچے کی حالت خاصی خراب تھی، ہم نے تھوڑی بہت بھاگ دوڑ ضرور کی تھی، اس بچے کی باسکٹ میں اس کا برتھ

سرٹیفکیٹ، میڈیسن اور کچھ چیزیں ہمیں ملی تھیں، لیکن اسی دن جب یہ پتا چلا کہ اسی خیر سہل ٹرین سے کسی عورت نے بھی رات خود کشی کی ہے تو سارا معاملہ ہماری سمجھ میں آ گیا، اس لیے ہم نے اس بچے کے بانی رشتے داروں کو تلاش کرنے کا خیال ہی دل سے نکال دیا۔“ معیز احمد کی بات پر ہادی کا چہرہ تار یک ہوا۔

”اس راتھ سرٹیفکیٹ پر باپ کے خانے میں کس کا نام لکھا تھا؟“ حمزہ نے ہلکا سا جھجک کر پوچھا۔

”بچہ پوچھو بیٹا! مجھے بچے کا نام وغیرہ تو یاد نہیں، البتہ ملتان کے نشتر ہسپتال کا نام میرے ذہن میں ضرور ہے۔“ مجھے واجد نے کہا بھی تھا کہ ہم ہسپتال جا کر اس دن کا ریکارڈ نکھواتے ہیں لیکن میں نے منع کر دیا کیونکہ اسی دن میری مسز نے اپنی بیسٹ فرینڈ کی بھابھی کا ذکر کیا تھا، جس کے لیے وہ کوئی بچہ تلاش کر رہی تھی کیونکہ اس کی دوست کی ڈیوری کے دوران ایسی پیچیدگی ہوئی تھی، جس کی وجہ سے نہ تو وہ دوبارہ ماں بن سکتی تھی اور نہ ہی اس کا بچہ بچ سکا تھا، چنانچہ ہم نے یہی بھرتہ سمجھا کہ اس بچے سے اس عورت کی گودا یاد کر دی جائے، جس کو واقعی اس کی ضرورت تھی۔“

معیز احمد کی بات سن کر ہادی اور حمزہ ایک دم خاموش ہو گئے اور معیز احمد ایک لمبا سانس لے کر مزید بولے۔
”میں تو صرف اتنا جانتا ہوں بیٹا! جس عورت نے اسے بچے کو ایک سنسان اسٹیشن پر چھوڑ کر خود گاڑی سے چھلانگ لگا دی ہو، بھینا اس کے پاس زندہ رہنے یا اپنے بچے کو اس کے خونی رشتے داروں کے پاس چھوڑنے کا کوئی جواز نہیں ہوگا، ورنہ کوئی ماں کیسے اتنا بڑا فیصلہ کر سکتی ہے۔“

”کیا وہ راتھ سرٹیفکیٹ مجھے مل سکتا ہے؟“ کچھ لمحوں کی خاموشی کے بعد ہادی نے امید بھری نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا۔

”شاید واجد کے پاس پڑا ہو، اس کی پوسٹنگ آج کل سکھر میں ہے، تم لوگوں کو اس سے رابطہ کرنا ہوگا لیکن مجھے نہیں لگتا کہ اتنے سال پرانی چیز اس نے سنجال کر رکھی ہوگی۔“ انہوں نے بغیر کسی لگی لپٹی کے کہا تو ان دونوں کے چہروں پر مایوسی کی لہر دوڑی۔

”انکل! امید پر دنیا قائم ہے، جب اتنے سال پرانی بات آپ کو یاد ہے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ بھلا بچے ہوں، آپ ان کا کوئی کامیکٹ نمبر مجھے دے دیں، ہم ان سے رابطہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔“ حمزہ کی بات پر وہ ہلکا سا مسکرائے۔

”میں آپ لوگوں کے سامنے ہی اس سے بات کر کے پوچھ لیتا ہوں، وہ میرا بہت اچھا اور قریبی دوست ہے۔“

انہوں نے فوراً ہی اپنے سیل فون سے واجد صاحب کا نمبر ملا یا، ہادی کے دل کی دھڑکنیں بے ربط ہو گئیں۔ دوسری طرف نیل جاری تھی اور چار پانچ گھنٹیوں کے بعد کال انٹینڈ کر لی گئی۔ معیز احمد بڑے بے تکلف انداز میں اپنے دوست سے محو گفتگو تھے اور دھڑکی سی زبانی گفتگو کے بعد وہ ڈائریکٹ اس موضوع پر آ گئے۔

”تم اپنے ڈاکومنٹس چیک کر کے مجھے ابھی بتاؤ، میں انتظار کر رہا ہوں۔“

انہوں نے جیسے ہی فون بند کیا، ہادی کو ایسے لگا جیسے اس کا وجود فضاؤں میں معلق ہو گیا ہو، وہ دوبار پر لگی گھڑی پر نظر پڑا کہ بھٹا تھا اور ٹھیک بیس منٹ اور چند سیکنڈ کے بعد معیز صاحب کے سیل فون کی گھنٹی بجی اور ہادی کو اپنی رگوں میں خون کی گردش محسوس ہوتی محسوس ہوئی۔

☆☆

آخری قسط اگلے ماہ

میری زندگی ہے تو

”اگر میں تم کو حقیقت بتاؤں تو یہ بات سچ ہے کہ میں بی جان کالے بالک پوتا ہوں۔“
”جس طرح کا برتاؤ وہ کرتی ہیں، کم از کم اس سے یہ ہی معلوم ہوتا ہے۔“ ارمغان نے تپ کر کہا۔
”اچھا، لیکن کیسا برتاؤ۔“
”وہ جو رات دیر تک تمہارا انتظار کرتی ہیں اور اس سردی میں کھڑکی سے گلی کھڑی رہتی ہیں یا جب شہر اوڑے کی طبیعت خراب ہوتی ہے تو بے تاب ہو کر دو اور غذا کا خیال رکھتی ہیں۔“ کس قسم کے برتاؤ کی تم بات کر رہے ہو؟“ دونوں ہاتھ کر رکھ کر منظم

ناولٹ

سیدھی نہیں ہوئی۔“
منظم کی بات سن کر ارمغان بولا۔ ”دیکھو میں بالکل سیریس ہوں، کل میں نے الگ گھر میں شفٹ ہونے کی بات کی، تو رات کا ڈنر آف ہو گیا، میں تو باہر چلا گیا، رات دیر سے لوٹا تو دیکھا بی جان اپنی جگہ پر بیٹھی تھیں اور ڈنر اپنی جگہ پر۔“
”بہت افسوس کی بات ہے ارمغان، تم ان دونوں کا دل دکھاتے ہو۔“
”تو کیا کروں جو انہوں نے میرے ساتھ کیا، اوکے یار! آج مجھے ذرا جلدی گھر جانا ہے۔“
منظم کو بانی پیٹے اچھو لگ گیا اور بولا۔ ”کیا؟ یہ میرے کان کیا سن رہے ہیں کہ سید ارمغان شاہ آج جلدی شاہ جیس تشریف لے جائیں گے۔“
ارمغان نے گھور کر کہا۔ ”میں نے کب کہا کہ



میں شاہ جیلس جاؤں گا۔ میں تو اس جنگل کی بات کر رہا ہوں جو بابائے وفات سے چند دن قبل خرید تھا، مگر اس کے ڈاکو منٹس کلیر نہیں ہوئے تھے اور قانونی کارروائی باقی تھی، اس لیے۔ پھنس گیا تھا، لیکن دو دن پہلے ویل کی کال آئی تھی کہ گھر کلیر ہو گیا ہے۔ لہذا چیک کر لیں، سو میں نے دادا جان اور بی جان سے اس جنگل میں رہنے کی بات کی تھی کہ وہ آفس سے قریب ہے، ویسے بھی میں تنہائی کو پسند کرتا ہوں، اکیلے رہنا چاہتا ہوں، مگر بس پھر کیا ہو امت پوچھو۔ ”یار وہ بوڑھے ہیں ہمیں کھونا نہیں چاہیے“ منظم نے جواب دیا۔

”بس مغرب کی یہی چیز مجھے پسند ہے وہاں کوئی کسی کی پرسنل لائف میں ٹانگ نہیں اڑاتا چاہے وہ والدین ہی کیوں نہ ہوں۔“ چہ جائیکہ دادا اور دادی۔

اس کی بات سن کر منظم آفس سے دائیں بائیں سر ہلاتا ہوا منظم کو دیکھتا رہا۔

ارمغان نے اس کی نظروں کی پروا نہ کرتے ہوئے کہا ”میں چاہتا ہوں کہ آج اس جنگل کو چیک کر کے اس میں کمپیوٹر سسٹم سیٹ کر لوں تاکہ آفس کا پیپر ورک ڈرائیکسوں سے کر لیا کروں گا۔“

”ہاں تو شاہ جیلس میں کون سا تمہارا درجن ہے جس میں جو کہیں آفس کا پیپر ورک کرنے میں یکسوئی سے کام نہیں کرنے دیتے۔ بہر حال تم خود مختار ہو تمہیں کون روک سکتا ہے۔“ ارمغان نے منظم کی بات سن کر جواب دیا۔

”تم ٹھیک کہتے ہو مگر جب جب میں شاہ جیلس جاتا ہوں میرا غم تازہ ہو جاتا ہے کہ جو سلوک انہوں نے جیسی فرمائندہ کے ساتھ کیا۔“

”ہاں تو اس میں ان کا کیا قصور؟ تمہاری حرکتیں ہی ایسی ہیں تو کس نے کہا تھا کہ امریکن لڑکی سے دل لگاؤ اور پھر دیدہ دلیری سے لا کر شاہ جیلس میں پورے خاندان کے سامنے کھڑا کرو۔“

مذہب بدلنے پر تیار تھی مگر ہمارے ہی دلوں میں وسعت نہیں تھی۔“ ارمغان نے ناراضی سے منظم کی بات کا جواب دیا۔

”مگر یہ تو تم نے بتایا ہی نہیں کہ جیسی کتنے دن کے لیے مذہب بدلتی۔ دیکھو ارمغان! تم اس کو کلہ پڑھا کر شادی کر لیتے اور وہ امریکہ جا کر اپنی سابقہ روش اپناتی تو تم کیا کرتے۔“

اس نے بی جان اور دادا جان کے حتی انکار کے بعد ایک بار بھی تم سے ملنے یا رابطہ کرنے کی کوشش نہیں کی اور تمہاری واپسی کے بارے میں کوئی دیکھی ظاہر نہیں کی سو معلوم ہوا کہ تم الودہ۔“

ارمغان آرام وہ کرسی پر بیٹھا غور سے منظم کی باتیں سن رہا تھا اور دل میں کہیں ان کی تصدیق بھی کر رہا تھا مگر وہ پھر بھی ناراض تھا کہ گھر والوں نے جیسی کو عزت نہیں دی اور اس بات کو لے کر بی جان اور دادا جان اور بی جان کو ناراض کرنے والے تمام کام وہ بہت خوشی سے سر انجام دے رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

”انزلہ کی بیٹی جلدی کر رہی تھی اور نہ پھو پھو جان اٹھ گئیں تو دوبارہ پروگرام کیسٹل کرنا پڑے گا۔“ ستائش نے ساتویں بار انزلہ سے کہا جو جلدی جلدی میں بھی اس کیلئے سے غمگین تھی ابھی اس طرف والے سے۔

”ہائے ستائش تم بہت اچھی خالہ بنو گی جس کو ہر وقت میرے بچے یاد آتے ہیں“ اور ستائش نے اس بات پر ایک زور دیکھی کہ کافی اور ساتھ ہی انزلہ کے منہ پر ہاتھ رکھ کر نکلنے والی چیخ کا گلا بھی دبا دیا۔ اب وہ دونوں راز داری سے باہر نکل کر ساتھ والے جنگل کی درمیانی دیوار پھلا گئے کی کوشش کرنے لگیں۔ اور کامیاب بھی ہو گئیں۔

اندر ایک بہت خوبصورت گھر تھا جس کے چاروں اطراف لان۔ جس میں امی مائے اور انا کے درخت لگے تھے اور درمیانی گھاس عدم توجہ کی وجہ سے جنگل کا سا روپ اختیار کر چکی تھی۔ درمیان سے راست نکال کر سیدھا کار پورچ اور پھر سڑکیاں اور آگے گھر

کے اندر ہال کا بڑا سا دروازہ جو کہ بند رہتا تھا۔ گھر اپنے مالکوں کے بہترین ذوق کا منہ بولتا ثبوت تھا مگر مالک اس طرح غائب تھے جس طرح گدھے کے سر سے سینگ (اف اللہ) وہ دونوں بے فکری سے چلتی امی کے پیڑ کے پاس پہنچیں جس پر کنارے (بچی امی) کے ڈھیر سارے کچھے لگ رہے تھے۔

انزلہ نے دونوں ہاتھوں کو جوڑ کر پیالا بنایا اور درخت کے ساتھ لگا دیا پھر بڑی مہارت سے ستائش نے اپنی فراک کو گھر کے سے انداز میں اٹھا کر اوپر کیا اور پیالے پر پھر رکھ کر اس کو زینت بخشی اور پھر دوسرا پیالہ درخت کی ڈال پر پھر وہ اوپر اور مزید اوپر چلی گئی اور کناروں کی بارش شروع کر دی اپنی اس کارکردگی میں وہ دونوں سیاہ کار کو جو پورچ میں گھڑی تھی یکسر فراموش کر چکی تھیں۔ گھر کے دروازے جو ایک عرصہ سے بند تھے ان کے کھلنے کی مخصوص آواز سے انزلہ نے فوراً اس طرف دیکھا اور ہاتھ میں تھا سے کنارے پھینک کر بھاگی مگر جاتے ہوئے ستائش کو پیغام دینا نہ بھولی ”ستائش آگئی آزمائش“ ستائش نے بھی اترنے میں جلدی کی اور جب نیچے کودی اور اپنی محنت کو زمین پر پڑا دیکھ کر انزلہ کو کوئی ان کو اپنی ٹھیں کے دامن میں بھرنے لگی ایک آدمی کو گھر سے نکلتا دیکھ کر فوراً گاڑی کے پیچھے چھپ گئی۔

گاڑی کا پچھلا دروازہ کھلا تھا کیونکہ ابھی ہی ارمغان کمپیوٹر نکال کر اندر لے کر گیا تھا اور سیٹ کرنے کا کام کل پر چھوڑ دیا تھا کیونکہ بی جان نے کہا تھا کہ معیار کو ایئر پورٹ چھوڑنے جانا ہے منظم کی باتوں کا اثر تھا لہذا ماننا پڑا کہ دادا جان کی گھوڑی اور گھوڑی لگا ہیں بھی یاد آ رہی تھیں، لہذا گھر پر سرسری سی نگاہ ڈال کر کمپیوٹر رکھا اور واپس ہوا۔

اگلی نشست کا دروازہ کھول کر بیٹھا تو پچھلے دروازے پر نظر پڑی جو کہ کھلا رہ گیا تھا وہ بند کرنے کے لیے لٹکا تو نائرس میں ہوا کم ہونے کے اندیشے سے گھوم کر گاڑی کے ٹائر چیک کرنے لگا ستائش کو لگا

اب سانس بند ہوئی کہ تب۔ اس نے جلدی سے کنارے پھینکے اور کھلے ہوئے دروازے سے اندر بچے کو ہو کر گاڑی میں بیٹھ گئی اسی وقت ارمغان کا فون بجنے لگا اس نے جھنجھلا کر فون نکالا تو دادی کی کال تھی اس نے فون ریسو کیا۔

”آ رہا ہوں آپ نے تو بالکل ڈرا بیور ہی تصور کر لیا ہے“ اور زور سے پاؤں مار کر دروازہ بند کر دیا۔

وہ جو نکلنے کے لیے پر توں رہی تھی اب دیک کر بیٹھی رہ گئی کہ ارمغان نے گاڑی اشارت کر دی جب جنگل سے گاڑی باہر نکلی تب ستائش کو ہوش آیا مگر اس کی پرانی عادت تھی مصیبت میں کیڑی کی طرح آنکھیں بند کر لو۔ البتہ باہر انتظار کرتی انزلہ نے ستائش کو گاڑی میں دیکھ کر فوراً گاڑی کا نمبر نوٹ کیا اور گھر بھاگی۔ گھر پہنچ کر انزلہ نے ماموں کو فون ملایا اور ایک بی سانس میں ساری بات رو رو بدل سے سنائی کہ کوئی آدمی ستائش کو اس گاڑی میں اغوا کر کے لے گیا ہے ماموں تو ڈی ایس بی تھے گاڑی کے نمبر کے ذریعے پتا نکلوایا اور کارٹائیل لے کر روانہ ہو گئے۔

معجز بہت بے چینی سے اس کا انتظار کر رہا تھا اور بی جان کو اس کی ٹالاکھوں کے بارے میں بتا رہا تھا کہ ارمغان کی گاڑی آئی دیکھ کر فوراً بیک لے کر پورچ میں آ گیا۔

”کیا ضرورت تھی اب بھی آنے کی؟ وہ بی جان اور دادا جان کو اللہ حافظ کہتا لگا اور وہ کھول کر بیٹھنے لگا لیٹ ٹاپ پیچھے رکھنے کے لیے پیچھے دیکھا تو وہ حیرت سے منہ کھولے پہلے ارمغان کو اور پھر پچھلی نشست پر بیٹھ وجود کو دیکھنے لگا۔

”معجز! کیوں اٹیچو بن گئے ہو پلیز جلدی کرو“ بیٹھو بھی ڈرا ارمغان بولا۔

معجز چیخ کر بولا ”یہ بھابھی کو کہاں سے لا رہے ہو اور اگر گھر لے آئے ہو تو گھر کے کینوں سے بھی ملو اور ان بزرگوں سے سلام دعا کرو۔“

اس کی بات سن کر ستائش بھی سیدھی ہو کر بیٹھ گئی کہ آزمائش شروع ہوئی تھی۔

معجز کی بات سن کر ارمغان نے ایک جھٹکے سے پیچھے دیکھا تو اسے واقعی اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔
”یہ۔۔۔ وہ۔۔۔ اس سے بات ہی نہ تھی کہ معجز نے فوراً دروازہ بند کیا اور پیچھلا دروازہ کھول کر بازو سے پکڑ کر ستائش کو باہر نکالا۔ بی جان اور دادا جان جواب تک کے ہونے والے مکالمے کو سمجھنے کی کوشش میں بھی ارمغان کو دیکھ رہے تھے۔ بھی معجز کو گاڑی سے نکلتی جیتی جاگتی لڑکی کو دیکھ کر رنگ سے رہ گئے۔

”یہ دیکھیں بی جان! ارمغان صاحب کے کارناموں میں ایک اور کارنامے کا اضافہ ہو گیا۔ یہ ہیں آپ کی بہوناں ان سے خود ہی پوچھ لیں۔ ویسے ارمغان صاحب کی اصطلاح میں اس کو نیا کمپیوٹر سسٹم کہتے ہیں۔ سر جھکا کر ہنسنے ہوئے معجز نے کہا۔

بی جان بیڑیاں اترتی نیچے آئیں۔ ستائش نے آنکھیں بند کر کے دروازہ پر پڑھنا شروع کر دیا جبکہ ارمغان آنکھیں کھولے معاملے کو سمجھنے کی کوشش کرتا رہا۔ بھی حیران سا گاڑی کو بھی معجز کو اور کبھی اس لڑکی کو دیکھتا جو نہ جانے کیسے گاڑی میں نازل ہوئی تھی۔

بی جان آنکھوں سے آنسو صاف کرتے ہوئے بولیں ”میں بھی سوچوں کہ ارمغان انہیں الگ گھر کی کیا سوچیں گے مگر اب میں سب سمجھ گئی ہوں تم اپنی فیملی کو ہم تم ظرف لوگوں میں رکھنا ہی نہیں چاہتے۔ بہت انوس ہو۔“ پھر ستائش کی طرف منہ کرتے ہوئے پوچھا ”کیا نام ہے تمہارا؟“

”جی ستائش! ستائش نے تھوگ نکلتے ہوئے جواب دیا۔

”کب کی شادی؟“ بی جان نے اگلا سوال داغا۔

”جی کس نے؟“ ستائش نے حیرانی سے اہل خانہ پر اک نگاہ ڈالی

”تم دونوں نے اور کس نے؟“

میں۔۔۔ وہ کہہ پوچھیں سائرن کی آواز نے سب کو متوجہ کر لیا اسے میں ڈی ایس بی اورنگ زیب اسکے ہی گھر میں داخل ہوئے تو ستائش فوراً بھاگتی ان کے گلے سے جا لگی۔

”شکر ہے بابا آپ آ گئے۔“

”قانون کے ساتھ بہت لمبے ہوتے ہیں وہ مجرم کو چاروں طرف سے گھیر لیتے ہیں۔ وہ گاڑی کا نمبر دیکھتے ہوئے بولے ”کس کی گاڑی ہے؟“

معجز نے پکڑ کر ارمغان کو سامنے کر دیا۔ انہوں نے سر سے لے کر پیر تک اس کو بغور دیکھا اور بولے۔

”ہم ان کو ایسٹ کرنے آئے ہیں انہوں نے لڑکی کو اغوا کرنے کی کوشش کی ہے۔“

ارمغان حیرانی سے معجز کو دیکھنے لگا جو معاملے کو سمجھنے میں ہلکا ہوا ہاتھ اور پیچھے میں ٹھہر آ رہا تھا۔

بی جان اور دادا جان فوراً آگے آئے ”دیکھیں جی بچے ہیں! جو کیا اپنی مرضی سے کیا اور شادی کر لی تو کیا برا کیا۔ ہاں طریقہ غلط ضرور ہے ارمغان کا۔ اور گھور کر ارمغان کو دیکھا۔

”ہم ستائش کو اپنی بہو تسلیم کرتے ہیں اور شاہ پولیس میں جائز مقام دیتے ہیں گھر کی بات کو تھانے

لے کر جانا چھوڑا اچھا نہیں لگتا ہم عزت دار لوگ ہیں۔ تھانے آج تک کوئی نہیں گیا۔ مجھے بچی بہت پسند ہے۔ اور تائید کے لیے بی جان کو دیکھا تو انہوں نے

بھی سر ہلا کر ان کا ساتھ دیا۔

ارمغان ان دونوں کی باتیں سن کر سر تھام کر رہ گیا۔

جبکہ ڈی ایس بی اورنگ زیب گھر اور پھر ارمغان کو دیکھ کر سمجھ گئے کہ معاملہ اغوا کا نہیں ہے۔

معاملہ سمجھا اور بے پھر ستائش سے بولے۔

”یہ سب کیا ہے۔“

”بابا! میں ان میں سے کسی کو نہیں جانتی میرا یقین کریں، نہ ہی میں نے کوئی شادی وادی کی ہے

پلیز بابا۔“

توروں سے ستائش کو دیکھا اور آگے بڑھ کر دادا جان کے بالکل سامنے آئے اور بولے ”ہم عزت دار ہیں اور آپ بھی لیکن عزت داروں ہی کے گھر بھی تالاقی اولاد پیدا ہوتی ہے اور وہ اصل میں سارے خاندان کا امتحان ہوتی ہے آپ کا لڑکا ابھی میری بیٹی کو اغوا کر کے لے آیا ہے اس لیے میں اس کو گرفتار کرتا ہوں۔“

دادا جان کے پاؤں کے نیچے سے تو زمین ہی کھسک گئی کہ الو کا۔۔۔ لڑکی لایا بھی تو ڈی ایس بی کی۔“ فوراً بولے۔

”دیکھیں میں آپ کی بات سمجھتا ہوں لیکن اس کا حل ہے میرے پاس۔ اس کا نکاح کل شام کو ستائش سے کر دیں تاکہ اس کی کرنی اس کو بھی بھرنی پڑے۔ پولیس آپ کو منظور ہے۔“

اورنگ زیب نے ستائش کو دیکھا جو بارگردد سے بے پروا ہو کر ارمغان کا معاملہ کر رہی تھی جو کہ

گرے ڈریس پنٹ اور بلیک شرٹ پہنے ہوئے تھا پھر بولے ”مجھے منظور ہے“ ان کے کنبھ میں

چٹانوں کی سی سختی تھی انہیں ستائش کی اس بات پر بالکل یقین نہیں آیا تھا کہ وہ ”ان سب کو نہیں جانتی“

”لیکن دادا جان کوئی میری بات تو سنے“ ناشی بڑی بات سن کر گویا ارمغان کے ساکت ہوئے جسم

میں حرکت ہوئی اور اس نے مقابل سے نگر لینے کا سوچا۔

”ارمغان تم مجھے یہ بتاؤ۔ کہ تم مجھے کہاں کہاں اور کتنا شرمندہ کرو گے۔ مجھے تمہاری وجہ سے اور کتنی

باتیں سننی پڑیں گی مگر اب نہیں اب اور سن مانی بالکل نہیں۔ اب اگر ہماری بات نہ مانی تو کبھی ہماری شکل

مت دیکھنا اور نہ اپنی شکل دکھانا چلے جاؤ واپس نہ آنا اور ہاں اگر ہمیں کچھ سمجھتے ہو تو اب ہم کل پلیس گئے

نکاح پڑیں تم سے دوبارہ اس موضوع پر بالکل بات نہیں کرنے والا سمجھتے تم۔“

”لیکن دادا جان میرا قصور کیا ہے۔“

اور دادا جان کے تو مانو آنکھوں سے خون نکل آیا

مگر بولے تو صرف اتنا ”تمہارا قصور تمہارا قصور یہ ہے کہ تم۔۔۔ تم الو کے چھٹے ہو۔“

ستائش کو دادا جان کے اس جواب پر اتنی زور سے ہنسی آئی کہ سب ہی اس کی طرف متوجہ ہو گئے وہ کھسیانی ہو گئی۔

اورنگ زیب بولے ”ستائش تم باہر گاڑی میں میرا ویٹ کر دیں آتا ہوں“ وہ چلی گئی تو انہوں نے

آگے بڑھ کر دادا جان کا ہاتھ تھام کر اپنا فیصلہ سنایا کہ رات آٹھ بجے آپ لوگوں کا انتظار کروں گا اور پھر فون نمبر اور ایڈریس دے کر روانہ ہو گئے۔

معجز جو اس سارے وقت میں گاڑی کے ہونٹ سے ٹیک لگا کر بڑے مطمئن انداز میں کھڑا معاملہ کی

تہ تک جانے کی کوشش کر رہا تھا سیدھا ہوا اور فون نکال کر نمبر پر لیں کرنے لگا۔

”میں نہیں پہنچ پاؤں گا میٹنگ کیمنٹل کر دو“ اور فون بند کر کے بولا ”فلائٹ تو جا چکی اب اس

ارمغان کی شادی میں شرکت تو بنتی ہے نا“

اس کی بات سن کر ارمغان نے زور سے پاؤں زمین پر مارا اور بولا ”مائی فٹ“ اور اندر چلا گیا۔

معجز نے کندھے اچکا گئے اور دادا جان اور بی جان کو لے کر اندر چلا گیا۔

☆ ☆ ☆ اورنگ زیب ستائش کو لے کر گھر آئے تو فوراً

شیم بیگم کو کمرے میں آنے کا کہا جو ستائش کی ٹھیک ٹھاک کلاس لینا چاہتی تھیں محض گھور کر بھائی کے

کمرے میں چلی گئیں۔

”خیریت بھائی صاحب کیا ہوا؟“ اورنگ زیب بولے۔ ”میں نے کل ستائش کا نکاح طے کر دیا

ہے جن چیزوں کی ضرورت ہے بتاؤ میں منگوا دوں گا۔“

”لیکن بھائی کہاں کن لوگوں سے اس طرح یوں اچانک سب خیریت تو ہے نا۔“

”وہ۔۔۔ ہے ایک لڑکا۔“ اور ساری بات بہن کو بتا دی۔

”وہ پریشانی سے بولیں“ بھائی آپ نے فیملی کے متعلق کوئی معلومات نہیں دیں اور لڑکا اس کے بارے میں بھی تحقیق نہیں کی پھر اسی جلدی۔“

”بس۔۔۔“ اورنگ زیب نے غصہ کو ضبط کرتے ہوئے کہا جو میں نے کہہ دیا ہے وہ کرو دیے میں نے ستائش کی آنکھوں میں پسندیدگی دیکھی ہے اور میں اچھی طرح جانتا ہوں جب اولاد ہاتھ سے نکل جائے تو وہ ہی کرو جو وہ چاہتی ہے ورنہ وہ دوسرا راستہ اختیار کر لیتی ہے جو زیادہ تکلیف دہ ہے اور مجھ سے زیادہ اس بات کو کون جانتا ہوگا اور رہی بات فیملی کی تو میں نے تحقیق کر دلی ہے وہ لوگ اچھے اور شریف لوگ ہیں۔“

شیم بیگم نے بچھے دل سے کہا ”ٹھیک ہے اگر آپ مطمئن ہیں تو۔۔۔۔۔“

ستائش جب سے واپس آئی تھی مسلسل رورہی تھی انزلہ نے بہت بار پوچھا مگر وہ کچھ بتانے کی پوزیشن میں نہیں تھی۔

”انزلہ!“

”جی امی!“

”ٹیپو کو کال ملاؤ“ وہ موبائل ہاتھ میں لے کر آئیں ”اور اسے بھی ستائش کی شادی میں انوائٹ کرلو“ اور انہوں نے طحڑے ستائش کو دیکھا جو شرم سے پانی پانی ہو گئی اور آہستہ سے بولی۔ ”چھوٹی سی خواہش۔۔۔۔۔ کٹارے کھانے کی اتنی بڑی سزا۔“ اس کی سرگوشی صرف انزلہ ہی سن سکی۔ البتہ اس نے نمبر ملا کر امی کو دیا اور وہ فون لے کر باہر چلی گئیں ادھر اس نے ستائش سے ساری کہانی سنی اور تصور میں اس ہیرو کو دیکھنے لگی جو اپنی صفائی بھی نہ دے سکا۔

☆☆☆

شیم بیگم اور اورنگ زیب دو ہی بہن بھائی تھے۔ گھر میں بیٹے کی کوئی فروانی نہ تھی۔ والد ایک دکان چلاتے تھے مگر اس غربت میں بھی اورنگ زیب کو اچھی تعلیم دلوائی۔ والد کا انتقال ہو گیا تو اورنگ زیب والدہ اور بہن کو لے کر شہر آگئے یہاں پولیس کی

نوکری مل گئی اور جلد ہی ترقی کی منازل طے کرنے لگے۔ ایک دوست سے بہن کی شادی کر دی۔ شادی کے چھ ماہ بعد ماں بھی وفات پا گئیں۔ اب بہن کو بہت دکھ ہوا کہ بھائی گھر میں اکیلے ہوتے ہیں لہذا ان پر دباؤ ڈالا کہ وہ بھی اب شادی کر لیں۔

اورنگ زیب بہن کے گھر جاتے آتے نہ جانے کب خیالوں میں اس کی زندگی سے محبت کر بیٹھے سو فوراً اس کا نام لے لیا، بہن تو نہال ہی ہو گئی کہ چاندی اپنی زندگی تو اسے بھی بہت پسند تھی اور جلد ہی رشتے کی بات چلائی مبارک صاحب (شیم کے شوہر) ان کے ساتھ تھے سوداگرہ کو بھی منالیا یوں منالیا رخصت ہو کر اورنگ زیب کے گھر کی مہارانی بن گئی لیکن شادی کے بعد جہاں اورنگ زیب بہت مطمئن ہوئے وہاں منالیا بولا کی سی رہتی تھی۔

ایک دن منالیا فون پر اپنی کسی سہیلی سے بات کر رہی تھی کہ اورنگ زیب نے سن لیا کہ وہ اپنی زندگی سے خوش نہیں تھی کیونکہ اورنگ زیب اس کی چاہت نہیں تھے اور جو چاہت تھا وہ خود مجبور ہو کر دوسری جگہ شادی کر چکا تھا۔ لہذا وہ سمجھوتے کی زندگی گزار رہی تھی تب اورنگ زیب کو اس کے گریز اور ہر کام میں عدم دلچسپی کی اصل وجہ سمجھ آئی مگر وہ اس وقت رشتوں کی ان زنجیروں میں بندھ چکے تھے کہ کوئی فیصلہ کرنا گویا سر جانے سے زیادہ مشکل تھا جبکہ منالیا کے رویے کو وہ اس بات پر محمول کرتے رہے کہ کم عمر بھی ہے اور پہلی بار ماں بننے جارہی ہے سو پریشان ہے لیکن اس کے بعد اصل پریشانی والی زندگی کی ابتدا ہوئی۔ اورنگ زیب اس کا خیال تو رکھتے تھے مگر اس کے اپنی دوست کو کہہ کلمات کہ پہلی محبت بھی بھولی نہیں جاسکتی۔ انہیں کسی طور پرچیں نہیں لینے دیتے تھے سو ان اسی طرح گزرتے رہے۔

ایک دن منالیا ایک پیاری سی گڑیا اورنگ زیب کو دے کر خود دنیا سے رخصت ہو گئی۔ تم اورنگ زیب کی شدید لہر نے کچھ عرصہ اہل خانہ کو اپنی پیٹ میں لیے رکھا پھر ستائش کی چیخوں نے سب کو اپنی طرف متوجہ کیا ستائش کو لے کر شیم بیگم اپنے سسرال چلی

گئیں جبکہ اس وقت ان کی اپنی بیٹی انزلہ بھی چھ ماہ کی تھی مگر ساس نے ساتھ دیا اور انہوں نے دونوں پر مینا پنچھا ور کی۔

ادھر اورنگ زیب نے تہا زندگی گزارنے کا فیصلہ کر لیا کیونکہ پہلی شادی کا تجربہ کوئی اچھا نہیں تھا کہ وہ دوبارہ اس عمل سے گزرتے۔ شیم بیگم کے پاس ستائش کو گھسے چھ سال ہو گئے تو ان کے ہاں بیٹا پیدا ہوا اور جب بیٹو چوٹی جماعت میں تھا تو مبارک صاحب پولیس مقابلے میں گولی لگنے سے ہلاک ہو گئے یوں ستائش انزلہ اور ٹیپو کو لے کر شیم بیگم دوبارہ بھائی کے گھر آئیں اور اب یہاں پر آئے بھی انہیں دس سال ہو چکے تھے۔ ستائش اور انزلہ ایم اے کر کے آج کل فارغ التحصیل جبکہ ٹیپو ایس سی کا طالب علم تھا اور ہاسٹل میں رہتا تھا۔

☆☆☆

سید نعمان شاہ کے دو بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔ بڑے بیٹے ابرار شاہ تھے جو ملک سے باہر پڑھنے کی غرض سے گئے تھے پھر وہاں پر ہی شادی کر لی۔ بیٹھنی مل گئی بعد میں کاروبار کیا اور وہ بھی خوب جہا پھر جلد ہی صاحب اولاد ہو گئے کہ ارمان نے زندگی کی تمام خوشیاں ان کی جھولی میں ڈال دیں لیکن ساتھ ہی روزی کی بدلتی عادات بھی سامنے آنے لگیں۔

وہ ارمان کو بوجھ سمجھتی تھی اپنی آزادی میں رکاوٹ، سو معمولی جھگڑے ہونے لگے اور پھر روزی دوبارہ پہلے والی زندگی میں لوٹ گئی۔ ابرار صاحب کے پاس سوائے صبر کے اب کوئی چارہ نہ تھا کہ گھر والے پہلے ہی روزی سے شادی والی بات پر سخت ناراض تھے بس بی بی جان بات کر کے حال احوال معلوم کرتیں پھر دادا جان ان سے بھانے سے خیریت پوچھ لیتے مگر خود بات کرنے پر راضی نہ ہوتے وہ روزی کو ابرار نے غیر ملکی اور غیر منظم لڑکی سے نکاح کر لیا اگرچہ نکل نکاح ان کو کلمہ پڑھایا مگر باقی تقاضے پورے کرنے سے روزی عاجز بنی رہی۔

بی جان ہر مہینے ابرار سے بات کرتیں۔ پہلے وہ

بہت مطمئن تھے مگر اب اکثر فون پر بی جان سے روزی کی شکایت اور اپنی غلطی کا اعتراف کرتے تھے پھر ایک روز ابرار نے فون کیا اور روتے ہوئے خبر دی کہ روزی کو کیسے ہو چکا ہے جو کہ بالکل آخری حدوں تک پہنچ چکا ہے پھر جلد ہی فوت ہونے کی خبر بھی آ گئی۔

ابرار ارمان کو ساتھ لگا کر بہت روئے لیکن پاکستان واپس آنے کا فیصلہ پھر بھی نہ کر سکے۔ اس وقت ارمان چھ سال کا تھا حالانکہ بی جان اور بابا جان نے بہت منت کی لیکن وہ طبیعت کے شروع ہی سے ضدی تھے سو ابرار نے ارمان کو تنہا ہی پالا اور دوبارہ شادی نہ کی۔

اس کے بعد نعمان شاہ کی بیٹی تھی جو ابرار سے چھوٹی تھی اور اس کی شادی سید فرقان شاہ کے چھوٹے بیٹے افتخار سے ہوئی جو کہ ایک ملٹی میٹل کمپنی کی طرف سے لندن میں متیم تھے مگر شادی کے وقت شرط یہ رہی کہ وہ بھی ان کی بی بی کو ساتھ لندن نہیں لے کر جائیں گے۔ لہذا ایسا ہی ہوا چونکہ دونوں بھائیوں کے گھر ساتھ ساتھ تھے اس طرح بی جان کی بیٹی شادی کے بعد چچا کے گھر گئی تھی سو ان کی نظروں کے سامنے ہی رہی اور اپنے گھر میں یہاں زیادہ پائی جاتی تھی ان کی ایک بیٹی تھی نمرہ اور اس کے سات سال بعد عبدالباری ہوا تھا۔

اور سب سے چھوٹے نثار شاہ کی شادی نعمان شاہ کے دوست کی بیٹی سے ہوئی جس کے تین بچے تھے۔ دو لڑکیاں اور ایک لڑکا۔ ڈالے بڑی پھر معیر اور چھوٹی صبا بھی۔ ڈالے ابھی ایف اے کی اسٹوڈنٹ تھی جب ان کے گھر میں قیامت ٹوٹی کہ نثار شاہ کاروبار کی غرض سے بیرون ملک گئے اور جہاز خرابی کے باعث گرے کتا ہو گیا۔ ملائکہ نے ٹار کے جانے کے دکھ کو بہت زیادہ لیا اور کتنے ہی دن اسپتال میں داخل رہیں جبکہ دادا جان نے اپنے پیارے بیٹے کی تدفین محض چند چیزوں کی شناخت سے کر دی۔

بی جان نے بیٹے کی موت کا بہت صدمہ لیا پھر حقیقت کو قبول کرتے ہوئے خود کو سنبھالا اور بچوں کو

بھی بھلایا۔ دادا جان نے بڑے حوصلے سے گرتے کاروباری لگا میں تھا میں اور کسبیتہ ہو گئے چونکہ ان کی امیدیں اب معجز سے وابستہ تھیں کہ کب وہ بڑا ہوگا اور اس کاروبار کو سنبھالے گا جس کو اس کے والد نے اندرون اور بیرون ملک پھیلا دیا تھا۔

وقت کا کام ہے گزر جانا اچھا ہو یا برا۔ بچے بڑے ہو گئے اور بوڑھے مزید بوڑھے ہو گئے۔ معجز بھی آج کل کاروبار میں دلچسپی ظاہر کر رہا تھا اور دادا جان تھا کان اتار رہے تھے کہ پچھو جان نے نمبرہ کی شادی کی تیاری کر لی اور ابرا صاحب کو بہت تاکید کی آنے کی بڑی بات تو یہ کہ ابرا صاحب مان بھی گئے بلکہ بی جان کو فون پر کہہ دیا میں سارا کاروبار سنبھال کر رہا ہوں اور ایک گھر بھی خرید لیا ہے اب میں اور ارمغان مستقل پاکستان رہیں گے۔ میں نہیں چاہتا کہ جوانی میں جو غلطی میں نے کی تھی وہ بتی ارمغان بھی کرے کیونکہ وہ بالکل میرا ایکس ہے اور بی جان مسکرانے لگیں کہ ان کا بیٹا آ رہا تھا مگر شاید رب کائنات کو یہ منظور نہ تھا کیونکہ نمبرہ کی شادی سے شخص چھ ہفتے قبل حرکت قلب بند ہونے کی وجہ سے وہ خالق حقیقی سے جا ملے۔ بی جان اور دادا جان بے حال ہو گئے۔ ملائکہ بھی ایک کو دلا سے دیتی تو کبھی دوسرے کو دیتے لیکن جب ارمغان ابرا کی ڈیڈ باڈی لے کر پاکستان پہنچے جو کہ ابرا کی وصیت تھی تو جیج ارمغان کو دیکھ کر سارا خاندان ہی حیران ہو گیا۔

وہ مغربی اور مشرقی حسن کا احتراج تھا۔ شہزادوں کی سی آن بان والا ارمغان دادا اور دادی کی آنکھوں کا تاراج بن گیا۔ وہ اس میں ابرا کی شبیہ ڈھونڈنے لگے اور دل کو پچھ سکون میسر آنے لگا۔ جبکہ معجز ڈالے اور صہ بالکل خاموش تھے کہ بتایا سے کوئی انتقامی لگاؤ نہ بن پایا تھا شاید بچے اس سے بڑے عم برداشت کر چکے تھے۔

ارمغان نے والد کی ساری رسومات ادا کیں اور وکیل سے مل کر معلوم ہوا کہ بابا نے یہاں پر کوئی بنگلہ لیا تھا ارمغان کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی لہذا

اس نے واپس امریکہ جانے کو ترجیح دی لیکن اس وعدہ کے ساتھ کہ وہ نمبرہ آئی کی شادی میں ضرور آئے گا اس عرصے میں اس کی معجز سے کافی دوستی ہو گئی تھی اور وہ کاروباری معاملات میں بھی بات کرتے رہتے تھے۔ پھر ارمغان پاکستان آتا جاتا رہتا تھا لیکن دادا جان اور بی جان کی خواہش تھی کہ وہ اچھی سی لڑکی دیکھ کر اس کی شادی پاکستان میں کر دیں تاکہ وہ پاکستان میں مستقل ٹھکانہ بنالے اسی کوشش میں چھ سال کا عرصہ گزر گیا۔

نمبرہ دو بچوں کی ماں بن گئی اور ڈالے کی شادی طے ہو گئی جو کہ عبدالباری سے ہونا تھی سو بہت خوشی کا دن تھا اور اس خوشی میں ارمغان غیر حاضر تھا جبکہ معجز اس کو دھکی بھی دے چکا تھا کہ اگر وہ اس گھر کی پہلی شادی میں نہ آیا تو آئندہ کسی بھی شادی میں آنے کی ضرورت نہیں ہے۔ صبا آج کل میڈیکل کے فاضل لیسر کی طالبہ تھی۔

ڈالے کے نکاح کے دن ارمغان نے سب کو سر پرانز دیا اور وہ آگیا لیکن اکیلے نہیں بلکہ ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے بدلیسی جینے جیسی فرمائے کے ساتھ اور اس کے مختصر لباس اور ہر ایک سے ہاتھ ملا کر گلے لگنے والی ادھر پر جہاں بہت سے لوگ دلچسپی سے اسے دیکھ رہے تھے وہیں پر دادا جان اور دادی جان پورے خاندان سے نظریں نہ ملا سکے۔ ان کے تو اس کی حرکتیں دیکھ کر پسینے ہی چھوٹ گئے بس پھر تو سارے خاندان والے سیدوں کے بیٹے کے کارنامے خوب نمک مرچ لگا کر دو ماہ تک یاد کرتے رہے اور اس کے بعد جو سلوک بی جان نے جیسی کے ساتھ کیا وہ اب تک ارمغان نہیں بھولا تھا ایک تو بی جان کو یہ عم کہ ابرا سے کبھی جدائی کی وجہ بھی اس کی تو مسلم بیوی تھی اور عمر کے بعد اس شرمندگی سے نہ ملا کہ والدین کی بات نہ مان کر اب اپنی انجری حالت میں کود کھا کر غمگین نہ کروں اور اب ارمغان بھی بالکل ابرا کے نقش قدم پر چل پڑا ہے بس پھر دادا جان اور بی جان نے مشترکہ پلان بنایا جیسی فرمائے کو رو رو کہ بتایا کہ

ابرا نے معصوم روزی پر کیسے ظلم ڈھائے۔

دادی جان روزی کے لیے اس قدر روئیں کہ اگر روزی خود ہوتی تو ایک بار دوبارہ مر جاتی بی جان نے بتایا کہ کیسے ابرا نے اس کو قید کر کے رکھا اور اسے ظلم۔ وہ تو شکر گزار تھی کہ کینسر ہو گیا اور مر گئی بس پھر کیا تھا جیسی تو دیے بھی ارمغان سے کم اور اس کی دولت سے زیادہ محبت کرتی تھی اٹنے پاؤں بھاگی امریکہ اور ارمغان پر نشان کہ جیسی کو کیا ہو گیا کوئی رابطہ نہیں پھر ایک دن خاندان نے ساری بات ارمغان کو بتادی۔ پھر تو ارمغان بی جان سے اکھڑا سار پتا تھا کہ بی جان نے میری خواہش کا احترام نہیں کیا اور یہ ناراضی وقت کے ساتھ مزید بڑھتی گئی بس یہ ہی وجہ تھی کہ اس قدر حسین اور انجلیکس ارمغان صاحب اب تک کنوارے گھوم رہے تھے۔

پھر دادا جان نے ارمغان کو معجز اور منظم کے ذریعے پاکستان میں بزنس کرنے پر آمادہ کیا۔ منظم دراصل دادا جان کے بہت ہی عزیز دوست کا پوتا تھا اور بہت سلجھا ہوا لڑکا تھا۔ دادا جان نے خاموشی سے اس کو ارمغان کی جاسوسی پر لگا دیا تھا اب اگر ارمغان امریکہ تو منظم ساتھ ارمغان پاکستان تو وہ بھی پاکستان میں ہوتا تھا اور پھر اس کی ہر حرکت کی خبر روزانہ دادا جان کو دیتا نہ بھولتا تھا، لہذا معجز ارمغان اور منظم ان کے بزنس کے بڑے ستون تھے بزنس امریکہ اور پاکستان میں پھیلا تھا دادا جان نے سوچ رکھا تھا کہ کسی طرح اس کی شادی بھی پاکستان میں ہو جائے لیکن ارمغان ہاتھ نہیں آ رہا تھا۔

مستاکش کو دیکھ کر دادا جان نے فوراً منصوبہ بنایا اور ارمغان کو ٹیکل ڈال دی۔

سوا ب سب اہل خانہ کو باخبر کر دیا تھا جو سب لاؤنج میں ارمغان کو موضوع بنائے بیٹھے تھے ڈالے بھی آنجلی تھی اور صہ بھی جو کہ نمبرہ سے اس واقعہ کی مکمل تفصیل سن رہے تھے ارارمغان کے چھپرے رستم ہونے اور لڑکی کو بچکانے کے قصے کو خوب نمک مرچ لگا کر سنارہی تھی جبکہ معجز اس قصے کو اس طرح غور سے سن رہا تھا۔

تھا جیسے بالکل نئی بات ہو۔

”ہیلو ابوری بڈی“ منظم کی آواز پر ہنسی صہ کو فوراً بریک لگا جس کو فوراً منظم نے محسوس کیا۔

ڈالے فوراً بولی ”ہاں تو جناب آپ اس کارنامے میں کس قدر حصہ دار ہیں۔“

منظم گھبرا کر بولا ”یقین مانیں لیڈریز یہ کارنامہ ارمغان شاہ نے اکیلے سرانجام دیا ہے لیکن سنا ہے بھابھی ہیں بہت خوب صورت اور بالکل معصوم سی لیکن پھر بھی میں حیران ہوں میں تو اس کو مستقل نوٹ کر رہا تھا معلوم نہیں یہ لڑکی کہاں سے نکل آئی۔“

”نکل آئی کہ نکلی گئی بے چاری نمبرہ نے کہا۔“

”ارے نہیں نمبرہ آئی! میرے خیال میں کچھ غلط ہے جو ہم سمجھ نہیں پا رہے۔“

”اچھا چلو تم سب نکاح کی تیاری کرو اپنے چھوٹے سے دامع پر زور مت ڈالو۔“ اسنے میں ملائکہ سب کے لیے چائے اور ساتھ ہی خاندانی زیورات کے ڈبے لیے حاضر ہو گئی اور بات کا رخ بدل گیا۔

☆☆☆

منظم، معجز کو لے کر دادا جان کے کمرے کی طرف چلا گیا۔ دادا جان پہلے ہی منتظر تھے وہ شادی کے سارے انتظامات کی تفصیل بتانے لگے وہ چاہتے تھے۔ شادی ارمغان کی شان کے مطابق ہی ہو سکو سب اہل خانہ کو متحرک کر رکھا تھا۔ تمام لڑکیاں تیاری کر کے شاپنگ کے لیے روانہ ہو گئیں کہ وہاں کا جوڑا ہی لینا تھا، منظم کو ارمغان کی کال آگئی کہ وہ ریٹائرمنٹ میں اس کا انتقال کر رہا ہے سو وہ اور معجز بھی دادا جان کی باتیں خوب اچھی طرح سمجھ کر روانہ ہو گئے۔ ارمغان معجز اور منظم ڈنر کر رہے تھے اور ارمغان ساتھ اپنا قصہ نکال رہا تھا۔

”اف ایسی ہوتی شکل کی لڑکی میں خواب میں بھی اسے نہ دیکھوں اور میں یعنی سید ارمغان شاہ اس کو بچکا کر کے جھنجھلا کر فوراً کی صفحہ کی“ مطلب اغوا کر کے لے جا رہا تھا؟“ معجز کافی غور سے اس

بزدلی شخص کو دیکھ رہا تھا جو اچھی خاصی خوب صورت لڑکی کے بارے میں ایسے ارشادات فرما رہا تھا کہ اگر وہ خود سن لیتی تو لازماً اس کا سر اس پلیٹ جس میں رکھا تاکہ کھائے جانے کا منتظر تھا مار کر پھاڑ دیتی پھر بولا۔
”وہی ہے یار ارمغان وہ لڑکی تمہاری گاڑی میں آئی کیسے؟“

”یہ ہی تو سوچ سوچ کر میرا سر پھٹا جا رہا ہے کہ وہ میری گاڑی میں کیسے آئی جبکہ میں نے گاڑی کہیں روکی بھی نہیں میں آفس سے نکل کر شاہ چلیں گیا وہاں سے جا کر بنگلہ دیکھا اور پھر شاہ چلیں گیا معلوم نہیں۔ او یاں منتظم یہ کہیں کوئی بھوتی تو نہیں جو مجھ پر عاشق ہوئی ہو۔“

”ہاں! بالکل اور پھر اس بھوتی کا باپ بھی ڈی ایس بی نکل آیا۔ منتظم نے چل کر جواب دیا۔
”بس میری قسمت ہی خراب ہے۔ اب دادا جان کو کون سمجھائے۔“ پھر بڑی دلیری سے بولا، تم دیکھنا منتظم اگر یہ نکاح ہو گیا تو اس کا انجام بہت عبرت ناک ہوگا۔“

”کس کے لیے تمہارے لیے یا تمہاری سسر کے لیے؟“ منتظم نے پوچھا۔
”واٹ کیا کہا؟ سید ارمغان شاہ کی سسر مائی فٹ۔“
”تم نہ مانو تو کیا ہے مگر کل اس وقت تک سب لوگ اسے تمہاری سسر ہی نہیں گے۔ اب یہ اور بات ہے تم کسی کو دعوت نہ دو۔ ویسے مجھے تو دادا جان نے دعوت دے دی ہے۔“

”بھائو میں جاؤ تم اور تمہاری دعوت اور شادی۔ مجھے ان سب سے کوئی مطلب نہیں ہے۔ ارمغان چلا اٹھا۔“

☆☆☆

ستائش کی ساری رودادیں کہ انزلہ لوٹ بوٹ ہو گئی اس کی ہسی رکسنے کا نام نہیں لے رہی تھی بمشکل سانس لے کر بولی ”یقین کرو نیچو! بالکل ٹھیک کہتا ہے۔ آزمائش ہو تم اب دیکھو کیا نام بتایا تم نے اس لڑکے کا؟“

ستائش نے گھور کر کہا ”ارمغان۔“
”ہاں ارمغان! اس کو آزمائش میں ڈال دیا۔“
ستائش سجدگی سے انزلہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ”انزلہ کی سیر لیں مجھے ڈاؤٹ ہے کہ وہ شخص ہائے کریکٹر کلیر نہیں ہے۔ اس کے سب گھر والے اس کے بارے میں عجیب رائے دے رہے تھے اور اس کی بات کسی نے بھی نہیں سنی۔ ہاں وہاں پر ایک اور لڑکا تھا معلوم نہیں اس کا ارمغان سے کیا رشتہ تھا مگر مجھے وہ بہت نرم دل لگا۔ میرا دل چاہتا ہے کہ اس سے کسی طرح رابطہ کر دوں اور اس کے ذریعے دادا جان کو پیغام دوں کہ ہم بھی اس کو ارض پر پہلے نہیں ملے وہ تو اس ارمغان سے اتنے ناراض ہو رہے تھے۔ ہمارا لحاظ تھا۔ بعد میں جوتے سے ضرور اس کی پٹائی کی ہوگی۔ حالانکہ وہ بالکل بے قصور ہے۔“

”دیکھو ستائش! پلیز اب ایسا کچھ مت کرنا اب ان باتوں کا بالکل وقت نہیں ہے ماموں جان کو تم اچھی طرح جانتی ہو اور ای کو بھی۔ وہ تو پہلے ہی ہماری حرکتوں سے مشکوک رہتی تھیں پھر تصدیق اس واقعہ نے کر دی وہ تو مجھ سے بھی بات نہیں کر رہی ہیں۔“
انزلہ نے کہا۔

ستائش نے کہا ”ویسے اگر پتا ہوتا تو میں کبھی بھی دیوار نہ بچھلاتی۔“
انزلہ بولی ”لو ہم نے کوئی گناہ توڑی کیا تھا یا رزق ضائع ہو رہا تھا۔ ہم نے سوچا چلو ہم ہی استفادہ کریں۔ اس میں کیا برائی ہے۔“ دونوں ہنسنے لگیں۔
”ویسے انزلہ وہ ارمغان تھا بہت حسین میں تو بالکل اس کی ماسی لگ رہی تھی لیکن مجھے اس کی خاموشی بہت کھٹک رہی ہے۔“ ستائش نے کہا۔

”چلو اب سو جاؤ اتنا سوچو گی تو مزید پریشان ہوگی تم اللہ پر چھوڑ دو۔“ انزلہ نے کہا۔
اسی وقت دھماکے سے دروازہ کھول کر نیچو اندر داخل ہوا اور بولا۔
”ہاں بھئی آزمائش اور زلزلے نے ہمارے گھر کی بنیاد تو ہلا دی تھی مگر سنا ہے ہمارے ہمسائے بھی

اس سے محفوظ نہیں رہ سکے۔“
وہ دونوں بستر سے نکل کر نیچو کے پیچھے لگیں جو نکاح میں شامل ہونے آیا تھا۔ سید حامی کے کمرے میں جا کر سانس لیا۔

☆☆☆

اگلے دن تمام اہل خانہ کافی مصروف تھے پھوپھو دولہا اور تمام اہل خانہ کے تحائف خریدنے انزلہ کو لے کر مارکیٹ چلی گئیں۔ نیچو بھی اورنگ زیب کے ساتھ مل کر گھر کی ڈیکوریشن کروانا رہا کہ شام کو فکشن لائن میں ہونا طے پایا تھا۔ پھوپھو اور انزلہ گھر پہنچے ہی تھے کہ ایک گاڑی میز ڈرائیور نکاح کے محل سامان اور صبا کے ساتھ پہنچ گئی۔ صبا ستائش کو دیکھ کر حیران ہو گئی اور بہت اپنائیت سے ملی اور پھر ستائش کو لے کر پار پار چلی گئی۔

☆☆☆

”ای معلوم نہیں پھولوں کی پلیٹیں کہاں غائب ہو گئی ہیں دولہا والے گاڑیوں سے باہر آگئے مگر پھول غائب ہیں۔“ اسے میں نیچو نے جلدی سے لا کر پھولوں کی ساری پلیٹیں انزلہ کو دیں۔ انزلہ اپنی فراک بڑا دوپٹا اور چڑیوں مچروں سے مزین ہاتھ اور بال سنہا پٹی پلیٹیں لے کر جلدی سے باہر بھاگی کہ مٹھائیوں کے ٹوکے رکھنے کے اندر آتے معیز سے اس زور سے مکاری کہ سارے پھول اچھل کر دونوں کے اوپر گر گئے اور انزلہ سیدی معیز کے قدموں میں سجدہ ریز ہو گئی۔

”ماشاء اللہ بھابھی کے گھر پر استقبال تو بڑا شان دار ہوا ہے پیچھے سے آتے منتظم نے معیز کی بات پر زور دار توجہ لگایا۔ انزلہ اٹھی اور گھور کر معیز کو دیکھتی ایک طرف سے باہر چلی گئی جبکہ معیز دل پر ہاتھ رکھ کر مرکز منتظم سے بولا ”ہائے ظالم نکالیں۔“ منتظم اس کی حرکت پر مسکرا کر اندر چلا گیا۔

تھوڑی دیر میں ستائش کے آنے کا شور بلند ہو گیا۔ انزلہ اور صبا اس کو لے کر کمرے میں چلی گئیں

پھر نکاح ہوا اور اس کے بعد ستائش کو باہر لے جا کر ارمغان کے پہلو میں بٹھایا گیا، ستائش اگر حسین لگ رہی تھی تو ارمغان حسین تر لگ رہا تھا۔ ارمغان نے بلیک کٹر کا تھری چین پہن رکھا تھا جس کا گلا خروانی اسٹائل میں تھا اور رین اور سامنے کی پٹی گولڈن مکر کے کام سے مزین تھی جو اس کی سرخ سفید رنگت پر خوب جگ رہا تھا، جبکہ ستائش پنک اور گولڈن ساتھ فون مکر کی کام والی فراک میں کوئی ایسا ہی لگ رہی تھی۔ وہ دونوں ساتھ بیٹھے بہت خوب صورت لگ رہے تھے۔ بی جان فوراً آگے آئیں اور ان دونوں کا صدقہ اتارا۔

منتظم حیرت کی گہرائیوں سے کنارے پر آیا اور بولا ”ارمغان تمہاری آئی سائٹ کب دیک ہوئی تم اسی لڑکی اغوا کر کے لائے تھے یا کوئی اور تھی؟ اس سرگوشی پر ستائش نے فوراً نظر اٹھا کر اوپر دیکھا اور ارمغان اور منتظم کی نگاہیں خود پر پار فوراً ہی نظر جھکا لی۔

ارمغان جواب تک بیڑا سا بٹھاتا تھا اس کی جھکی نظریں دیکھ کر حیران ہو گیا وہ واقعی کل کی نسبت آج بہت پیاری لگ رہی تھی اور مغرب کی پیداوار ارمغان نے شرمانے کے لیے اندازہ بک دیکھے تھے۔

تب ہی تو نوٹیشن شروع ہوا تو نوگر افروہن کے مختلف پوز لے رہا تھا لہذا ارمغان منتظم کو ساتھ لے کر اورنگ زیب کی طرف بڑھ گیا۔ اور اس کی نئی فرمائش نے سب کو ہلا کر رکھ دیا۔ ”انگل مجھے چند دنوں میں امریکہ جانا ہے اور وہاں مجھے سات آٹھ ماہ لگ جائیں گے میں چاہتا ہوں کہ آپ آج ہی رخصتی بھی کر دیں۔“

اس نئی فرمائش پر بی جان سر پکڑ کر اٹھ کھڑی ہوئیں اور منتظم حیران نظروں سے ارمغان کو دیکھتے ہوئے بولا۔

”ارمغان! یقیناً کچھ ضرور دال میں کالا ہے تو اس لڑکی یعنی میرا مطلب ہے بھابھی کے پیار میں گوڈے گوڈے غرق ہے۔“ ارمغان نے منتظم کا ہاتھ پکڑا اور ایک طرف لے کر آیا۔

اب سب لوگ پھوپھو چچی دادا جان بی جان نمرہ آئی اور ڈالے شیم بیکم اور رنگ زرب کو قائل کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

”اس لڑکی نے میرا تماشا بنا دیا ہے سب کہہ رہے ہیں شادی مبارک۔ مائی فٹ یونو یہ خود ہمیں اپنے منہ سے اپنی بربادی کی کہانیاں سنائے گی جو میں اس کے نصیب میں لکھ دوں گا۔ یہ جھٹکتی بھی اس آگ کو بجھانے کے لیے ہے جو کل سے میرے اندر جل رہی ہے۔ تم دیکھنا میں اس کے ساتھ کیا سلوک کروں گا۔“ ارمنان نے کہا۔

منظم بین پر بہت پریشان ہو گیا وہ ارمنان کی جذباتیت سے اچھی طرح واقف تھا مگر اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ وہ ستائش کے تمام حقوق اپنے نام کروا چکا تھا۔ لہذا سب بڑوں کے متفقہ فیصلے پر جھٹکتی کا فیصلہ کیا گیا انزلہ اور ستائش مل کر خوب ہی روئیں اور ارمنان یوں ہی اس حرکت پر غصہ ہوتا رہا پھر بابا اور پھوپھو نے بھی بڑی دل گرفتگی سے اس کو الوداع کیا۔

☆☆☆

نمرہ اور ڈالے اس کو ارمنان کے کمرے میں بٹھا کر چلی گئیں۔ وہ بہت کشادہ کمرہ تھا۔ لکڑی سامان سے بھرا ہوا تھا ہر چیز سے مالک کا ذوق اور پسیمائیاں تھا۔ سارے کمرے کا جائزہ لیتے ستائش کی نظر ایک تصویر پر پڑی درمیان میں ارمنان اور اس کے دائیں بائیں اس کے مئی پاپا تھے اودہ تو ارمنان کی ممانعت کی تھی۔ اسی لیے اس میں ان لوگوں کی مشابہت ہے۔ اتنے میں دروازہ کھلنے کی آواز پر فوراً نظر جھکا گئی۔

ارمنان نے اس کی مصیبت اور ہوش اڑانے والے حسن کدول سے تسلیم کیا لیکن سخت آواز میں بولا۔

”دیکھو تم نے جو بھی کیا وہ تمہاری مجھ تک آنے کی پلاننگ تھی مگر میں کوئی ٹاسک نہیں ہوں۔ تم ہمیشہ میری جوتی کے مقام پر رہو گی سواں سے اوپر آنے کی کوشش بھی مت کرنا اور اس خوب صورتی کے داؤد مجھ پر مت چلانا کہ یہ بالکل بے کار ہوں گے۔ ہاں

البتہ۔“ پھر ہاتھ سے اس کی ٹھوڑی سے چہرہ اوپر کیا اور بولا۔ ”میں تم سے تم کو چھین لوں گا تب نہیں اندازہ ہوگا کہ ایک مرد کی اتنا اور غیرت سے کھیلنے کا انجام ہوتا کیا ہے۔ تم نے کیا سمجھا کہ دادا جان کی بات مان کر نکاح کر کے میں یہاں قید ہو جاؤں گا بالکل غلط۔“

ستائش نے آنکھیں بند کر لیں۔ زندگی پہلے بھی ایسی ہی تھی پہلے بابا جان کی بے اعتباری اور اب شوہر کے روپ میں ارمنان کی تو جان لو ستائش زندگی تمہارے لیے جہل بھی نہیں ہوگی سواں نے طاقت کے نشے میں اپنا کہا سچ کر دیا اور ستائش کو بالکل ہی بے قیمت کر دیا۔ ان گناہوں کی وجہ سے جو اس نے کبھی کیے ہیں نہیں تھے تو عدالت کی نہ کوئی گواہ اس فیصلہ سنا دیا گیا حالانکہ اگر ارمنان کے ساتھ غلط ہوا تھا تو اس کے ساتھ بھی کچھ اچھا نہیں ہوا تھا سواں نے خود کو وقت کے سپرد کر دیا۔

☆☆☆

دیے کی تقریب بھی ختم کر کے محض پانچویں دن ارمنان نے امریکہ جانے کی تیاری کر لی زندگی میں ہم اس سے قبل بھی تھے کہ بھی بابا جان نے انکوئی اولاد والی حیثیت اسے نہیں دی تھی مگر اب تو زندہ رہنا بھی مشکل لگ رہا تھا۔ اس نے دادا جان اور بی جان کی محبت میں اور ان کی خدمت میں ہی خوشی کو تلاش کر لیا سواں ستائش کمرے میں کم اور وہاں زیادہ پانی جاتی تھی۔

بی جان نے ارمنان کے امریکہ جانے کے فیصلے پر بہت شور مچایا اور سمجھایا۔ ”دیکھو ارمنان ابھی چند دن اور مت جاؤ۔“

”بی جان! آپ اچھی طرح جانتی ہیں کہ امریکہ میں میرے کتنے کام ادھورے ہیں۔“

”پاکستان میں تمہارے اپنے تمہارے بغیر ادھورے ہیں۔“ اور آنکھوں میں آنے آنسو صاف کرنے کے لیے مڑیں تو نظر ستائش پر پڑی جواتی توجہ سے ریڈیٹ درست کرنے میں مصروف تھی گویا

دنیا میں سب سے اہم کام یہ ہی ہو۔ بی جان پلیٹیں اور فوراً ارمنان سے یوں۔ ”اچھا پھر ستائش کو بھی ساتھ لے کر جاؤ۔“

ارمنان سر پر ہاتھ مار کر رہ گیا وہ اس کی وجہ سے ہی تو جلدی جا رہا تھا کہ شروع میں اس کے آنے کی جتنی کوفت تھی اب نہ جانے کہاں پلٹی گئی تھی حتیٰ کہ اب آس سے آ کر ارمنان کا دل چاہتا تھا سب سے پہلے ستائش نظر آئے، مگر وہ اکثر اس وقت دادا جان کے کمرے میں ہوتی تھی۔ پھر بچن اور جب بالکل سونے کا وقت ہوتا اس وقت کمرے میں آئی تھی سو اس نے سوچا یہ سب اس کے قریب ہونے کی وجہ سے ہے لہذا چلے جانے کا فیصلہ کیا اب بی جان کی نئی فرمائش پر بھلا کر بولا۔

”بی جان! یہ اکیلی وہاں کیا کرے گی۔ میں کام کے سلسلے میں سارا دن باہر رہوں گا پھر چند دوستوں کے ملنے لندن بھی جانا ہے سو یہ پریشان ہو جائے گی۔“

جواب سن کر ستائش نے سراٹھایا اور بولی۔ ”بی جان واقعی میں ابھی کہیں نہیں جانا چاہتی آپ کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔ پلیز مجھے ابھی کہیں مت بھیجیں۔“

ستائش کے جواب نے ارمنان کو جلا کر رکھ دیا ہونٹ بھیج کر ستائش کو گھورنے لگا۔

تو ارمنان صاحب آپ کے بغیر مر تو میں بھی نہیں رہی، جائیں اپنی آزادی کی زندگی میں امن ہو جائیں اگر آپ کو میری کوئی ضرورت نہیں ہے تو میں بھی اپنے دل میں پیدا ہونے والی محبت کا گلا دبا دوں گی۔ ابھی بھی آپ کی طرف مائل نہیں ہوں گی۔ اتنی عزت نفس تو ہے ہی میرے اندر اور پھر اپنی اس سوچ کو خود ہی تصور میں داد دیتے گی۔ اپنی اتنی گہری سوچ میں مستقل نظریں ارمنان کے چہرے پر مرکوز تھیں جو کہ جانے کی تیاری میں مصروف کھڑی ہاتھ پہ بائیں رہا تھا۔ کمرے کی خاموشی کی وجہ سے نظریں اٹھائیں تو ستائش کو اس انہماک سے اپنی طرف

دیکھتے پھر فوراً بی جان کو دیکھا جو ہنسی ہوئی کمرے سے باہر چلی گئیں۔

ارمنان کھانکھار کر بولا ”تم کھڑے کھڑے اسٹیپو بن جاتی ہو۔ بی جان دیکھ رہی تھیں اور تم مجھ پر نظریں گاڑے معلوم نہیں کون سا خزانہ دریافت کر رہی تھیں۔“ او۔۔۔ آئی ایم سوری۔“ نظریں جھکا لیں اور پلیٹ کر ایسی کام میں مصروف ہوئی کہ اس کے بعد ارمنان سے سامنا نہ ہوا اور وہ چلا گیا۔

☆☆☆

دادا جان نے خاص کر منظم کو ساتھ جانے کا کہا تھا کہ وہ ارمنان کی روزانہ رپورٹ دادا جان کو دے گا اور وہ اس کام کو اچھے سے کرنے کا ماہر تھا۔ اسی طرح دن گزارتے رہے۔ ستائش کی گھر کے سب افراد سے ہی دوستی ہو گئی تھی خاص کر دادا جان سے وہ اکثر ان ہی کے کمرے میں پانی جاتی تھی ایک دن چائے پیتے ہوئے بولی۔

”دادا جان آپ ارمنان کے والد کے بارے میں کچھ بتائیں وہ کیوں چلے گئے تھے۔“

”بس بیٹا میرا شوق تھا کہ وہ باہر کی یونیورسٹی میں پڑھے۔ بی جان تو مانتی ہی نہ تھیں بس پھر ہماری قسمت اس نے وہاں پر شادی کر لی۔ شروع میں تو سب ٹھیک تھا لیکن ارمنان کی پیدائش ہی جھگڑے کا سبب بنی بس پھر پریشان ہی رہتا تھا۔ کیونکہ روزی کو بچے آزادی میں رکاوٹ لگتے تھے۔“

”تو کیا؟ وہ میرا مطلب ہے ارمنان کی والدہ غیر مسلم تھیں۔“

”ارے نہیں بچے مسلمان کیا تھا مگر پھر شاید وہ شادی کے بعد مستقل اس دین پر نہ رہی اور واپس پہلے والی زندگی میں لوٹ گئی۔ بس اس چیز نے ابراہ کو توڑ ڈالا تھا۔ میں خوف زدہ تھا کہ ابراہ کے بعد میں ارمنان کو نہیں کھونا چاہتا تھا تو ارمنان کے لیے مجھے تم بہت پسند آئیں۔“

”لیکن دادا جان وہ جو پوچیشن بنی وہ محض اتفاق تھی میں ارمنان کو یا ارمنان مجھے بالکل نہیں جانتے

تھے بس سب اس طرح ہو گیا۔

”مجھے معلوم ہے بچے اول روز سے ہی تجربات میں زندگی گزری ہے اتنا تو سمجھ ہی سکتا ہوں پھر منظم نے بھی تصدیق کر دی کہ تم لوگ پہلے کبھی نہیں ملے مگر مجھے اسے قابو کرنے کا اچھا بہانہ مل گیا تو میں نے اس کو ٹیکل ڈال دی۔“

معیز جو دادا جان کی دوا کیا اس نے کرکمرے میں آ رہا تھا ساری بات سن کر حیران ہو گیا اور دادا جان کے سیاہی دماغ کو دوا دینے لگا۔

”واؤ دادا جان آپ نے اس تیل کو ایسی تکیل ڈالی کہ نہ ہاتھ چلے نہ پیر۔ بس چھری طے کی“

”کیا؟“ ستائش سچ کر بولی ”یہ تیل کس کو کہا؟“

تینوں زور سے چپے لگے بس اس دن اس راز میں منظم کے ساتھ یہ دو افراد اور شامل ہو گئے اور زندگی کی گاڑی آگے چلنے لگی۔ ارمغان کو گئے تین ماہ ہو گئے تھے وہ اس کا سب پر بی جان سے روزانہ بات کرتا تھا لیکن ستائش بھی سامنے نہیں آئی اور نہ ہی ارمغان نے اس کی خواہش ظاہر کی منظم روزانہ اس کی یومیہ رپورٹ دادا جان کو دے رہا تھا۔ زندگی شین کی طرح چل رہی تھی۔

☆☆☆

انزل ستائش کے بعد گھر میں بالکل اکیلی ہو گئی تھی سو اب کو اور ماموں کو راضی کرنے میں مصروف تھی کہ وہ جاب کرنا چاہتی ہے لیکن وہ لوگ کسی صورت نہیں مان رہے تھے۔ ستائش اور معیز دونوں اورنگ زیب سے ملنے گئے تو وہاں جا کر معلوم ہوا کہ انزل جاب کے لیے ضد کر رہی ہے۔

اورنگ زیب بولے ”میں کسی جاننے والے کے ہاں ہی جاب کی اجازت دوں گا۔“

انگل! ہمارے آفس میں جگہ ہے اگر آپ برائہ مائیں تو وہ تریب بھی ہے۔“

اس طرح انزل معیز کے ساتھ کام کرنے لگی۔

☆☆☆

ستائش کی طبیعت میں بے انتہا سستی آتی تھی

وہ کمرے سے نکل کر لاؤنج میں آئی تو معیز کو صوفے پر لیٹے پایا۔

”معیز بھائی! چائے پیئیں گے؟“

”ہاں کیوں نہیں“ لوفرہ آتی بھی آگئیں ”نمرہ کو آتے دیکھ کر معیز بولا۔“

ستائش چائے بنانے چلی گئی جبکہ نمرہ اور معیز باتوں میں مصروف ہو گئے۔ چائے بن کر آئی اور اچھے ہاتھوں میں چائے پی گئی کہ نمرہ کو پچو پچو نے بلوایا وہ لوگ آج کل صبا کے لیے آئے منظم کے رشتے کے بارے میں غور کر رہے تھے وہ چلی گئی معیز اور ستائش لاؤنج میں رہ گئے۔

”یار کب سے ارمغان کا نمبر پڑائی کر رہا ہوں وہ فون نہیں اٹھا رہا۔“ موبائل ستائش کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا ”اگر کال آئی تو تم ریسیو کر لینا“

”اوکے“ موبائل پکڑتے ہوئے ستائش بس اتنا جواب ہی دے مائی معیز چلا گیا اور واقعی موبائل کی تیل ہونے لگی ستائش نے ایک دم اچھل کر موبائل کو دیکھا اب کیا کروں فون ریسیو کروں کہ نہ کروں پھر جلدی سے اوکے کا بٹن دبا کر موبائل کان سے لگا

لیا مگر ہمت نہیں کہ بات کر سکے سو بہت ہمت کر کے اسلام علیکم کہا۔

معیز کے نمبر پر ستائش کی آواز سن کر ارمغان تو آئے سے باہر ہو گیا ”تم تو بہت ڈھیٹ لڑکی ہو۔“

ابھی تک یہاں پر ہی عیش کر رہی ہو حالانکہ میں نے تمہیں بھی گھاس نہیں ڈالی اور نہ ہی میرے بولنے کا کوئی ارادہ ہے لہذا تم اپنا قیمتی وقت ضائع مت کرو اور کوئی اور شکار مچا سو مگر پلینز میں تمہیں معیز کو چھٹانے کی پریشانی بھی نہیں دوں گا۔ تمہیں لہذا یہاں سے دفعان ہو جاؤ۔“

اس قدر تلخ باتیں سن کر تو ستائش کا دماغ ہی گھوم گیا اور وہ چکر اڑھڑام کی آواز سے زمین پر گر گئی نمرہ فوراً اٹھ آئی اور ساتھ ہی سیر حیاں اترتے

معیز نے ایک چھلانگ میں فاصلہ طے کر کے ستائش کو اٹھانے کی کوشش میں نمرہ کی مدد کرنے لگا۔

پچو پچو اور ملائکہ بیگم بھی دوڑی آئیں معیز نے ستائش کے سر سے خون بہتا دیکھا تو چیخ کر بولا ”میں گاڑی نکالتا ہوں اس کے سر سے خون نکل رہا ہے فوراً اسپتال لے کر جانا بڑے گا۔“

سب ہی اٹھتے ہو گئے تھے جبکہ معیز اور نمرہ ستائش کو لے کر روانہ ہو گئے۔ نمرہ نے ستائش کو اپنے ساتھ لگایا ہوا تھا جب وہ ایک کراہ کے ساتھ سپیدگی ہوئی۔

”ہم لوگ کہاں جا رہے ہیں۔“ ستائش کی بات پر نمرہ نے جواب دیا ”تمہیں لے کر ڈاکٹر انگل کی طرف۔“

ستائش فوراً گھبرا کر بولی ”میں بالکل ٹھیک ہوں دراصل صبح ناشتہ نہیں کیا تھا اسی وجہ سے ذرا پکڑ آ گئے اب گھر جا کر کچھ کھالوں گی آپ لوگ فکر مت کریں مجھے گھر لے چلیں۔“

”اوکے! مگر بینڈیج تو کروالو“ پھر قریبی ڈپنٹری سے بینڈیج کروا کر گھر آ گئے۔

بی جان نے ستائش کو سینے سے لگا یا اور بولیں۔

”خدا کا شکر ہے میری بچی ٹھیک ہے۔“

نمرہ نے کہا ”گزرونی ہے اس کو کھانے کی تلقین کی گئی اور جان چھوٹ گئی مگر ستائش اسے اندر ہونے والی تبدیلی سے اچھی طرف واقف تھی اور کسی کو شریک راز نہیں بنانا چاہتی تھی جس کو چاہتی تھی وہ اس کے بارے میں کیا سوچتا ہے یہ جان کر تو اس کی دماغ کی ریلیں ہی پھٹ رہی تھیں حالانکہ جس منصب سے وہ فیض یاب ہونے جا رہی تھی اس کا تقاضا۔“

یہ تھا کہ وہ ساری زندگی ارمغان کے ساتھ گزارتی اور وہ گزارنا چاہتی تھی کیونکہ بن ماں یا بن باپ کے اولاد کن خرمیوں کا شکار ہوتی ہے وہ بہت اچھی طرح جانتی تھی لیکن ارمغان تو اس کو کوئی اور قسم کی لڑکی سمجھتا ہے اور غلط فہمی ان میں شادی سے پہلے ہوئی تھی وہ اس کو اس کے خزیب کا زہن کی

کارستانی سمجھتا ہے وہ تو اس بات پر سر رہی تھی۔ اگر ارمغان نے طلاق دے دی محض تین ماہ بعد تو وہ کیا منہ دکھائے گی بابا کے گھر کس طرح جائے گی لیکن پھر دماغ کی سن کر وہ ان واقعات پر غور کرنے لگی اگر یہاں پر رہ کر بھی عزت نفس بھروج کرنی ہے تو بابا کا گھر ہی ٹھیک ہے وہاں پر کوئی بہتان تو نہیں لگا سکتا لہذا ایک فیصلہ کر کے مطمئن ہو گئی کیونکہ وہ بھی تھکنے لگی تھی اس قدر غلط سوچ ہے ارمغان کی اس پر کس طرح سمجھو تا کروں۔“ ان کی سوچوں کے درمیان اس کی آنکھ لگ گئی۔

☆☆☆

”میلو ستائش آ رہا ہے۔“ مگر کوئی جواب نہ ملنے پر اس نے کال کاٹ دی کیونکہ منظم کافی دیر سے اس کو بلا رہا تھا۔

”یار ارمغان! اتنی دیر کر دی میٹنگ تھی اور تم ابھی تک اسی طے میں گھوم رہے ہو جلدی درست کرو اپنا پلینز۔“

”ہاں۔۔۔ ہاں تم بیٹھو میں ابھی تیار ہو کر آتا ہوں۔“

ارمغان جلدی سے چینیج کر کے باہر آیا وہ دونوں آفس چلے گئے آج ان کی چینی دوسری چینی کا آرڈر سامن کر رہی تھی جس کی تیاری میں تقریباً پانچ ماہ لگ سکتے تھے اور شرط یہ تھی کہ وہ کام اپنی نگرانی میں کروانا تھا سو انہوں نے عمدہ پرافٹ کو دیکھ کر ذیل سامن کر دی۔

منظم بار بار اس کی غائب دماغی کو نوٹ کر رہا تھا وہ بار بار پانی کو منہ تک لے کر جاتا اور گلاس واپس رکھ دیتا۔ آخر تھک کر بولا۔ ”چلو اب بتا بھی دو کیا بات ہے جو اتنے بے چین ہو رہے ہو۔“

ارمغان بولا ”کچھ نہیں۔“

”پھر کیا بات ہے۔“

”وہ بس ذرا تھک گیا ہوں گھر جا کر ریست کروں گا تو بہتر محسوس کروں گا۔“ اور منظم کے کندھے پر ہاتھ رکھتا ہوا چلا گیا۔

کمرے میں آکر ارمغان نے لیپ ٹاپ کھولا اور بی جان سے باتیں کرتا اپنا کوٹ اتار کر ساتھ ہی ٹائی ڈھیلی کی آج وہ کمرے میں کہیں نظر نہیں آ رہی تھی آخر مجبور ہو کر ستائش کے بارے میں پوچھ لیا۔ دادی جان کو تو پہلے ہی بہانہ چاہیے تھا خوب کلاس لی اور ایسی کھری کھری سنائیں کہ بس۔ پھر کہنے لگیں ”ارمغان چلو اب ایک چکر پاکستان کا لگاؤ کتنے جاؤ سے بیاہ کر تم اس کو لائے تھے کس بات پر ارمغان کی آنکھیں باہر آ گئیں۔

”دیکھو بیٹا! اسے تمہاری ضرورت ہے وہ تمہاری بیوی ہے تمہارے لیے اپنا سارا گھر چھوڑ کر یہاں آئی ہے اب دیکھو تم نے اسے کبھی فون نہیں کیا مگر اس نے بھی شکایت نہیں کی حالانکہ تمہارا کام تھا تم اس کو تین چار بار تو دن میں کال کرتے۔“

”بی جان میں یہاں پر کب فارغ ہوں۔ آپ نہیں جانتیں یہاں کتنا کام ہوتا ہے۔“

”ہاں بیٹا درست کہا تم نے مجھے کیا معلوم تمہارے دادا نے یہ سارا کاروبار بھی سنبھالا اور گھر کو بھی وقت دیا۔ پتا نہیں اب کے بچوں کے پاس فیکل کے لیے وقت کیوں نہیں ہے بس بیٹا ایک چکر لگاؤ دل بہت پریشان ہے ستائش بھی بالکل کھائی گئی ہے بہت کمزور ہو گئی ہے۔“

”بی جان دراصل ابھی پانچ ماہ تو سوچا بھی نہیں جاسکا کیونکہ۔“

”بس کرو ارمغان بس۔ کوئی بہانہ نہ بنانا تم نے پہلے کب کوئی بات بی جان کی مانی ہے جواب مانو گے۔ تم سے تو وہ پرانی پٹی ہی اچھی ہے کم از کم ہماری خدمت کر کے ٹواب ہی کما لیتی ہے ورنہ ہم اس کے لگتے ہی کیا ہیں۔“ دادا جان نے گرج کر کہا۔

دادا جان کو دیکھ کر ارمغان نے اللہ حافظ کہنے میں ہی عافیت جانی۔

☆☆☆

معزز کمرے میں لیٹا موبائل چیک کر رہا تھا کہ ارمغان کی کال دیکھ کر حیران ہو گیا۔ یعنی شاہ

میں نے سب کو بچ بتانے کا فیصلہ کر لیا ہے مگر پھر اس کے بعد کون سا میرے ناکرہ گناہوں کا ازالہ ہوگا لہذا تم میری طرف سے بالکل آزاد ہو جب چاہو اس بندھن سے خود کو آزاد کر کے اپنے آزاد معاشرے میں زندگی کی نئی شروعات کر سکتے ہو اور جو بھی ہوا اس میں میں بے تصور ہوتے ہوئے بھی تم سے معافی مانگتی ہوں۔ وہ آنسوؤں کو بے دردی سے ہاتھوں کی پشت سے صاف کیے باقی کے چھیننے منہ پر مارے کر بالوں کو کچر میں قید کر کے لیپ ٹاپ ملازمہ کے ذریعے بی جان کو پہنچایا اور بیک لے کر باہر آ گئی کہ معزز مسلسل ہارن پر ہارن وے رہا تھا۔

آخری نظر کمرے پر ڈالی تو بیڈ کی سائڈ پر رکھی نکاح کی تصویر اٹھاتی اور چنڈ بیک میں ڈال کر باہر چلی آئی۔ چکراتے سر کو مسلسل ایک ہاتھ سے دبا رہی تھی اس کی اس غیر ارادی حرکت کو میسر ہیال اترتے ہوئے معزز نے دیکھ لیا تھا۔

”وہ میں موبائل بھول گیا تھا وہ لیٹے گیا تھا۔“ بیک اس کے ہاتھ سے لپٹے ہوئے بولا۔ ”ستائش! تم اسے کے لیے جا رہی ہو۔“

”جی۔“ ستائش نے معزز کی بات پر نظر چڑا کر جواب دیا۔

”تمہاری طبیعت ٹھیک ہے مجھے تم ٹھیک نہیں لگ رہی۔“

”نہیں میں ٹھیک ہوں۔ بس ذرا سر میں درد ہے۔“ گاڑی میں بیٹھے ستائش نے جواب دیا۔

”مجھے تم ٹھیک نہیں لگ رہی تمہیں گل ہی ڈاکٹر کی طرف جانا چاہئے تھا مگر تم نے ضد کی۔“

”وہ میں پچھو پھو کے ساتھ چلی جاؤں گی۔“ معاف کر دو بہن اور تم کرو میری حالت پر اور جوں پر تمہاری اس کزن نے تو مجھے مٹھا کر دیا ہے۔“

”اف کتنا ڈرتے ہیں آپ ازلہ سے جبکہ تو بہت سویت ہے۔“

”ہاں تو ان کے سویت ہونے پر میں نے کب

اعتراض کیا ہے بلکہ میں اعتراف کرتا ہوں کہ وہ محض سویت ہی نہیں بلکہ اسہارت بھی کافی ہیں۔“ اس طرح کی باتوں میں ہی وہ ستائش کو ہسپتال لے کر آ گیا۔ ستائش نے باتوں میں دھیان نہ دیا تھا مگر اب اترے بغیر کوئی چارہ نہیں تھا سو اس کو گاڑی سے اترنا پڑا اور ڈاکٹر نے جو خبر سنائی ستائش تو اس سے آگاہ بھی البتہ معزز بہت خوش تھا بولا۔

”تم دیکھنا ستائش! ارمغان کس قدر خوش ہوگا۔ اگلی فلائٹ سے پاکستان آ یا تو میرا نام بدل دیتا۔“ ”پلیز معزز آپ وعدہ کریں آپ اس بارے میں انہیں کچھ بھی نہیں بتائیں گے۔“ اور دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔

معزز اس کی دگرگوں حالت اور اشک بار آنکھیں دیکھ کر کسی انہونی کے خوف سے کانپ کر رہ گیا۔ ”ستائش سب خیر ہے تمہاری ارمغان سے کیا بات ہوئی۔ کیا وہ اولاد نہیں چاہتا۔“

ستائش نے ٹہنی میں سر ہلایا ”معزز وہ مجھے نہیں چاہتا وہ مجھے طلاق دینا چاہتا ہے۔“ وہ ہلکے ہلکے رونے لگی۔

معزز نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور کہا ”اصل میں دادا جان سچ کہتے ہیں۔ یہ بھی بات کو سیدھے طریقے سے نہیں مانتا لیکن تم قلمت کر دوسرے مل آئے گا معافی مانگے گا تمہارے پاؤں پکڑے گا میرا وعدہ ہے تم سے بس تم میری ہدایات پر عمل کرنا باقی کام مجھ پر چھوڑ دو۔ یہی بات یہ کہ تم نے اب اس کی کال ریسیو نہیں کرنی اب تم گھر چلو گی یا ازلہ لوگوں کی طرف۔“

”نہیں میں اب کی طرف ہی جاؤں گی۔“ ”اوکے۔“

☆☆☆

صبح ناشتہ کرنے کا بالکل سوڈ نہیں تھا تو وہ جوس کا گلاس لے کر اپنے کمرے میں آ گیا کپڑے پہنچ کرنا ایک ہاتھ سے ٹائی سیٹ کرتے لیپ ٹاپ آن

کیا تو بیچ کھول کر پڑھتے پڑھتے اس کی آنکھیں بھی کھل گئیں۔ ”اونو! جو میں اتنے دنوں سے اس کو سزا دے رہا ہوں وہ تو خود میری طرح بے قصور ہے چلو آج آکر اس سے بات کرتا ہوں۔“

آفس پہنچتے ہی معجز کی کال نے حیران کر دیا کہ سٹائن گھر چھوڑ کر چلی گئی ہے اور وہ وطلاق مانگ رہی ہے، یعنی کوئی لڑکی ارمان شاہ کو رنجیت کر رہی ہے۔ یہی پھر تو وہ پاگل ہی ہو گیا اس نے ہر ممکن کوشش کی سٹائن سے بات کرنے کی لیکن سٹائن نے بھی دل سخت کر لیا تھا اسی طرح تین ماہ گزر گئے ڈالے صبا اور نمرہ آبی اکثر ملتے رہتے تھے اور صبا اپنی فرینڈز کی بہن سے آج کل سٹائن کی ٹریٹمنٹ کروا رہی تھی البتہ بی جان اور دادا جان سے فون پر بات ہو جاتی تھی مگر پتا نہیں معجز نے ان کو کیا کہا انہوں نے بھی سٹائن کو گھر آنے کے بارے میں مجبور نہیں کیا۔

آج کل انزلہ اور معجز نے مل کر ارمان کو سیدھا کرنے کے منصوبوں پر عمل شروع کر رکھا تھا اور منظم کو بھی ساتھ ملا لیا تھا البتہ سٹائن کی زندگی بہت بے رنگ ہو گئی تھی۔ پچھو پچو جان اکثر اس کی حالت کے پیش نظر اس کی دل جوئی کرتی رہتی تھیں جب کہ اورنگ زیب دیسے ہی چٹان کی طرح سخت بنے پھرتے تھے۔ زندگی ایک نقطے پر آکر رک گئی تھی نہ آگے بڑھتی تھی نہ کوئی احساسِ غم اور نہ خوشی۔ بالکل بارش کے اس پانی کی طرح جو گڑبھوں میں رک جائے تو سوائے تکلیف کے کچھ فائدہ نہیں دیتا۔ ایسی ہی سٹائن کی زندگی تھی کہ اس کی ذات سے کسی کو کوئی فائدہ نہیں ہاں تکالیف لاتعداد تھیں۔

☆☆☆

وہ کافی دیر سے ایک نقطے پر نظر جمائے بیٹھا تھا ”ارمان چلو پار! ویک اینڈ ہے نہیں باہر چلتے ہیں“ منظم نے اس کے ارٹیکل کو ڈال دیا۔

”موڈ نہیں ہو رہا کمرے میں جا رہا ہوں کچھ ریٹ کروں مگر عجیب تھکن سی محسوس ہو رہی ہے“ وہ

ایسا ہی ہو گیا تھا نہ باہر جانا نہ دوستوں سے ملنا بس کام کیا اور گھر۔

”اچھا چلو کچھ دیر رک جاؤ میں کافی بنا کر لانا ہوں تمہارے لیے بھی اور اپنے لیے بھی تم اتنے میں پاکستان بات کر لو شاید اچھا نیکل کرو“ اور جانے کے لیے مڑا ساتھ ہی موبائل نکال کر معجز کو بجھ گیا۔

”یار! ڈوڈ ڈرا! مکی رکھو نہیں سیدھا کرتے کرتے شہید ہی نہ کر دینا بالکل بھٹوں بنے پھرتے ہیں آج کل“

جب منظم کافی بنا کر لوٹا اس وقت ارمان بی جان سے باتیں کر رہا تھا۔ بی جان سلامیوں پر ایک ننھا سا سویٹیر بن چکی تھیں اور اب اس کے آخر کے دھانچے فینچی سے کاٹ رہی تھیں اور ارمان سے باتیں بھی کر رہی تھیں۔

دیوید اور ارمان! کتنا پیارا ہے۔“ آخری دھاکہ کاٹ کر سویٹیر کو سامنے کر کے بولیں۔

”یہ تو بہت چھوٹا ہے بی جان! نمرہ اور ڈالے کے بے بیز تو اب بڑے ہو گئے ہیں۔“

بی جان نے کھور کر کہا ”ہاں تو تم سے کس نے کہا کہ یہ ان کے بے بیز زکا ہے یہ تو سید ارمان شاہ کے بے بی کا ہے۔“

کافی اس کی طرف بڑھا جاتے منظم کا ہاتھ چھلکا اور کافی ارمان کے پیروں پر گر گئی وہ پیر بھاڑتا اٹھا اور نگاہ اٹھا کر منظم کو دیکھا۔ منظم نے اس کی آنکھوں میں دنیا کی ساری خوشیاں مل جانے کی چمک دیکھی وہ بہت خوش تھا لیکن بی جان کی اگلی بات نے اس کی آنکھوں سے جان ہی نکال دی اور وہ فوراً صوفے پر بیٹھ گیا۔

”سٹائن بہت پریشان رہتی ہے منتقلی چیک اپ کروانے پر بھی راضی نہیں ہوتی۔ ہاں اب میری بڑی ہڈیوں میں اتحاد بھی نہیں ہے کہ اس کے ہاں چکر لگاؤں اور وہ ہے کہ گھر آنے پر راضی نہیں ہے۔ ہاں البتہ ماہ اپنی دوست کی بہن سے اس کا علاج کروا رہی ہے اور

معجز نمرہ ملائکہ ڈالے چکر لگاتے رہتے ہیں صبا بتا رہی تھی اس کی رپورٹ کچھ فکلی بخش نہیں ہے۔ بہت پریشانی ہے۔“ مجھے تو ”کیا کروں؟“ ارمان کی پریشانی پر لاتعداد مل نمودار ہو گئے اور اللہ حافظ کہہ کر بات ختم کر دی۔

”یار منظم! اب کیا کروں اگر اس کو باپے بی کو کچھ ہو گیا تو میں کیا کروں گا۔“ سر کے بالوں کو دونوں ہاتھوں میں لیے کر بولا۔

”ہاں تو تمہیں اس سب سے کیا فرق پڑتا ہے۔ تم گزراؤ اپنی آزاد زندگی! اپنی من مانی کرو حالانکہ اس کی اس حالت کے ذمہ دار صرف تم ہوئے غصے سے منظم نے ارمان کو گھور کر کہا۔

ارمان فون نکال کر معجز کا نمبر ملائے لگا۔

معجز اور انزلہ آفس کم اور گھر کے معاملات زیادہ ڈیکس کیا کرتے تھے اور معجز انزلہ کے دماغ کی تخریب کاریوں سے خوب فائدہ حاصل کر رہا تھا کہ وہ کام جس کو وہ دوماہ سے کر رہا تھا لیکن بات نہیں بن رہی تھی انزلہ نے اس کو دو ہفتوں میں ہی کر دکھایا تھا۔ سب سے پہلے انزلہ نے بی جان کو سٹائن کی حالت کے بارے میں مطلع کیا جس کے بعد گھر میں طوفان آگیا دادا جان نے تو خوب ہی کلاس لی اور سب نے ہی ارمان کو برا بھلا کہا ملائکہ بھی حیران تھی کہ اس قدر خون سفید ہو گیا کہ اولاد کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ پچھو پچو بھی کافی غضب ناک ہوئیں اور دادا جان نے تو فیصلہ ہی سنا دیا کہ اگر سٹائن کے ساتھ کچھ برا ہو تو میں ساری زندگی نہ ارمان کی شکل دیکھوں گا نہ اپنی دکھاؤں گا کیونکہ وہ اس احساس میں گرفتار تھے کہ ان کا بھی قصور ہے۔ جس طرح انہوں نے ان دونوں کی شادی کروادی اس طرح بھی یہی شادی ہوتی ہے۔ لہذا اب انزالہ کرنا چاہتے تھے بس سب اہل خانہ دادا جان کی بات پر مشتق ہو گئے۔ اور یہ خبریں اڑتی ہوئی ارمان کے کانوں میں بھی پہنچ چکی تھیں معجز کے فون پر کال آنے لگی۔

”ارمان کال کر رہا ہے“ معجز نے حیرت اور

خوشی سے انزلہ کو بتایا۔

”اسٹیکر آن کرو پلینز! میں بھی سنوں گی۔“

انزلہ نے بے چینی دکھائی۔

معجز نے اسٹیکر آن کر دیا۔

”ہیلو“

”ہائے!“

”کیسے ہو معجز؟“

”اچھا ہوں۔“

”وہ تو تم ہمیشہ سے ہی ہو۔“

”کام کی بات کرو میں ڈرامہ صرف ہوں۔“

معجز نے اکثر دکھائی۔

”کیا مصروفیت ہے تمہاری اس وقت“

تو معجز ترنت بولا ”کسی کا چہرہ پڑھ رہا ہوں“

اور نگاہیں انزلہ کے چہرے پر جمادیں جو ہاتھ میں پین اسٹینڈ اٹھائے دانت چیس رہی تھی اور معجز کے رد میں کھ موڈ کا چہرہ غرق کر رہی تھی۔

”بولو میں تمہیں سن رہا ہوں۔“ معجز سیدھا ہو کر

بولا۔ ”وہ بی جان بتا رہی تھیں کہ تم چاہو بننے والے

ہو۔“ ہاں سنا تھا انزلہ نے دفتر جو ان کیا ہے تو اس نے بتایا تھا لیکن وہ بتا رہی تھی کہ سٹائن ایسا کچھ نہیں

چاہتی وہ کہتی ہے جب ہماری زندگیوں میں اس قدر بے اعتباری اور دوری ہے تو اس کے جو مستقبل اور ایک

چھت کب مل سکتی ہے سو قصہ ختم کروانے کے لیے

آج کل ڈاکٹرول کے پاس گھوم رہی ہے۔“

انزلہ نے سوچا اگر معجز کی یہ بات سٹائن سن

لے تو یقیناً ہمارے سر بھاڑ دے۔

ارمان فوراً کھڑا ہوا اور بولا ”تم اس کو روکو۔“

سمجھاؤ کہ ایسا کچھ مت کرنے میں اپنے بچے کو ایک

گھر کیوں نہیں دے سکتا۔“

”دانت؟ آریو میڈ؟ میں تمہارا مطلب ہے

میں اس کو سمجھاؤں۔ تمہارا امریکہ نہیں ہے۔ شرم بھی

کسی چیز کا نام ہے مگر تم کیا جانو تم نے کب یہ سبق

پڑھا ہے۔“

”آئی میں ڈالے نمرہ صبا کوئی تو سمجھا سکتا ہے

یقین کر دیتے ہیں اندازہ نہیں بی جان کس قدر خوش ہیں تم کیسے بھی اس کو روکو۔“

”دیکھو ارمدخان میں تمہاری بی جان کو خوش کرنے والی عادات سے اچھی طرح واقف ہوں اور کچھ کا تو مشاہدہ اپنی ان گناہگار آنکھوں سے کر چکا ہوں سو پلیز اپنی بات کر دو کہ تم کیا چاہتے ہو۔“

بس پھر ارمدخان کی انا اور ضد کی دیواریں زمین پوس ہو گئیں بولا ”معجز میں قیلاً چاہتا ہوں منزل کی جستجو کرتا ہوں مگر کاسکون بھی جیسی میں تو بھی اس کی طرح کی اور لڑکیوں میں ڈھونڈتا ہوں میں بہت سی لڑکیوں سے دوستی رکھی مگر حدود بھی نہیں توڑیں۔ منزل کا یقین نہیں ہے میں تھک گیا ہوں۔ اصل کی طرف لوٹنا چاہتا ہوں۔ میں یہاں لڑکی میں سناٹا کی شہسہ تلاش کرتا ہوں اسے روکو کچھ بھی غلط کرنے سے پلیز میری اس سے بات کر دو اور پلیز۔“ اور فون بند کر کے اچھال کر صوفے پر پھینک دیا۔

معجز اس سے اس قدر جامیانہ اظہار محبت کی توقع نہیں رکھتا تھا جبکہ انزلہ آنکھیں کھلے چہرے سے معجز کو دیکھ رہی تھی پھر زور سے اسے چنگی کاٹی اور ہنستی چلی گئی اور اس کی ہنسی میں معجز کی ہنسی بھی شامل تھی۔

☆☆☆

ارمدخان اپنے آفس میں چکر لگا تا بھیجی دائیں جانب بھی بائیں جانب نہایت احتیاطی کیفیت کا شکار تھا۔

”منظم اگر تم میری جگہ ہوتے تو کیا کرتے؟“

منظم نے ہڑ بڑا کر سر فائل سے باہر نکلا اور بولا ”پہلے تو میں تمہاری جگہ بھی ہوتا ہی نہ اگر ہوتا تو یہ وقت میری زندگی میں بالکل نہ آتا کیونکہ اگر اللہ تعالیٰ نے ایک حادثے کے طور پر ہی مجھے اتنی اہمیت اور اس قدر خوب صورت بیوی دی ہوتی تو میں شکر ادا کرتا نہ کہ تمہاری طرح اس کو رسوا کرتا۔“ منظم نے خوب آئینہ دکھایا۔

”میں پاکستان جانا چاہتا ہوں قبل اس سے کہ

وہ کچھ غلط کرے۔“

”واٹ؟ تو یہاں پر کام کون دیکھے گا؟“

”تم دیکھو گے میں جلد ہی سٹائن کو لے کر لوٹ آؤں گا۔ اتنے دن تم شیخ کر لو گے اس کے بعد میں مستقل پاکستان چلا جاؤں گا۔“

منظم نے فائل کے اندر کر کے مسکرانے لگا وہ بھی یہی چاہتا تھا کہ ارمدخان پاکستان جائے اور اپنی بڑی غلطیوں کی تلافی کر لے اس سے پہلے کہ واقعی دیر ہو جائے کیونکہ وہ اس کے ساتھ رہ کر جان چکا تھا کہ جتنا یہ اوپر سے سخت اور بے گانہ بنتا ہے اتنا بے نیس اور نہ ہی وہ مغرب کی زندگی سے خوش ہے کیونکہ اس کی زندگی بھی تو ان میں سے ایک تجربہ ہی تھی۔

☆☆☆

تین سال میں منظم اتنا اور ارمدخان کو پڑھ ہی چکا تھا۔ آج کل سٹائن اپنی طبیعت میں عجیب بیزاری محسوس کر رہی تھی پھر پھر جان دل بھلائی مگر دل کب بھلا تھا وہ تو ہر وقت اس دشمن جان میں انکار ہوتا تھا اور دل و دماغ کی اس جنگ میں وہ تھک چکی تھی فون کی تیل پر چوٹی صبا کالنگ دیکھ رہی تھی ریسو کر لیا۔

”کیسی ہو سٹائن! تم کل ڈاکٹر کی طرف کیوں نہیں گئیں؟“

”وہ صبا دراصل میں بہت لیزی ہو رہی ہوں بالکل دل نہیں کرتا کہیں جانے کو۔“

”ابھی اٹھو سٹائن تیاری کرو ڈاکٹر زارا کے پاس تمہاری اپائنٹمنٹ ہے۔ معجز نہیں پک کر لے گا وہ گھر سے نکل گیا ہے اور تمہاری طرف آ رہا ہے۔“

ناچار سٹائن کو اٹھنا پڑا۔ اشارے کے رنگ کمر کا سوٹ جس کے بازو اور آستین پر لائٹ گرین کمر میں دھانگے کا کام ہوا تھا۔ دو پٹا خوب پھیلا کر لیا اور بالوں کو نازک سے کچر میں آدھے کھلے اور آدھے قید کے فائل لے کر نیچے چلی آئی۔ پھر پھونے تیاری دیتی تو پوچھ لیا۔

”بیٹا خیریت کہاں جا رہی ہو؟“

”وہ دراصل پھر پھوڈا کمر کو دکھانا تھا صبا مل رہی

ہے میں جاؤں۔“ معجز کی گاڑی کی آواز سن کر سٹائن نے پھر پھو سے پوچھا۔

”ہاں بیٹا جاؤ۔“

وہ جانے لگی تو پھر پھو کی آواز سن کر رک گئی۔

”سٹائن بیٹا ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا۔“

جب سے انزلہ نے ماں کو سٹائن کی زندگی کی حقیقت بتائی تھی وہ بہت شرمندہ تھیں کہ انہوں نے سٹائن کی بات کیوں نہ سنی؟ کیا انہوں نے ماں بننے کا حق ادا کر دیا۔

”نہیں پھر پھو کیسی باتیں کرتی ہیں یہ تو میرا نصیب تھا جو روز ازل سے اسی طرح لکھا ہوا تھا، آپ بالکل پریشان نہ ہوں۔“ اور آنکھوں میں آئے آنسو چھپانے کے لیے جلدی سے گیت غور کر گئی۔

گاڑی میں بیٹھتے ہی معجز کو سلام کر کے پہلا سوال ادا اچان اور بی جان کے بارے میں کیا۔

”ہاں وہ دونوں سمجھیں بہت یاد کرتے ہیں“

”پلیز معجز مجھے ان سے ملو اور تمہاری ہدایات نے تو مجھے بالکل قید ہی کر دیا ہے“

”بس سٹائن چند دن اور رک جاؤ پھر فیصلہ تمہارا ہوگا جس طرح تم نے چاہا اسی طرح ہوگا لیکن بھائی ہونے کے ناتے ایک ایڈوائز دوں“

”کیا مطلب؟“ سٹائن نے حیرانی سے معجز کو دیکھا۔

”اس مطلب و طلب کو چھوڑو اور میری بات غور سے سنو منظم بتا رہا تھا کہ ارمدخان بہت پریشان ہے جب سے اس نے گڈ نیوز سنی ہے وہ پاکستان آنے کے لیے بہت بے چین ہے شاید تم نے غلطی کی سمجھیں اسے یہ سب پہلے ہی بتا دینا چاہئے تھا تو تمہارے درمیان اتنی غلط فہمیاں نہیں ہوتیں۔“

”غلط بھی تو ہمارے درمیان اول روز سے ہی ہے اور وہ دور کرنے کے لیے مل کر بیٹھنا پڑتا ہے اور یہ ارمدخان کو گوارا نہیں تھا آپ کب سمجھتے ہیں میں نے وضاحت کرنے کی کوشش نہیں کی تھی لیکن جس نے میری عزت کی حفاظت کرنی تھی وہی میرے کردار پر

کچھ اچھا لگے گا بس یہ مجھے برداشت نہیں تھا۔“

گاڑی اسپتال کے گیٹ سے اندر کرتے معجز نے ٹشو باکس سٹائن کے سامنے کیا اور بولا ”اچھا چلو موڈ ٹھیک کرو اندر صبا تمہارا ویٹ کر رہی ہے جب تم لوگ فارغ ہو جاؤ مجھے کال کر دینا میں تمہیں ڈراپ کروں گا۔“

”اوکے؟“ سٹائن نے اپنی فائل لی اور ڈاکٹر کی طرف چل پڑی۔

معجز کو صبا نے کال کر کے بلایا تھا لہذا وہ اپنے مقررہ وقت پر گاڑی لے کر آ گیا تھا۔ گاڑی سے باہر نکل کر بولا ”تم سٹائن کو لے کر آ جانا میں صبا کی گاڑی میں آ جاؤں گا کیونکہ سٹائن کے ہاتھوں تمہاری درگت بننے میں تو کم از کم اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتا۔“

”ٹھیک ہے“ ارمدخان نے جس کو معجز ابھی پھر پورٹ سے لے کر سیدھا آ رہا تھا ہنس کر جواب دیا۔ اسی دوران سٹائن اپنی رپورٹ فائل میں ترتیب دیتی دروازے سے باہر آئی ارمدخان آج اسے چھ ماہ کے بعد دیکھ رہا تھا حسین تو بلاشبہ وہ پہلے بھی تھی لیکن غم واداسی نے اس کی خوبصورتی میں مزید اضافہ کر دیا تھا۔

سٹائن نے رک کر اپنی مطلوبہ گاڑی تلاش کی اور معجز کی گاڑی پر نظر پڑے ہی جلدی سے گاڑی کی طرف آئی۔ دروازہ کھول کر بیٹھتے ہی بولی۔

”پلیز آج تو دادا جان اور دادی جان سے ملو

مستحقا

محیما

قیمت - 400 روپے

کتاب خانہ اہل بیت، 37 - اسلام آباد، فون: 32735021

شمینہ فرحان

علم سے اعمال

”چلو جلدی چلو بس آدھے گھنٹے میں بند
ہو جائے گا۔“ رومیا کرے میں آتے ہی جلدی جلدی
کی رٹ لگنے لگی۔ اپنا کالج بیک کندھے
نے اتارنے سے لے کر... لیب کوٹ اتار کے
الماری میں ٹانگ کے اپنے جوتے موزے اتار کے
چپل پہننے تک لگتا تھا اس میں کوئی جاپانی بھر دی گئی ہو۔



دو“ اور جیسے ہی نظر ڈرا نیوٹنگ سیٹ پر بیٹھے شخص پر
بڑی تو ساری کائنات ہی گویا ختم گئی جبکہ اس کے
برعکس ارمغان جو بڑی فرصت سے دونوں ہاتھوں کو
سینے پر باندھے اس کا مکمل جائزہ لے رہا تھا
بولے۔ ”دادا جان اور بی جان سے ملنے کی اتنی بے تابی
اور میں جو فون کروں وہ بھی نہیں سنتا مجھ سے بات کرنا
بھی گوارا نہ سمجھا اور اب جو بات سب سے پہلے
جاننے کا میں حق دار تھا وہ مجھے سب سے آخر میں پتا
چلی۔ وہ بھی بھلا ہو بی جان کے بنائے گئے سویٹر کا
تم نے تو مجھے اتنی بڑی خوشی سے دور رکھا بلکہ محروم کرنا
چاہا کیوں؟ ستائش کیوں کیا واقعی تم مجھ سے اتنی
نفرت کرتی ہو؟“

”یہ بھی کہ فیملی والی خواہش کب تک پوری
کرو گی۔“

ستائش اس کی بات سن کر مسکراتی ہوئی کھڑکی
سے باہر بھاگتے مناظر دیکھنے لگی۔ اور ارمغان گھٹکتا تا
ہوا گاڑی دوڑانے لگا۔

”م ہے یا خوشی ہے تو میری زندگی ہے تو۔
اور ذہن میں میری کئی باتیں گونجتے گئیں جو
ایر پورٹ سے واپسی پر بھی گئی تھیں جب اس نے
پوچھا ”کیا ضرورت تھی ازیل کو آفس میں رکھنے کی
جبکہ کوئی خاص سیٹ بھی نہیں تھی تو معیروں پر ہاتھ رکھ
کر بولا۔“ اس دل کی ضرورت تھی۔ وہ لڑی ہوئی بی
میرے دل میں اتر گئی۔ اب تم اور ستائش مل کر
میرے راستے ہموار کرو گے۔“

”کیوں؟ تو یہ نیک کام تم نے خود کیوں نہیں کیا۔“
”یار کر لیتا مگر وہ زبان سے زیادہ ہاتھ چلانے
کی قائل ہے بس اسی لیے رک جاتا ہوں اب تمہاری
رکاب میں نے ہوا کی ہیں۔ بد لے میں تمہارا اتنا
فرض تو بنتا ہی ہے اگر تم سمجھو تو۔“

لہذا اب جلد ہی ان کے بارے میں بھی کچھ کرنا
تھا۔ گاڑی چلاتے ہوئے تھوڑی تھوڑی دیر بعد
ستائش کو پیار بھری نظروں سے دیکھ لیتا جو آنکھیں بند
کیے سیٹ کی پشت سے ٹیک لگائے اللہ تعالیٰ کی شکر
گزار ہو رہی تھی جس نے اس کی دعائیں قبول کر لی

”میں مانتا ہوں، میں نے بہت غلط کیا ہے
تمہارے ساتھ اور اپنے تمام قریبی رشتوں کے ساتھ
منظم ٹھیک کہتا ہے مجھے بغیر رشتوں کے رہتے رہتے
ان کی قدر ہی نہیں رہی لیکن تم یقین کر دو میں نے
رشتوں کو چھوڑنے کے بارے میں کبھی نہیں سوچا
میری تو سمجھ میں نہیں آ رہا کہ تم سے معافی کس طرح
مانگوں۔ اپنی اس بکواس کی جو میں نے فون پر تم سے
کی لیکن پلیز مجھے معاف کر دو تم بالکل اتفاق سے
میری زندگی میں شامل ہو گئی ہو پھر بھی میں نے شکر
نہیں کیا۔ اور جانتے ہوئے تمہیں تکلیف پہنچائی لیکن
اب وعدہ کرتا ہوں تمہیں اپنی ذات سے ملے تمام
دکھوں کا ازالہ کروں گا تم میرا ہاتھ تمام لو بھی نہ
چھوڑنے کے لیے میں اپنی تمام بری عادتیں میرا
مطلب جو تمہیں پسند نہیں ہیں چھوڑ دوں گا۔ ہم جملگی

اور میں تو محمدؐ حیرت نئی سوچنے لگی کہ یہ وہی روما ہے۔ جسے امی آرازیں دے، دے کے تھک جاتی تھیں کہ رومی بیٹا کھانا کھالے۔ چائے پی لے کر لڑیا ٹھنڈی ہو رہی ہے۔ اور روما صاحبہ یہ کہہ کر کہ ”بس امی ایک پیرا گراف رہ گیا ہے۔ ختم کر کے آتی ہوں۔“ کے بعد بھی گھنٹی بھر کے بعد ہی جلوہ افروز ہوتی تھیں۔

روما کو تو لگتا تھا کہ دنیا میں صرف پڑھنے کے لیے ہی بھیجا گیا ہے۔ دنیا میں کیا ہو رہا ہے گھر میں کون آ رہا ہے کون جا رہا ہے۔ کون سا ڈرامہ ”ہٹ جا رہا ہے۔ ان باتوں کی تو خیر اسے بھی پروا تھی ہی نہیں..... پر خصوصاً تو اب آتا جب محترمہ اپنا کھانا پینا تک بھول جاتیں۔

”سناؤ کوئل صرف ایک کا کھانا ملے گا ہمیں.....“
 یوں میں ہم کینٹین سے جا کے سینڈویچز کھالیں گے۔“
 رومانے میرے کان میں نلی ناسر گونجی گی۔
 ”تو پھر ضرورت کیا ہے لائن میں لگنے کی؟“
 منہ انداز بہر حال سرگوشی کا سا تھا آواز نہیں..... جس
 کو کچھ جھپٹلی لڑکیاں متوجہ ہو چکی تھیں اور رومانو جھٹ
 گردن نیچے کیے یہ باور کرانے کی کوشش میں تھی کہ
 میرا اس سے بہن کا تو کیا..... کوئی اور تعلق بھی نہیں

”ان کو توڑنے کے لیے“ کیڑوں کے نام
 بیس کی سخت لڑو دھاڑی کو توڑنے کی کوشش کرتے
 دے میں نے کہا تو آس پاس بھی گھسی کے نغے بھر
 گئے۔

”ہاں.....“ وہ چپل اتار کے بیڈ پر بیٹھتی ہوئی کہنے لگی۔

”فصہ آئے گی نا آج..... میری روم میٹ اس سے میری بہت اچھی دوستی ہوگئی ہے۔“ اور اس بات کا تو مجھے اچھی طرح اندازہ تھا کہ روم کم دوستیاں پالتی ہے لیکن بھائی تاحیات ہے۔

خیر جناب شام تک فصہ صاحبہ بھی سرگودھا سے ڈائیوڈ کے ذریعے سے اپنے ہماری بھر کم سامان سے لدی پھندی فاطمہ جناح ہاسٹل کی تین منزلہ سڑھیاں چڑھ کے ہانپتی کانپتی، پریشان حال کچھ جلی جھیں اور اپنے سامان کو کھکانے لگانے سے پہلے پھولی سانسوں کے درمیان..... میری بہن سے صرف یہ کہا کہ بلکہ پوچھا۔

”یار ندوس سسٹم مشکل تو نہیں ہے۔ آج فرسٹ لیچر تھا نا..... تم مجھے سمجھا دینا پلیز آج کیا پڑھایا ہے.....“ تو مجھے تو خود اس کے نازل ہونے پر شک گزرا اور فقط آدھے گھنٹے بعد وہ دونوں کتابیں کھولے سر جوڑے ندوس سسٹم کے اسرار و رموز کو سمجھنے کی کوشش میں کوشاں مجھے کوفت میں مبتلا کر رہی تھیں۔

اردو انگلش دونوں میں بحث جاری تھی۔ اس سے پہلے کہ میرا دماغی توازن بگڑنا یا میرے دماغ کے خلیے مجھے غشی میں جانے کا سسکل دیتے ہیں دودھ پتی اور چینی لیے چائے بنانے کے لیے کھڑی ہوگئی۔

میرے بلبلاتے گراسجے دماغ کے خلیوں کو ایک زبردستی چائے ہی پر سکون کر سکتی تھی۔ پر جناب دودھ صرف دو کپوں کا تھا میں نے تین کپ آدھی آدھی چائے کے بنا ڈالے۔

”بھئی کوا بنی پریگزاردہ کرو فصہ..... کوا بنی (معیار) اچھی ہے.....“ میں نے فصہ کو چائے کا کپ کپ تھماتے ہوئے کہا۔ تو دوستا دی مسکراہٹ کے ساتھ اس نے بھی اخلاقیات بھائیں.....

”تم بور ہو رہی ہونا ہماری پڑھائی سے؟“

”ارے نہیں نہیں.....“ (مروت نہ ہوتی تو نبھانے کیا ہوتا؟) میری مضموم بہن تو چائے پی کے دوبارہ کتاب کھول چکی تھی..... جبکہ فصہ مجھ سے کہیں لگانے میں مصروف ہوئی۔

”یار کوئل چائے تو بہت زبردست تھی برائی تھوڑی کہ میرے Neurons (دماغ کے خلیوں) کے صرف پاؤں ہی تر ہو سکے ہیں۔“ اس کی اتنی زبردست مثال پہ میں نے بڑا سا قہقہہ لگا کے داد دی۔

بس پھر کچھ ہی دیر میں باقی مشورے کے بعد ہمارا مختصر سا قافلہ جس میں سانسے والے کروں کی فرسٹ ایئر کی لڑکیاں جن سے میری آج ہی نئے نہیں میں دوستی ہوئی تھی۔ شامل ہو کر ہاسٹل کی افسوس رسیم صاحب کی کینٹین کی طرف رواں دواں تھا۔

وہاں میری ایک دو اور لڑکیوں سے علیک سلیک ہوئی اور ہم لوگ کینٹین کے آگے بنی سیریلوں اور پکے فرش پر چوکڑی مارے چائے سے لطف اندوز ہونے کی کوشش کرنے لگے کیونکہ چائے کے نام پر کالاسیال خلق سے اتارنا بھی ایک صبر آزما کام تھا۔

”یار اتنی کالی چائے تم لوگ پیتے ہو؟“ میں نے افسوس ناک حیرت کا مظاہرہ کرتے ہوئے کینٹین والے لڑکے سے منت کی کہ اس میں تھوڑا سا دودھ اور شامل کر دے تو شاید پینے کے قابل ہو جائے۔

”اسی لیے میں یہاں نہیں آتی..... بہت بری چائے بناتے ہیں یہ لوگ دودھ تو ڈالتے ہی نہیں۔“ میرے کارن ایک نازک اندام حید کو بھی اپنے جملے کے خیالات کے اظہار کا موقع ملا۔

”جب ایک پاؤ دودھ سے دو جن بھر کپ بنائیں گے۔ تو ایسے ہی نہیں گے نا۔“ فصہ نے بھی منہ بناتے ہوئے کینٹین والے لڑکے کو اپنا۔ کپ تھمایا۔

”سنو میری چائے میں بھی تھوڑا سا دودھ ڈال دو۔ اتنی کڑوی ہے پی ہی نہیں جا رہی۔“

”ہم کیا کریں؟ دوسری ڈاکٹریں آتی ہیں تو سہی ہیں کوڑک بناؤ کوڑک..... ہم تو اس لیے پھر کوڑک بناتے ہیں۔“ تیرہ چودہ سالہ لڑکے نے اپنا دفاع کیا..... لیکن خیر فصہ کا بھی کپ وہ دودھ ڈالنے کے لیے لے گیا۔

”دیسے ان کو چائے کہ ایک گرم دودھ کا گرماس بھر کے رکھ دیں۔ جس کو دودھ زیادہ ڈالنا ہو وہ ڈال لے۔“ مجھے مسئلہ کا بھی حل سمجھا آیا۔

”وہ جی بہت پہلے ایسا ہی ہوا کرتا تھا۔ میرے ماموں بناتے تھے دودھ کا اور قبوے کا تھرماس بھر کے ٹیبل پر رکھ دیا جاتا تھا..... جو چھٹی چائے بنانا چاہتا تھا بنالیتا تھا یہ بات بہت سال پرانی ہے..... کوئی تیس چالیس سال پرانی جب میرے ماموں ہمیں میری طرح کام کیا کرتے تھے اب تو وہ بھی بوڑھے ہو گئے ہیں۔“ کینٹین میں کام کرنے والے بچے کے حیرت انگیز انکشاف پر ہم سب کوئی بہت قہقہہ ہوا۔

”تو اب ایسا کیوں نہیں کرتے؟“ میں پوچھے بنانہ رہ سکی۔

”جی اب تو زمانہ بدل گیا ہے..... اتنی تو مہنگائی ہے ہمارا تو اپنا پورا نہیں پڑتا۔“ وہ آس پاس سے کپ اٹھاتا زمانے کے سر پر الزام دھرتا چلتا بنا۔

”چل بھی روما..... تو نے تو بہت ہی بھروسے (برے) زمانے میں اس ہاسٹل میں قدم رکھا ہے تو بھی تیس چالیس سال پہلے ہی ڈاکٹر بن جانی تو اچھا تھا۔“ وہ ایسی پکڑے تک جاتے ہوئے میں نے روما اور فصہ کا خوب ریکاؤڈ لگایا۔ اور ایسی سے لوٹ پوٹ ہوتے تین منزلہ سڑھیاں چڑھ کے اوپر پہنچے تو گمرے کے باہر چوکیدار، بھیا کے آنے کا پیغام لیے کھڑا تھا۔ اور ہم دونوں بہنوں کو معلوم تھا کہ بھیا مجھے لینے آئے ہیں۔ وادٹ روڈ سے واپڈا ناؤن کا سفر تو لگتا ہے جیسے آپ کسی دوسرے شہر جا رہے ہوں۔

پورے راستے زمانہ بدل گیا ہے۔ پہلے زمانے کے لوگ مروت والے لحاظ والے ہوتے تھے۔ اسی قسم کی سوچیں سرٹھاتی رہیں زمانہ کیسے بدل جاتا ہے..... زمانہ تو لوگوں سے ہے لوگ اپنے اعمال نہیں سدھارتے اور الزام زمانے کو دیتے ہیں۔

گھر آ کر پیٹ بھر کے قیرہ شملہ برج کے بھنے ہوئے سانک کے ساتھ گرم گرم روٹی کھائی..... تو تندرستی ہزار نعمت کے بعد جواب ہزار بلکہ دس ہزار نعمت لگا وہ گھر تھا..... اور باعث رحمت تھی۔

☆☆☆☆

صبح کا آغاز وہی روشنی کی ہڑ بونگ سے ہوا بھابھی کا اٹھنا لاڈلا انہیں عاجز کیے حسب معمول کچلی کا تاج چھپانا پھر رہا تھا۔ میں اسی جان کے لیے چائے بنانے کچن میں آئی تو بھابھی تیزی سے میری طرف آئیں۔

”سنو کوئل! حمزہ کے اسکول کے لیے رولز حل دینا پلیز.....“ اور ہاں وہ جاتے جاتے مڑ کے دوبارہ آئیں۔

”وہ ولی بھی آ گیا ہے اس کی بھی چائے بنا دو ساتھ ہی۔“ اف ولی ہمارے چچا صاحب کے ہونہار صاحب زاوے جو UET میں پڑھنے کے بعد اپنے آپ کو آئن اسٹائن کے جائین سے کم نہیں سمجھتے اور ٹیلیفونل انجینئرنگ کے آخری سال میں پہنچ کر ویسے بھی ان کا دماغ ساتویں آسمان سے نیچے نہیں اترتا۔ لیکن جہاں بات کھانے کی ہو تو بڑے بڑے ریسٹرز کو بھی پیچھے چھوڑ دیتے ہیں۔ اور کیونکہ حمزہ کا اسکول ولی کی یونیورسٹی کے راستے میں آتا ہے تو حمزہ کو اسکول چھوڑنے کے لیے جانے ولی صاحب اپنے گھر کے بجائے اپنے برابر والے گھر یعنی ہمارے گھر میں کھانا، پینا، ٹھونسا، اپنا پیدائشی حق سمجھتے ہوئے ہر روز صبح آج ہمارے گھر آدھکتے ہیں۔

”میں تو سمجھ رہا تھا یہ پرسکون فضا کچھ دن اور رہے گی۔ ہندو واپسی ہوگی مہارائی۔“

ایک تو۔ امریکن اسٹائل کے اوپن کچن میں

یہ بڑا مسئلہ ہے کہ تو آپ سڑک میں بڑے گندے برتن چھپا سکتے ہیں اور نہ ہی اپنے آپ کو ہمارے گھر میں توہین سامنے برآمدے میں آتے ہی نظر آ جاتا ہے کہ بچن میں کون ہے اور کیا کر رہا ہے میں اس کی بکواس سنی لہن کرتے ہوئے جائے کا پانی چڑھا کے پراٹھا بنانے کے لیے کینٹھ کھول کر گھی کا ڈبرو بیلن وغیرہ نکالے لگی۔

14

راہی سی شکل کے ساتھ کون اپناے گا کون کون۔
حالانکہ کہاں ولی، میکینیکل انجینئر..... کوئی جو تو نہیں
بنا لیکن اپنے ہی اپنوں کے عیب ڈھانچتے ہیں۔
”اے اے.....“ میں نے گرم چٹائیں اس
مرد کے سامنے کیا تو وہ بدک کے پیچھے ہٹا۔

سے مانگ مانگ کے پیتا ہے۔ اس کی بوتل تم ہو گئی ہے
 ناں اس کی مٹی کے پاس ہاتھ نہیں ہے۔ نید بوتل لینے
 کا.....“ حذرہ معصومیت سے صفائیاں رو بہ رہا تھا۔

”ہاں تو پھر آپ آکر دیکھیں۔ اس نے کون سا سوکھی روٹی بنائی پھر اتنا سارا سونگھی لگایا اس پر اسی لیے میں نہیں چاہ رہی تھی کہ اپنی روٹی خود بنائے یہاں۔۔۔۔۔ جب بھی اپنی روٹی بنائی ہے اس پر اتنا سارا سونگھی یا تیل ضرور لگاتی ہے۔“ بھابھی کہاں چپ رہنے والی تھیں۔

”ارے تو کیا ہو گیا ہمارا کون سا ایک دو چمچے سونگھی سے بہت بڑا نقصان ہو گیا اور کیا پتا ہے چاری کو وہ سونگھی والی روٹی کتنی پسند ہو۔ اپنے گھر میں تو یہ لوگ روٹی سونگھی ہی کھاتے ہیں نہ اچھا کھانا نہ اچھا پہننا۔۔۔۔۔ اور چار پیسوں کے لیے مارے مارے پھرنا۔ چلو ہم کچھ اور نہیں کر سکتے ان کے لیے ایک وقت کا اچھا کھانا ہی کھلا دیں۔۔۔۔۔ اور جو یہ تم اب جیسے پھینکو گی ان کو تنے میں تیل نہیں لگا کیا۔ اوپر سے تم بچے کو بھی یہ ہی تربیت دے رہی ہو کہ کسی کو نہ کھلائے بے مروتی تو خود کھار ہی ہوا تنے سے بچے کو۔۔۔۔۔“ اسی بھی جب شروع ہو جائیں تو چپ ہونے کا نام نہیں لیں۔۔۔۔۔ بھابھی ظاہر ہے کہاں تک برداشت کر تیں وہ بیٹے کا ہاتھ پکڑ کے میدان جنگ چھوڑ گئیں۔

اور وہی تو جھڑپ کے زور پکڑتے ہی پتی لگی سے نکل کے ٹی وی لاؤنج میں چناہ گزین شائد کوئی نیوز چینل آن کر چکا تھا۔

”وہیے امی آپ کو بھابھی کو ایسے نہیں کہنا چاہیے تھا۔“ اسی قرآن پاک شروع کرنے ہی والی تھیں کہ میں ہمت جمع کرتے ہوئے ان کے برابر تخت پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ”لو تو کیا میں نے غلط کہا۔ ارے اپنے لیے تو بھی خیال کر کے خرچ نہیں کرنی بس دوسروں کو دیتے ہوئے ہی جان جاتی ہے اس کی ابھی بازار جائے گی مجھے سے مہنگا سوٹ اٹھا کر لے آئے گی۔ اپنے لیے۔“ اسی سابقہ موقف پر ڈٹی قرآن پاک کا غلاف کھولنے لگیں۔

”لیکن امی آپ کو کبھی یوں سب کے سامنے مہناز بھابھی کو نہیں ٹوکنا چاہیے تھا۔ اس طرح انسان

بجائے سدھرنے کے مزید اکڑ جاتا ہے اور ویسے بھی کل ہم نے سورۃ حم مجدہ میں نہیں پڑھا تھا کہ سخت کلامی کا بھی بہت اچھے طریقے سے جواب دینا چاہیے۔“ پچھلا مجیدہ رمضان کا گزرا تھا اور رمضان کے مہینے سے ہم نے یعنی میں، بھابھی اور امی نے قرآن پاک ترجمہ سے پڑھنا شروع کیا اور میری تو پچھلیاں تھیں تو ابھی تک ہمارا یہ ہی معمول تھا کہ گھر کے کاموں سے فارغ ہو کر بھلے سے پانچ آیات ہی کیوں نہ پڑھیں پڑھتے ترجمہ کے ساتھ تھے اور امی کے ہاتھوں میں جو قرآن تھا اس میں کل کا نشان بھی لگا ہوا تھا۔

”یہ دیکھیں۔“ میں نے نشان پر انگلی رکھ کے کھولا۔ سورۃ حم مجدہ آیت نمبر 33۔

”نیک اور برائی برابر نہیں ہو سکتیں تو سخت کلامی کا ایسے طریقے سے جواب دو جو بہت اچھا ہو ایسا کرنے سے تم دیکھو گے کہ جو تمہارا دشمن ہے تمہارا گرم جوش دوست بن گیا ہے۔“

سورۃ حم مجدہ آیت نمبر 34 اور یہ بات ان ہی کو حاصل ہوئی ہے جو بہت برداشت کرتے والے بہت نصیب والے ہوتے ہیں۔“ القرآن ”بھی میں تو اسے عمل دے رہی تھی قرآن پاک کے حوالے پر امی کا لہجہ نرم پڑ چکا تھا۔

”مگر اس طرح ڈانٹ کر کہنے سے تو بات کا اثر ضائع ہو جاتا ہے نا۔۔۔۔۔ اب بھابھی باہر آئیں تو آپ ذرا اچھے طریقے سے بات کر لیجے گا پکیزہ۔۔۔۔۔ رہا ان سے کہتے کہتے میرا لہجہ انتہائی ہو گیا۔

”میں دیکھو ذرا مزہ تیار ہوا کہ نہیں۔“ یہ کہتے ہوئے میں اٹھ کے برآمدے سے ہوتے ہوئے ٹی وی لاؤنج سے گزر کے بھابھی کے کمرے کے دروازے کو کھٹکھٹانے ہی والی تھی کہ دلی صوفے سے اٹھ کر میرے سامنے آ گیا۔

”میں سوچ رہا تھا یقیناً مجھ میں ہی ایسی جو ہر شئ اس صفات ہوں گی۔“

”دلی پلیز ایسی امی ملی باتوں کو سننے کا بہرہ اور

موڈ نہیں ہے۔“ تیزی سے کہتے ہوئے میں نے اسے مزید کچھ بھی کہنے سے روکا۔

”بھئی دیکھو نا۔۔۔۔۔ میرے کو جو ہری ہی پرکھ سکتے ہیں۔“ وہ بھی بھلا کہاں چپ رہنے والا تھا۔

”تم میں کچھ تو بات ہے جب ہی تو میرا دل تمہاری طرف کھینچتا ہے۔“ اسی لمحے دروازہ کھلا۔

”چلو دلی جلدی۔۔۔۔۔ پہلے ہی بہت دیر ہو گئی ہے۔“ غلٹ بھرے انداز میں بھابھی نے حمزہ کا بیگ دلی کو پکڑایا اور دوسرے ہی لمحے وہ دونوں بھاگتے دوڑتے گھر سے نکل رہے تھے۔

میں اپنی اور بھابھی کی چائے اور اپنا خستہ پراٹھلا کر لاؤنج میں آ گئی۔ بھابھی صبح صرف چائے پیتی تھیں۔ بعد میں بھیا کے اٹھنے کے بعد دونوں، ساتھ ناشتہ کرتے تھے۔

امی صحن میں تخت پر بیٹھی اپنے صبح کے وظائف شروع کر چکی تھیں۔

”ویسے امی بھی نا۔۔۔۔۔ غصہ میں پتا نہیں کیا کچھ کہہ دیتی ہیں اور بعد میں شرمندہ ہوتی رہتی ہیں۔“

میں نے ہی گفتگو کا آغاز کیا۔

”تم بتاؤ کوئل ایسا میں نے کیا غلط کہا تھا جو انہوں نے اتنی سنا ڈالیں؟“ ناراض ناراض سے لہجہ میں غصہ کی بھی جھلک تھی۔

”بی بی تو۔۔۔۔۔ میں نے ان کی آنکھوں میں جھپکتے ننھے ننھے قطروں کو دیکھتے ہوئے یقین سے کہا۔“ اور

بعد میں انہوں نے کہیں کہیں میں نے ناحق کو اتنی سنائیں۔ یہ نہ کہہ سکی کہ بیٹی اللہ پر بھروسہ کرو اللہ اور دے گا انہاں سے ناراض کر دیا۔“

”تم یقین کرو کوئل!“ بھابھی کو بھی شائد ذرا ڈھارس ہوئی۔

”میرا بھی دل چاہتا ہے کہ غریبوں کی مدد کروں پر اس بوڑھی ہوتی مہنگائی سے خوف آتا ہے

اور پر سے امی کی دریا دلی ہے کہ تمہیں میں ہی نہیں آتی۔ تمہیں یاد ہے جب رو ما کارڈ آ گیا کسی طرح

ای نے ماسیوں کو اٹھا اٹھا کر سوٹ ڈیے۔ میں کہتی رہ

گئی کہ پہلے میڈیکل میں داخلہ تو ہو لینے دیں۔ یہ نہیں جب داخلہ ہوا تب دوبارہ انہیں نوازا گیا۔

کوئی کچھ سات ہزار تو صدقہ خیرات کی نذر ہو گئے اور ابھی تو۔۔۔۔۔ آج دودھ والے کو بھی امی نے اور پیسے دے کا کہا ہوا ہے۔ میں تو بس یہ کہتی ہوں کہ ہمیں

کل کی بھی تو فکر کرنی چاہیے حمزہ کی تو ابھی سے اتنی فیس ہے۔ پھر انسان اپنا بھی تو کچھ جوڑتا ہے۔

بھابھی نے جیسے اپنا ہی کچھ بلکا کیا۔

”اصل میں بھابھی امی کی بھی اپنی ہی سوچ ہے۔“ مجھے خود کچھ نہیں آیا کہ کیا بات کروں بھابھی

کی دلجوئی کروں کہ انہیں قائل کروں۔

”اب جیسے امی کتنا کہتی رہتی ہیں نا کہ صدقہ خیرات سے آزمائشیں اور مہینے میں مل جاتی ہیں۔۔۔۔۔

اب دیکھیں ماشاء اللہ سے ہماری روما کا میڈیکل کالج میں داخلہ ہو گیا۔ آپ کو پتا ہے اس کی دونوں

فرینڈز حالانکہ کتنا اچھا پڑھتی تھیں ان دونوں کا پرائیویٹ میڈیکل کالج میں داخلہ ہوا ہے۔

پرائیویٹ کالجوں کی تو فیس لاکھوں میں ہے۔ بس اللہ نے اپنا کرم کیا اور ہمیں اس مشکل سے بچایا۔ اصل

میں انسان جتنا بھی روک کے خرچ کر لے جہاں اللہ تعالیٰ نے پیسے خرچ کروائے ہوئے ہیں وہاں لگ

ہی جاتے ہیں۔ امی بس یہ ہی کہنا چاہتی تھیں کہ ضرورت مندوں کو دوتا کہ اللہ ہمیں کسی چیز کا محتاج نہ

کرے۔ لیکن بس غصہ میں الٹا سیدھا بولنے لگ گئیں۔ اور بعد میں شرمندہ ہوتی رہیں۔“

”نہیں خیر اس میں شرمندہ ہونے کی کیا بات ہے۔“ بھابھی نے چائے کا کپ ہونٹوں سے لگایا۔

”تمہیں بھی تو میرے سامنے کتنا ڈانٹ رہی ہیں۔“ شکر کہ لہجہ میں کچھ اپنائیت کچھ بردباری کی

جھلک نظر آئی۔ تو میں نے بھی اپنا پراٹھا چائے میں ڈبو دیا۔

”ویسے بھابھی کتنے پیسے دے ہیں دودھ والے کو؟“ نوالے کے اوپر میں نے گرم چائے کا گھونٹ بھرا۔ ہمارے دودھ والے کے جوان بیٹے کا

کچھ دن پہلے ہی فیکٹری میں کام کرتے ہوئے مشین میں آکے ہاتھ کٹ گیا تھا۔ اس نے جب ای کو اپنی دکھ بھری کہانی سنائی اسی نے تو اسی وقت پیسوں سے اس کی مدد کی اور اسی سلسلے میں آج بھی اور پیسے دیتے تھے۔

”دیکھو جتنے ہو سکے۔ ویسے کوئل جب سے یہ بغیر پانی ملا دودھ دینے لگا ہے۔۔۔۔۔ چاہے کتنی اچھی بنتی ہے نا۔“ بھابھی نے میری توجہ چاہنے کی طرف دلائی۔

”یہ تو ہے۔۔۔۔۔ آپ کو پتا ہے میں نے اتنا تھوڑا سا دودھ ڈالا تھا پھر بھی کتنے مزے کی چائے بنی ہے۔ چلو اس واقعہ سے اس کا ایمان اور اللہ پر بھروسہ تو مضبوط ہوا۔“ میں نے چائے کا مزہ لیتے ہوئے کہا۔

”لو تم کیا سمجھتی ہو۔۔۔۔۔ وہ سب لوگوں کو یہ خالص دودھ دے رہا ہے۔ پاگل ہم تو اس کے بیٹے کے علاج کے لیے پیسے دے رہے ہیں۔ اس لیے وہ ہمیں خالص دودھ دینے لگا ہے وہ بھی صرف چاروں سے، باقی پورے محل کو تو دیتی۔ پانی والا ہی دودھ ملتا ہے۔“ بھابھی نے جیسے میرے خیالات کا مذاق اڑایا۔

”نہیں۔۔۔۔۔ سچ بتائیں۔“ مجھے یقین نہ آیا۔
”تو اور کیا۔۔۔۔۔ ہمارا دودھ تو وہ الگ ایک چھوٹے سے ڈبے میں کسی سوغات کی طرح لے کر آتا ہے۔ سچ اتنا خالص اتنا گاڑھا دودھ۔ ہمیں پتا ہے پہلے تو دو کلو بھی پورا نہیں پڑتا تھا۔ میں تو سوچ رہی ہوں اگر یہ اسی طرح خالص دودھ دیتا رہے تو ہمارے لیے تو ایک کلو ہی کافی ہوگا۔“ بھابھی کے دماغ کے کنوینٹنل ناگ کو چپن مارتے اگر ہماری ای جان دیکھ لیتیں تو اپنے پاؤں سے پھل کے اس کا قلع قمع کر دیتیں خیر شکک تو میں بھی گئی تھی۔

”اور پتا ہے۔“ بھابھی اسی جوش سے شروع ہوئیں رات کو کہاٹے وقت میں اس میں دو گلاس پانی کے بھی ڈال چکی ہوں اب سوچو۔ میں کیا سوچتی۔

میں تو مینا بھابھی کے دل و دماغ میں کنجوسی کا ٹھکانا مارتا سمندر دیکھ رہی تھی۔ سچ کہہ رہی ہوں ایک کلو بہت ہے ہمارے لیے۔۔۔۔۔ پورے تین ہزار سات سو کی بچت ہے۔“

”خیر رہنے ہی دیں ہمیں بھی کچھ دن خالص دودھ انجوائے کرنا چاہیے۔“ میں نے لہروں کے آگے بند باندھنے کی کوشش کی۔

یا اللہ یہ اپنے نادر خیالات کا اظہار اپنی ساس کے سامنے کر کے مزید ڈانٹ سننے کا سبب نہ بنیں میں نے تہہ دل سے دعا کی۔

☆☆☆

گیٹ پر ہونے والی نیکل اس بات کی علامت تھی کہ دودھ والے چچا میاں تشریف لائے تھے جہاں اور اس تعمیراتی کے بعد کہ پورے محلے میں ایک واحد ہمارا اتنی وہ خوش نصیب گھر نہ ہے جو اللہ کی اس نعمت سے اپنی اصلی شکل میں بہرہ مند ہو رہا ہے وہ بھی فقط چاروں سے تو مجھے تو بہت ہی تاؤ آیا۔

”وہ جی پورا نہیں پڑتا۔ پانی نہیں ملاؤں گا تو کھاؤں گا کہاں سے اب تو جی بیٹے کا بھی علاج کروانا ہے۔ اس کے بھی دو بچے ہیں ان کو بھی جی اب میں نے ہی پالنا ہے۔“ امی کے تحت کے پاس رکھی کرسی پر بیٹھے چچا میاں صفائیاں دے رہے تھے۔
”آپ کے خیال میں اس ملاوٹ سے آپ کے سارے مسئلے حل ہو جائیں گے۔“ میں نے ان کے خیالات جاننے کی کوشش کی۔

”نہیں جی یہ میں نے کب کہا ہے۔ ہر انسان اپنی تو کوشش کرتا ہے نا۔“ چچا میاں نے مجھے لاجواب کر دیا۔

”یہ تو آپ غلط کوشش کر رہے ہیں کیا آپ کو اللہ پر بھروسہ نہیں۔“ میں نے سنجیدگی سے پوچھا۔

”اللہ پر تو ہے چھوٹی باجی۔ پر اس کے بندوں پر نہیں۔“ انہوں نے کرتے کی جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک مڑی مڑی پرچی میرے سامنے کی۔ ”یہ چھ ہزار کی روائیاں لکھی ہیں ڈاکٹر نے۔ اوپر سے میں

ہزار آرپیشن کا خرچہ۔ غریب آدمی بھلا کہاں سے دے، ہمیں بھی اللہ سے ڈر لگتا ہے۔ پر اللہ جانتا ہے دودھ میں پانی نہیں ملاؤں گا تو اتنی مہنگائی میں دو وقت کی روٹی بھی مشکل ہے۔“ چچا میاں بے چارگی سے بولے۔

”یہ مہنگائی آپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی آپ اللہ پر بھروسہ تو کریں، ہمت تو کریں جو اللہ نے حکم دیا ہے۔ وہ تو پورا کریں اللہ میاں آپ کا ضرور ساتھ دیں گے۔“ میں نے انہیں قائل کرنے کی اپنی پوری کوشش کی۔

”وہ جی بیٹا آپ کی بات ٹھیک ہے پر نہیں ہوتا گزارا تب ہی تو روزہ کے شوق ہے دودھ میں پانی ملانے کا۔“

”پھر تو اس کا مطلب ہے آپ کو اللہ پر بھروسہ ہی نہیں ہے۔“ تیزی سے بولی ماں گریہ نہیں دے رہے تھے چچا میاں۔

”کیسی باتیں کر رہی ہیں چھوٹی بی بی! وہ بے چارگی سے میرے پیچھے تخت پر بیٹھی امی کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگے۔

”اللہ پر تو سب ہی کو بھروسہ ہے۔“

”نہیں جب آپ یہ سمجھتے ہیں کہ اللہ میاں کی بات مان کر آپ کا گزارا نہیں ہو سکتا۔۔۔۔۔ اس لیے آپ دودھ میں ملاوٹ کرتے ہیں۔ اپنے دل کی مانتے ہیں شیطان کی مانتے ہیں۔ تو آپ کو یہ بھی مان لینا چاہیے کہ آپ کو اپنے رب پر بھروسہ نہیں۔“ میں شاید پہلے وہی سے صبح ہی صبح مغز ماری کے بعد پھر امی اور بھابھی کو بالترتیب سمجھانے اور بھاننے کے بعد چچا میاں سے سر پھوڑ رہی تھی تو آواز جذبات میں کچھ زیادہ ہی اونچی ہو گئی۔

”اے لڑکی تمیز سے بات کر۔ بڑے ہیں تم سے ابھی صبح مجھے کیسے من من کر کے سمجھا رہی تھی۔ ای آپ بھابھی کو ایسے نہ کہا کریں۔ بری بات ہے۔ نرمی سے بات کیا کریں۔ اب خود اتنی بدتمیزی کر رہی ہے۔“ امی نے تو جو کہا سو کہا سامنے بیٹا بھابھی کے

چہرے کے بدلے رنگ پھر ان کی وہی دلی دلی مسکراہٹ میرا تو خرمندگی سے برا حال۔ ایک تو بڑے میاں اس سے کس ہونے کا نام نہیں اور ایک میں جیسے پورے زمانے کو سدھارنے کا ٹھیکہ مجھے ہی ملا ہو۔

”تم اٹھو جاؤ اپنا ناشتہ ختم کرو۔“ میں جو دودھ والے انگل کے آتے ہی جذبات میں آکر اپنا ناشتہ سچ میں چھوڑ آئی تھی۔ بھابھی نے مجھے اٹھایا اور خود میری جگہ تخت کا کونا سنبھال لیا۔

”آپ کب سے دودھ میں پانی ملا رہے ہیں۔“ مجھے پراٹھے کا نوالہ منہ میں ڈالتے ہی ہنسی آگئی لگ رہا تھا جیسے بھابھی کسی ٹاک شو میں انٹرویو کر رہی ہوں۔

”ہمیشہ سے جی پتا نہیں کتنے سال ہو گئے۔“ چچا میاں کا تو بس نہیں چل رہا تھا کہ وہی تڑوا کے بھاگ جائیں۔

”اچھا یہ بتائیں اگر آپ کے پاس بہت سارا روپیہ پیسہ ہوتا تو آپ اللہ کی راہ میں خرچ کرتے؟“

”بالکل کرتے جی۔ کیوں نہیں کرتے ضرور کرتے۔“ چچا میاں بھی سوچ رہے تھے کہ آج کہاں بچھس گیا اور ایک امی ہمیں جو پیسے تھا کے اب دنیا سے بے خبر خرچ کرائے جا رہی تھیں۔ ان کا کام تھا مدد کرنا جو وہ کر چکی تھیں۔ اب چچا میاں جانیں ان کا کام۔

انسان جو تین لاکھ لاکھ کی طرف سے جوں کے توڑ سے تامل



فصل غم کا گوشوارہ
رضیہ جمیل

تقریباً 300 روپے

کتب مدران واگست 37 - اورماندہ کراچی - فون: 32735021



”اچھا آپ یہ ہی سمجھ لیں کہ آپ خالص دودھ بیچ کر اللہ کے بندوں کی مدد کر رہے ہیں۔ انسان تو صرف کوشش کر سکتا ہے۔ اس کی کمائی کتنی بڑھے گی کس طرح خرچ ہوگی سب اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ وہ چاہے تو بڑھا دے اپنی برکت سے اور چاہے تو اتنے خرچے نکال دے کہ کمائی کم پڑ جائے۔ ہم سب کو اپنے رب پر بھروسہ کرتے ہوئے صرف اسی کا کہنا ماننا چاہیے۔ چاہے حالات کچھ بھی ہوں۔ خود سوچیں اپنے رب کا ناراض کر کے کوئی کام اچھا ہو سکتا ہے۔ نہیں نا؟“

بڑے میاں تو بڑے میاں پیچھے بیٹھی اسی جان بھی بیچ روک کے بڑی توجہ سے بھابھی کی باتوں کو سن رہی تھیں۔

”کتنی اچھی طرح جتنا نے دودھ دالے کو سمجھایا کتنے بیمار سے ایک یہ لڑکی ہے لڑنے کو دوڑتی ہے غصہ تو ناک پر دھرا رہتا ہے اس کا۔“ سوچوں کا رخ بدل چکا تھا۔

چچا میاں کے جانے کے بعد ان کلمات میں اسی جان نے اپنے قیمتی خیالات کا اظہار کیا۔

خیر میں خوش تھی۔ چچا میاں فائل ہوئے کہ نہیں۔ لیکن ان کے تاثرات میں نمایاں تبدیلی آگئی تھی۔ جیسے انسان کو کچھ غلط ہونے کا احساس ہو جائے اور اوہل مرحلہ تو احساس کا، آگاہی کا ہی ہوتا ہے۔ کسی بھی غلطی کو ماننے، تسلیم کرنے کے بعد ہی اصلاح کے امکانات پیدا ہو سکتے ہیں۔

اسی کو ناشتہ دینے کے بعد میں بھابھی کو ڈھونڈتی میسر پر آگئی۔

”بھیا کو نہیں اٹھانا کیا جاو پر آگئی ہیں؟“

”ہاں اٹھانی ہوں۔۔۔۔۔۔ وہ آج ذیر سے جائیں گے۔“ وہ تار پر لٹکے کپڑوں کو اتارتی ہوئی بولیں۔

”بادل آئے تو میں نے سوچا کہ کہیں بارش نہ ہو جائے۔ اسی لیے کپڑے اتارنے آگئی۔“

”ویسے کوئل۔۔۔۔۔۔ دلی کھد ہاتھا۔“

”کیا۔۔۔۔۔۔ میں بھی کپڑے اتار اتار کر قرب

نگاہیں دد پر لگی ہیں، اُداس بیٹھے ہیں کسی کے آنے کی، ہم لے کے آس بیٹھے ہیں

نظر اٹھ کے کوئی ہم کو دیکھتا ہی نہیں اگرچہ بزم میں سب روشناس بیٹھے ہیں

الہی کیا میری رخصت کا وقت آ پہنچا یہ چارہ ساز میرے، کیوں اُداس بیٹھے ہیں

الہی کیوں تنِ مردہ میں جان نہیں آتی؟ وہ بے نقاب ہیں، تربت کے ماتھے بیٹھے ہیں

صوفی تبسم

میرے دل کو درد سے بھر گیا مجھے بے یقین سا کر گیا

میری بات بیچ میں رہ گئی تیرے شہر میں میرے ہم سفر

وہ دکھوں کا جمِ غفیر تھا مجھے راستہ نہیں مل سکا

میری بات بیچ میں رہ گئی امجد اسلام امجد

”تو اس میں اتنا ناراض ہونے والی کیا بات تھی؟ ان کا رشتہ تو تمہارے لیے بہت معقول اور مناسب تھا۔“ مریم نے سمجھانے کے انداز میں کہا۔
”میں کب کہہ رہی ہوں کہ ان کا رشتہ میرے لیے برا تھا۔ ناراضگی کی وجہ یہ بھی کہ وہ پچھلی رات بھی مجھ سے شادی کی درخواست کر چکے تھے۔۔۔۔۔ اور میں حامی بھر چکی تھی۔“ نازیہ نے بتایا۔
(گلشن اقبال..... لاہور)

غلط فہمی

بیوی شوہر سے۔ ”تم رات کو سوتے میں مجھے گالیاں دے رہے تھے۔“
شوہر۔ ”تمہاری غلط فہمی ہے۔“
”بیوی۔“ کیا غلط فہمی ہے۔“
شوہر۔ ”جی کہ میں سو رہا تھا۔“
(عائشہ مدثر..... لاہور)

ایسوی لینس

خاتون نے ایمر جنسی نمبر پر ایسوی لینس سینٹر فون کیا۔
آپریشنر نے مستعدی سے کہا ”ہیسن..... پلیز۔“
”میرے پاؤں کی انگلی چائے کی میز سے گرا گئی ہے۔“ خاتون نے کراہتے ہوئے کہا۔
آپریشنر نے جپتے ہوئے کہا۔
”اور اس کے لیے آپ ایسوی لینس منگوانا چاہتی ہیں؟“
”نہیں..... ایسوی لینس تو میں اپنے شوہر کے لیے منگوا رہی ہوں..... اب دیکھو، انہیں منسنا تو نہیں چاہیے تھا۔“ خاتون نے بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

آپ اپنے دام میں

ایک دیہاتی مسافر ایک دیوے پلیٹ فارم پر بیٹھا رو رہا تھا اور کہہ رہا تھا۔
”میری بیوی کو میرے ساتھ کا مسافر بھگا کر لے گیا، میں برباد ہو گیا۔“
اس کے گرد بہت سے لوگ جمع ہو گئے۔ ایک لوجوان نے ازراہ ہمدردی اس دیہاتی مسافر کو شور دیا۔
”دوست! اس طرح تو تمہاری بیوی کا ملنا بہت مشکل ہے، بہتر ہے کہ تم اس واقعے کی رپورٹ پولیس اسٹیشن میں درج کروادو۔“
دیہاتی روتے روتے چپ ہو گیا اور سچیدگی سے بولا۔
”میں یہی تو نہیں کر سکتا بھائی! کیونکہ میں خود دوسرے کی بیوی بھگا کر لایا تھا۔“
(آمنہ بی بی..... حیدر آباد)

بھولا بابا

بابا بے شک بھولا بھالا سادا ہے
جانے سے چروں کا اب بھی دلدادہ ہے
چلنے کھنچنے اس کے کمر ہی چلتے ہیں
شادی کرنے پر اب بھی آمادہ ہے
(عزیز احمد..... کراچی)

برہمنی

مریم نے نازیہ سے پوچھا۔
”کل تم عارف صاحب پر اتنی ناراض کیوں ہو رہی تھیں اور انہیں اتنا برا بھلا کیوں کہہ رہی تھیں؟“
”وہ مجھ سے شادی کی درخواست کر رہے تھے۔“ نازیہ نے براسمانہ بنا کر جواب دیا۔

تم ایسا کرنا کہ کوئی جگنو، کوئی ستارہ سنبھال رکھنا
مرے اندھیر دل کی فکر چھوڑو، بس اپنے گھر کا خیال رکھنا
ایسا موسم میں ریت دھرتی پہ فصل بوئی تھی پانڈی کی
اب اس میں اگنے لگے اندھیرے تو کیسا جی میں ملال رکھنا
دیوار اگت میں اجنبی کو، سفر ہے دریش ظلمتوں کا
کہیں وہ راہوں میں کھو نہ جائے، دروازہ کھول کر جان رکھنا
پچھڑنے والے نے وقت بھرتی کچھ اس نظر سے دیکھ دیکھا
کہ جیسے وہ بھی یہ کہہ رہا ہو، تم اپنے گھر کا خیال رکھنا
یہ دھوپ چھاؤں کا کھیل ہے، یا خزاں بہاؤں کی گھات ہے
تصیب صبح عروج ہو تو، نظر میں شام زوال رکھنا
کے جسے کہ کب یہ موسم اڑ لے رکھ دے گناہ کی آند
تم امتیاز نہیں کے سرو پر فلک کی جاو ہی ڈال رکھنا
اعجاز احمد آند

عم سے پہل رہے ہیں آپ آپ بہت عجیب ہیں
درویش دھل رہے ہیں آپ آپ بہت عجیب ہیں
سایہ وصل کب سے ہے آپ کا منتظر
ہجر میں مل رہے ہیں آپ آپ بہت عجیب ہیں
اپنے خلاف فیصلہ، خود ہی لکھا ہے آپ نے
باتھ بھی مل رہے ہیں آپ آپ بہت عجیب ہیں
زحمت قربت دگر، دوست کو دیکھتے نہیں
گر کے سنبھل رہے ہیں آپ آپ بہت عجیب ہیں
دائرہ دار ہی تو ہیں، عشق کے راستے تمام
راہ بدل رہے ہیں آپ آپ بہت عجیب ہیں
دشت کی ساری رونقیں جیسے گھر میں ہیں تو کیوں
گھر سے نکل رہے ہیں آپ آپ بہت عجیب ہیں
اپنی تلاش کا سفر، ختم بھی کیجئے کبھی
غائب میں مل رہے ہیں آپ آپ بہت عجیب ہیں
میرزاہ قاسم

(نورین شاہ..... کراچی)

ڈکٹری

کسی فرم کے ایک سینئر مینجر ریٹائر ہوئے تو ساتھیوں نے انہیں الوداعی پارٹی دی۔ کھانے کے بعد ان کے جانشین نے تقریر کے دوران کہا۔

”آج ہم میں سے ایک ایسا شخص جدا ہو رہا ہے جو خوف اور بزدلی کے مفہوم سے نا آشنا ہے۔ جسے ظلم اور زیادتی کے معنی نہیں آتے، جو شکست کے مفہوم سے بھی نا آشنا ہے۔“

تقریب میں پیچھے کی طرف بیٹھے ایک صاحب نے زیر لب کہا۔

”تو پھر تجھے کے طور پر انہیں ڈکٹری دے دی جائے۔“

(عائشہ صدیقیہ..... راولپنڈی)

سیلفی

ماں گھبرائی ہوئی بولی۔ ”بیٹا! جلدی آ جاؤ، بہو کو فاج کا ایک ہوا ہے۔ منہ میڑھا، آنکھیں اوپر اور گردن گھوم گئی ہے۔“

”رہنے دیں امی! وہ سیلفی لے رہی ہوگی۔“ بیٹے نے جواب دیا۔

(سونیا خان..... جھنگ)

تحریر شناس

ایک خاتون تحریر شناسی کے حوالے سے بڑی معروف تھیں۔ وہ خواتین کے ایک مقبول ماہر تھیں۔ میں ”تحریر شناس“ کے عنوان سے ایک کالم بھی لکھتی تھیں اور اس سلسلے میں انہوں نے خواتین کو دعوت عام دے رکھی تھی کہ وہ انہیں کسی بھی شخصیت کی تحریر کا نمونہ ارسال کریں تو وہ اس کی عادات، خصائص اور کردار کے بارے میں بہت سی سچ اور مفید باتیں بتا سکتی ہیں۔ خواتین بہت ذوق و شوق سے انہیں تحریروں کے نمونے ارسال کرتی تھیں جن میں ان کی

اپنی تحریروں کے نمونے کم اور دوسروں کے زیادہ ہوتے تھے۔

ایک خاتون نے تحریر کا ایک نمونہ انہیں بھیجے ہوئے لکھا۔

”یہ ان صاحب کی تحریر کا نمونہ ہے، جن سے میں محبت کرتی ہوں۔ براہ مہربانی اس کا بہت توجہ سے تجزیہ کر کے بتائیے کہ یہ اچھے شوہر ثابت ہو سکیں گے یا نہیں؟“ خاتون تحریر شناس نے انہیں کالم میں جواب دینے کے بجائے براہ راست جواب ارسال کرتے ہوئے لکھا۔

”مختصر! اس تحریر کا تجزیہ کرنے کے لیے مجھے زیادہ توجہ یا غور و فکر کی ضرورت نہیں پڑی۔ اس تحریر کا حامل شخص تین سال میرے لیے تو اچھا شوہر ثابت نہیں ہو سکا۔ اچھا ہوا کہ آپ نے قسمت آزمائی سے پہلے اس کی تحریر کا نمونہ مجھے ارسال کر دیا۔“

(خوشنشاں..... سیالکوٹ)

مساوات

کسی نے ایک دفعہ چاچے بخٹے سے عرض کی کہ خواتین کو برابر کے حقوق ملنے چاہئیں۔

چاچا: ”پترا! اصولی طور پر تو میں اس کا حامی ہوں لیکن تمہاری چاچی مجھ سے چار تھو دو (زیادہ) ہے۔ وہ میری برابری پر نہیں مانتی گی۔“

(زرین گل..... سکھر)

پچو کا انتقام

پچو گلی میں کرکٹ کھیل رہا تھا کہ بال ایک گھر کی کھڑکی کا شیشہ توڑتی اندر چلی گئی۔

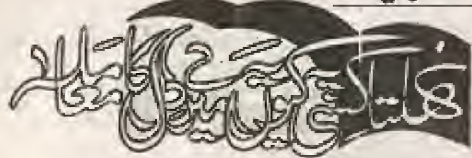
گھر کے مالک جاوید صاحب نے بچوں کو گیندواہیں نہیں کی۔ اگلے دن جاوید صاحب اپنی بیگم کے ساتھ پارک میں کھیل رہے تھے کہ اچانک پچو سامنے آ کر بولا۔

”انکل! اوہ کل والی آئی زیادہ اچھی تھیں۔“

اب جاوید صاحب دو دن سے بغیر کچھ کھاتے پیے پچو کو ڈھونڈ رہے ہیں۔

(عالیہ رشید..... ہری پور)

خدا کا فیصلہ



خدا بچہ سارنگ ہرچ داؤد والا، نمبر تم آئے ہو نہیں بھی آزمائے دیکھ لیتا ہوں تمہارے ساتھ بھی کچھ دھڑکے دیکھ لیتا ہوں

فاطمہ رانی داؤد والا، نمبر یہاں منظر سے پس منظر تک جراتی ہی جراتی ہے

سکھتی اصل کا بچہ نہیں کھلتا کبھی پچا خراب نہیں ہوتا

مستم بیز حسین عشق بار درگہ ہوا ہی نہیں

دل لگا گیا تھا، لگا ہی نہیں ایک سے لوگ، ایک سی باتیں

گھر بدلنے کا فائدہ ہی نہیں اقصی ناصر

جن دوستوں کی کمی ہے آج حیات میں وہ اپنے درمیان تھے، ابھی کل کی بات ہے

ماہا بیز حسین محبتوں کا سبز، اس طرح بھی گزرا تھا

سکتے دل سے خائف، سکتے پانی نہ سخی

بچھڑتے وقت ان آنکھوں میں تھی ہماری غزل

غزل بھی وہ، بکھی کو ابھی سنائی نہ سخی

شازبہ عالم بیروانی کدہ پاں خاص

تو نے دیکھا ہے نڈر روں پر جراتی کو فقط

میں نے جلتا ہوا ہر قدور میں انسان دیکھا

رانی ریاض کراچی

تمہیں پا کر بھی مشکل میں تھے

تمہیں کھو کر بھی بھجناٹے بہت

ان آئے جاتے طوں نہیں

میرے دل کو تم یاد آئے بہت

نرہ، اقرا کراچی

کچھ خوشیاں، کچھ آنسو، کچھ حیرانی ہوتی ہے

ہر انسان کے پیچھے ایک کہانی ہوتی ہے

غجد اکرم گاؤں گولیک

ہزار سال سے میں عالم فراق میں ہوں

میرے گلاب سے وہ لہجہ جسے گزرنا تھا

نوال افضل گل

محبتوں کا سبز، اس طرح بھی گزرا تھا

سکتے دل سے سافز، شکستہ پانی نہ سخی

بچھڑتے وقت ان آنکھوں میں تھی ہماری غزل

غزل بھی وہ، بکھی کو ابھی سنائی نہ سخی

رسمانہ پودری مدد کے

وہ جو کہتا تھا کچھ نہیں ہوتا

اب جو دہانے تو چپ نہیں ہوتا

ظاہر حسین ٹیکسٹ

اب لا حاصل کا ملال ہے درد

مجھے کب کوئی شعر کہنا ہے

کوثر خالد

برسوں کے بعد اس نے جو آواز دی

تدوین کی کیا باطاعتی، سائیں بھی رک گئیں

شنا ذوالفقار

ایک بھولی ہوئی بات ہے، اک ٹوٹا ہوا خواب

ہم ازل محبت کو یہ املاک بہت ہے

ایمان کا حوالہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ "مومن بھولا بھالا شریف ہوتا ہے اور ناسخ دھوکا یا فکینہ ہوتا ہے"۔
 ف۔۔۔ حدیث کثیرہ کثرت کا مطلب یہ ہے کہ مومن کی طبیعت میں چال بازی اور مکاری نہیں ہوتی وہ لوگوں کو تکلیف پہنچانے اور ان کے ہاتھ میں بدگمانی کرنے سے اپنی طبیعت شرافت کی وجہ سے دور رہتا ہے۔ اس کے برخلاف فاسق کی طبیعت ہی میں دھوکا دہی اور مکاری ہوتی ہے۔ نقد و خداد جھیلانا ہی اس کی عبادت ہوتی ہے۔

بے وقوف اور حلوہ

حضرت فضیل رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا۔ "عقل مندوں کے ساتھ ہنسنا بے وقوفوں کے ساتھ حلوہ کھانے سے زیادہ کربان ہے"۔
 انصاف و نادرہ کراچی

رجبیت آخرت

"جس حالت میں کہ دنیا میں کی ہے اور فانی ہے اور آخرت میں ہے اور باقی ہے، تو رجبیت آخرت کے ساتھ ہونی چاہیے نہ کہ دنیا کے ساتھ"۔
 اقرا نمبر کراچی

بے قابو زبان

حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ زبان سارے بدن کی اصلہا کی بنیاد ہے۔ جب زبان ٹھیک ہو جائے تو مارے اعضا ٹھیک ہوجاتے ہیں۔ اور جب زبان بے قابو ہوجاتی ہے تو تمام اعضاء بے قابو ہوجاتے ہیں۔ (خریج ابن ابی الدیانی النعت)

زبان کی احتیاط

حضرت عیسیٰ بن عقیلؑ کہتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ اس ذات کی قسم جس کے علاوہ کوئی مسعود نہیں۔ دوسرے زمین پر کوئی ایسی چیز نہیں ہے جسے زبان سے زیادہ عمر قیدی ضرورت ہو۔
 حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا۔ "میں نہیں سمجھتا کہ باتیں کرنے سے ڈرنا تاہوں اور بقدر ضرورت بات کرنا ہی تمہارے لیے کافی ہے"۔
 حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا۔ "تمہارے دہانے سے زیادہ خطا میں ان لوگوں کی ہوں گی جو دنیا میں فضول بحث و مباحثہ کرتے رہتے تھے"۔

کھانے کے آداب

بچے میں سب سے پہلے کھانے کا شوق پیدا ہوتا ہے لہذا لازم ہے کہ اس کو کھانا کھانے کے آداب سکھائیں۔ تاکہ وہ سیدھے ہاتھ سے کھانے اور ہم اللہ بڑھ کر کھانا شروع کرے۔ جلدی جلدی نہ کھائے۔ اچھی طرح چبائے۔ دوسروں کے نالوں پر نظر نہ کرے۔ اپنے سامنے سے لے کر آٹھانے اور جب تک ایک نوالہ نہ نکلے، دوسرا نوالہ نہ لے۔ کھانے کو ہاتھوں پر نہ لگے دے اور نہ کپڑے خراب کرے۔

کسی بھی کھانے کو روکھی روٹی بھی کھائیں۔ اگر وہ پیٹھ مارن کا طالب نہ ہو۔ بچے کے سامنے پیاز پوری کی مٹیت کریں اور بتائیں کہ یہ کھانے والے اور معتدل کھانے۔ اور اس کے سامنے چوتھنے کی مٹیت کی جلتے اور باادب بچے کی تعریف کریں تاکہ اس کی تعریف کی کر

اس میں حمیت پیدا ہو اور وہ خود بھی اس پر عمل کرنے لگے۔

قطع رحمی

حضرت عثمان بن عفانؓ کے آزاد کردہ غلام حضرت

ابوالب یمانؓ کہتے ہیں۔ ایک مرتبہ حضرت ابو ہریرہؓ، شب جمعہ میں جمعرات کی شام کو ہوا سے یاں تشریف لائے اور فرمایا۔ ہماری اس مجلس میں جو بھی قطع رحمی کرنے والا بیٹھا ہوا ہے میں اسے بے ادبی تاکہ سے کہتا ہوں کہ وہ ہمارے پاس سے اٹھ کر چلا جائے۔ اس پر کوئی کھڑا نہ ہوا۔ انہوں نے یہ بات میں دفعہ پہن تو اس پر ایک جوان اپنی بھوپھی کے پاس گیا جس سے اس نے دو مال سے تعلقات ختم کر رکھے تھے اداسے چھوڑا ہوا تھا۔ وہ حسب اپنی بھوپھی کے پاس پہنچا تو بھوپھی نے اس سے پوچھا۔ "میاں! تم کیسے آئے؟"

اس نے کہا۔ "میں نے ابھی حضرت ابو ہریرہؓ کو ایسے اور لیے فرماتے ہوئے سنا ہے" (اس وجہ سے آیا ہوں)۔

بھوپھی نے کہا۔ "ان کے پاس والیں باؤ ادا ان سے پوچھ کر انہوں نے ایسا کیوں فرمایا ہے؟" اس تو جوان نے والیں باکران سے پوچھا تو حضرت ابو ہریرہؓ نے فرمایا۔

"میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ شب جمعہ میں ہر جمعرات کی شام بنی آدم کے اعمال اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش کیے جاتے ہیں (اور انہوں کے اعمال قبول ہو جاتے ہیں لیکن) قطع رحمی کرنے والے کا کوئی عمل قبول نہیں ہوتا۔"

(خریج البخاری فی الادب)

ایمان کامل

جب تک مسلم زمین پر ایک بھی شخص ایسا ہے جس کا تیرے دل میں خوف یا اس سے کسی قسم کی توقع ہو، اس وقت تک تیرا ایمان کامل نہیں"۔ (شیخ عبدالقادر جیلانیؒ)

صوفی وہ ہے

"صوفی وہ ہے جس کے ایک ہاتھ میں قرآن مجید اور دوسرے ہاتھ میں سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔"

(علی ہجویریؒ)

تکمیل انسان

انسان کی تکمیل تین چیزوں سے ہوتی ہے۔
 1۔ خوف 2۔ امید 3۔ محبت۔
 1۔ خوف خدا گناہ سے بچاتا ہے۔
 2۔ امید اطاعت پر آمادہ کرتی ہے۔
 3۔ ادب محبت میں محبوب کی رضا کو دیکھنا پڑتا ہے۔

بوشیدہ مہر

دنیادار اور دولت مند بڑی بلا میں گرفتار ہیں کہ دنیا کی مادی مہر مہر کو دیکھتے ہیں اور دینی مہر مہر ان سے بوشیدہ رہتی ہے۔

(بخاری کاکیؒ)

تو اور تیرا سب کچھ تیرے باپ کا ہے،

ایک صحابی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے باپ کی شکایت کی کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرا باپ مجھ سے پوچھتا نہیں اور میرا مال خرچ کر دیتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ان کے والد کو بلاؤ۔ جب ان کے والد کو بتایا گیا کہ میرے بھٹے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے میری شکایت کی ہے تو دل میں رنجیدہ ہوئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضری کے لیے ملے۔ چونکہ عرب کی لکھی میں شاعری تھی تو راستے میں کچھ اشعار دہن میں ہوا کے جھونکے کی طرح آئے اور چلے گئے۔

شعاع کے ساتھ ساتھ

(ادارہ)

حمنی اقبال..... منڈی فیض آباد

(1) شعاع کب پڑھنا شروع کیا یہ تو نہیں یاد کیونکہ تب میں بہت چھوٹی تھی شاید دس، گیارہ سال کی تب تو معنی بھی ٹھیک طرح سے سمجھ میں نہیں آتے تھے۔ خیر اتنی بھی پرانی نہیں ہوں میں ابھی تو بیس کی ہوئی ہوں۔ ہمارے گھر میں رسالے پڑھنے کی پابندی نہیں تھی پہلے ای اور پھر آلی انم پڑھتی تھیں ان کی ساتھ ساتھ میں بھی شروع ہوئی تقریباً دس سال ہو گئے ہمارے ساتھ کو..... اور یہ ساتھ خیر سے بہت اچھا رہا اور بہت کچھ سیکھنے کو ملا شعاع سے۔

(2) صبح کا آغاز تھوڑی دیر سے ہی ہوتا ہے۔ لیکن صبح اٹھ کر سب سے پہلے نماز پڑھتی ہوں قرآن پاک پڑھ کر اپنے اوپر دم کرتی ہوں۔ اس کے بعد گھر کی صفائی کرتی ہوں۔ صفائی میں کچھ زیادہ نہیں ہوتا کیونکہ رات کو بی اور چچی خانے کی صفائی کر لیتی ہوں مطلب برتن صاف کر کے چیزیں وغیرہ سمیٹ کر بی سوتی ہوں اس لیے کچھ زیادہ نہیں ہوتا پھر اسکول جانے کی تیاری..... نہیں نہیں جناب میں اسکول میں پڑھتی نہیں ہوں بابا بابا..... بلکہ میں اسکول میں پڑھانے جاتی ہوں ہاں جی میں حمنی اقبال فوج بھی ہوں ساتھ ساتھ اپنی پڑھائی بھی مکمل کر رہی۔ اسکول میں جانے سے پہلے تیار ہو کر جلدی جلدی ناشتا اسکول کو بھاگتی ہوں۔

ہاں جناب کیونکہ اسکول کو درپور رہی ہوتی ہے میری کزن عائش پہلے ہی اسکول کے لیے نکل جاتی ہے پھر میں بھی دوڑ لگا دیتی ہوں اور دس منٹ جاتے ہوئے گلتے ہیں اور میں پھر بھی اس سے پہلے اسکول میں داخل ہوتی ہوں۔ اسکول میں بہت اچھا وقت گزرتا ہے۔

اسکول سے آ کر نماز پڑھ کر کھانا کھاتی ہوں۔ کہ ٹیوشن والے بچے آنے لگتے ہیں۔ ہاں جی اب میں کیا کروں اسکول والے جان چھوڑتے ہیں اور نہ ہی ٹیوشن والے بچے جان چھوڑتے ہیں کیونکہ میں ہوں ہی بہت اچھی اور سچی بات ہے میرا بھی دل نہیں کرتا ان کو چھوڑنے کو..... سب کہتے ہیں کہ جب تمہاری شادی ہوگی تب ہی جدا ہوں گے ہم، ورنہ نہیں اور میں پاگل، بے وقوف یہ بات سن کر ہی خوش ہو جاتی ہوں۔ بابا بابا.....

ان سے فارغ ہو کر کھانا وغیرہ بناتی ہوں۔ کھانا کھا کر ہم سب مل کر بیٹھ جاتے ہیں باتیں وغیرہ کرتے ہیں۔ لی وی دیکھتے ہیں ہم تین بہنیں بھائی ہیں دو بہنیں اور ایک بھائی..... آپ کی شادی ہوئی ہے خیر سے اور میں گھر میں چھوٹی ہوں اور لاڈلی سی..... باورچی خانہ صاف کر کے دس بجے سو جاتی ہوں۔

(3) افسانوں میں سب کچھ خیالی ہوتا ہوگا مجھے نہیں لگتا کیونکہ بس یہ سب سچ ہے اور میں خود بھی خوابوں کی دنیا میں رہنے والی لڑکی ہوں۔

(4) خوبیاں اور خامیاں..... خامیاں یہ ہیں کہ میں غصہ بہت جلدی کر جاتی ہوں اور بس ایک ہی خامی ہے اور سب کچھ بہت اچھا ہے۔ یہ میں نہیں کہہ رہی، سب کہتے ہیں۔

خوبیاں بہت سی ہیں، سب سے بہت پیار کرتی ہوں، کسی کو مشکل میں نہیں دیکھ سکتی، کسی کی تکلیف برداشت نہیں ہوتی، ہر وقت ہنسی رہتی ہوں اور اس طرح جو کوئی پریشان ہو، وہ میری مسکراہٹ دیکھ کر خوش ہو جاتا ہے۔ کیونکہ میری مسکراہٹ بہت پیاری ہے۔ اپنی وجہ سے کسی کو پریشان نہیں کرتی، کسی کو دکھ دینے کا سوچ بھی نہیں سکتی اور بھی بہت کچھ لیکن اب

بس کیونکہ نظر لگ جانے کا اندیشہ بھی ہوتا ہے۔

(5) شعاع بہت اچھا، بہت زبردست ہے۔ ہر انداز اچھا ہے، اس کی کسی چیز کی تعریف کروں بس یہ کہ ایسا اچھا مجھے کوئی کوئی لگتا ہے۔ اور شعاع مجھے بہت اچھا لگتا ہے تحریریں ایسی دلنشین ہوتی ہیں کہ ایسا لگتا ہے کہ ہم اس کے سحر میں گم ہو گئے ہیں۔

(6) مجھے بارش بہت اچھی لگتی ہیں میں بہت انجوائے کرتی ہوں۔ خاص طور پر سردی کی بارش اف

بہت مزہ آتا ہے۔ سردی مجھے بہت اچھی لگتی ہے اور مٹی کی خوشبو..... کیا بات ہے۔ اس سال کا ایک واقعہ بتاتی ہوں کہ بہت سردی تھی ایک صبح میں اسکول گئی میری کلاس میں ایک گھڑی ہے۔ جسے کھول کر اس کے سامنے گھڑی ہو گئی۔ سب نے کہا سردی لگ جائے گی لیکن پرواکس کو بھی میری فرینڈ آئی اس نے کہا حمنی پلیز ایسا نہ کرو، میں یہ کہہ کر ٹھیک ہے تھوڑی دیر بعد بند کر دیتی ہوں، تھوڑی دیر بعد میں نے بند کر دی لیکن مت پوچھو کہ میرا کیا حشر ہوا۔ اتنی سردی ہوئی لگی کہ بس۔

(7) میری پسندیدہ کتاب قرآن مجید ہے۔ میں سب سے زیادہ پیار لی بی فاطمہ سے کرتی ہوں اور وہ میرے لیے مشعل راہ ہیں۔ میں ان کو اپنا لیڈر سمجھتی ہوں اور میرا موٹ فیورٹ ناول جنت کے پتے ہیں بہت اچھا ناول ہے۔

(8) اقتباس: جس کے دل میں عشق مقیم ہو جائے اس دل میں ہمیشہ درد کا دھواں بھرا رہتا ہے۔ جو پوری جان کو سلگائے رکھتا ہے۔ وہ بھی اس کو جلا کر نیست و نابود نہیں کرتی، بلکہ اس کو پا کر مضبوط کر دیتی ہے پھر وہ ٹھنڈا ٹھنڈا چشمہ بن جاتا ہے جس سے ہر پیاسا اپنی پیاس بجھاتا ہے۔

”محبت کو تقسیم نہ کرو، ضرب دو، تقسیم سے بچی ہے، ضرب سے بڑھ جاتی ہے۔“

شمن شفیق..... راولپنڈی

نام تو میرا آپ جان ہی چکے ہوں گے تک نیم ”سنی“ ہے اور یقین کیجیے ہر طرف سے ”سنی“ سننے کی اب اتنی عادت ہو گئی ہے کہ اگر کوئی شمن پکارے تو بہت ہی اوپر لگتا ہے۔ بہر حال.....

(1) شعاع کے ساتھ وابستگی کے بارے میں اتنا ہی لکھوں گی کہ جب تین سے چار بچوں کے لفظ پڑھنا بہت مشکل لگتا تھا اور جب بہت سے الفاظ کے معنی سمجھ میں بھی نہیں آتے تھے تب سے پڑھتی ہوں اور مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں بچہ بچہ کھیلتے ہوئے

اپنے (فرضی) اسٹوڈنٹس کے نام ناول میں موجود کرداروں کے ناموں پر رکتی تھی۔ تو بس..... بے قاعدہ تو کافی عرصہ پڑھا البتہ باقاعدہ پڑھنا پانچ سے چھ سال قبل شروع کیا۔

(2) صبح کا آغاز ماما کی آواز سے ہوتا ہے۔ نماز پڑھ کر سب بہن بھائیوں کو چگانا اور سب سے چھوٹی لالہ کو اسکول کے لیے تیار کرنا میری ذمہ داری ہے۔ بعد ازاں گھر کی صفائی..... تقریباً ساڑھے نو بجے تک سب کاموں سے فارغ ہو کر میں اور ماما شہد کرتے ہیں کیونکہ دس بجے مجھے مسجد جانا ہوتا ہے جہاں پر میں عالمہ بننے کا دوسرا دور کر رہی ہوں۔ تقریباً بارہ بجے تک واپسی ہوتی ہے، اس کے بعد دو بجے تک کا وقت شعاع، خواتین کے لیے ہوتا ہے۔ اس کے بعد نماز پڑھتی ہوں۔

اس دوران بہن بھائی اسکول سے آ جاتے ہیں۔ کھانا وغیرہ کھا کر اور تھوڑا کھیل کر یہ سب مسجد چلے جاتے ہیں اور میں ایک دفعہ پھر سارا کھراوا سمیٹ کر لیٹ جاتی ہوں۔ تھوڑا آرام (آرام سے مراد لیٹ کر غواٹیں، شعاع کا مطالعہ) کرنے کے بعد ٹیوشن، ف، اف.....

مغرب کے وقت بھائی آفس سے واپس آ جاتا ہے اور پاپا سے سب کی بات کروا تا ہے۔ اور مجھے ٹھہا

زیر مطالعہ ہیں، پر شعاع کے کیا کہنے۔ وقت کے ساتھ شعاع میں بھی کافی تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں جیسے پھولوں، بادلوں، تلیوں کے قصے، وہ نوک جھونک، ہنسی چھیڑ خانی، محبتوں کے قصے۔ فائزہ افتخار، بشری سعید، شازیہ چوہدری، نگہت عبداللہ اور ماہا مالک کی تحریریں، جن کی نظیر نہیں ملتی اب۔ شعاع میں وہ پہلے کی ہی بات نہیں رہی۔

یا پھر وقت بدلنے کے ساتھ انداز تحریر میں سادگی کی جگہ بناوٹ اور مصنوعی پن نے لے لی۔ تاہم اب بھی دیکھا جائے تو ان سب کے باوجود شعاع کا معیار دیگر رسائل سے اعلیٰ ہے۔

(2) صبح کا آغاز اس امید کے ساتھ کرتی ہوں کہ آج ناسی کل کبھی اپنے گھر جا کر میاں جی سے بیڈ ٹی جیسے غرے اشواؤں کی (خالی پاؤں) جی، یہ میرا خواب تھا بچپن سے، کم از کم مجھے میں تو لڑکیوں کو اس طرح کے خواب دیکھنے پر کوئی پابندی تو نہیں۔

پھر روٹین کے کام، گھر داری، آج کل میں دل جی سے کوئی کنگ سیکھ رہی ہوں۔ امی کہتی ہیں لڑکی اگر ہر فن میں طاق ہو تو سب کچھ سن جاہل جاتا ہے۔ بس یوں ہی یہ بات میں نے اپنے پلو سے باندھ لی، پھر مطالعہ، لی وی۔ بس یوں ہی دن تمام ہو جاتا ہے اور پھر ایک نئی صبح کا آغاز..... نئی امید اور عزم وہی پرانا، بھئی میاں جی کو گھر داری سکھانا، گھر بنانا۔

(3) خوبیاں اور خامیاں، اپنی زبان سے یہ سب بیان کرنا کافی مشکل ہے اور خوبیاں اگر دیکھی جائیں تو حساس ہوں کافی زیادہ۔ اسی نرم کردار کی بات پر آنسو نکل آتے ہیں۔ تھوڑی تازک مزاج

ہوں، جلد دوسروں کی بات دل پر لے لیتی ہوں اور ویسے ہی جلد دوسروں پر اعتبار بھی کر لیتی ہوں۔

اپنوں کا اور خود سے وابستہ لوگوں کا خیال رکھتی ہوں تھوڑی سی جونی ہوں۔ شاید اس لیے بچوں کی فیورٹ آنٹی ہوں۔ جی ایسے ہی ایک ہی لسٹ ہے

اور رہی برائیاں تو خیر جہاں پھول وہاں کاٹنے تو ہوتے ہی ہیں (آہم آہم)۔

بقول عائشہ کے، بہت سادہ ہوں، جلد دوسروں پر اعتبار کر لیتی ہوں۔ اس وجہ سے بہت بامدت کی بھی گھائی پڑی، تھوڑی آڈٹ اسپون ہوں۔ اس وجہ سے کافی مشکل اٹھانی پڑی، خیر اب کوشش کر رہی ہوں، اپنی بری عادتوں سے چھڑکنا پانے کی۔

(4) شعاع کی تمام ہی تحریریں لا جواب ہوتی ہیں، جیسے، جو چلے تو جاں سے گزر گئے، درد دل، قفل، جب کہ عسیرہ اور فائزہ افتخار کی تو ہر تحریر لا جواب ہوتی ہے اور جس کردار نے سب سے زیادہ مرعوب کیا وہ عالم شاہ، امرتیل کا عمر، میں تو اکثر سوچتی ہوں نا جانے یہ لوگ کس جہاں میں بستے ہوں گے۔ یقیناً بہت خوب صورت دنیا ہوگی (خوابوں کی دنیا)۔

بہت سے ایسے کردار ہیں جن سے انپائریشن ملی، آگے بڑھنے کا حوصلہ، سبق، لیکن ان تحریروں اور کرداروں سے ملی۔

مجھے امرتیل کے عمر اور اپنے خیالات ملتے جلتے لگے۔ لیو ہوں نا، اس لیے جی ایسا کوئی کردار تو ذہن میں نہیں البتہ مریم (کزن) کو میری مماثلت خصوصیات میں نظر آتی ہے۔

(5) سادوں سے کوئی خاص دلچسپی نہیں چونکہ گرج چمک سے بہت ڈر لگتا ہے تو اس لیے زیادہ تر برسات انجوائے ہی نہیں کر پاتی۔

(6) یوں تو شعر و شاعری سے کوئی خاص شغف نہیں، ہاں بھی بکھار کوئی نظم یا غزل نظر سے گزر جائے تو یاد آ رہی جاتی ہے، ان میں سے ایک شعر آپ کی نذر۔

وہ عشق نماز سکھا مجھ کو یارب
جس نماز میں صرف تو ملے مجھ کو

(آمین)

پسندیدہ کتاب، ناول دیکھا جائے تو، شہر دل کے دروازے، جو چلے تو جاں سے گزر گئے، میں عبد القادر ہوں، وغیرہ وغیرہ۔



فوجی سلیوٹ

فوجی سلام یا ”سلیوٹ“ کی تاریخ سولہویں صدی عیسوی تک جاتی ہے۔ 1588ء میں جس وقت انگریزوں کو ہسپانیہ کے بحری بیڑے ”ار ماوا“ پر فتح حاصل ہوئی۔ تو انگریزی بحری بیڑے کے کپتان ”ڈریک“ نے فتح کا جشن منانے کا اعلان کیا۔ اس عظیم جشن کے موقع پر ”ڈریک“ نے ملکہ الیزبتھ سے درخواست کی کہ وہ بہ نفس نفیس تشریف لا کر فوجیوں کو تمغرات عطا فرمائیں۔ ملکہ کے جاہ و جلال اور عظمت میں اضافہ کرنے کے لیے ”ڈریک“ نے ایک عجیب و غریب حکم نامہ جاری کیا جو کہ یوں تھا۔

”ہماری ملکہ کے ہوش ربا اور آنکھوں کو خیرہ کر دینے والے حسن کے پیش نظر تمغرات کے لیے تاحزد کیے جانے والے ہر فوجی کو حکم دیا جاتا ہے کہ وہ تمغہ وصول کرتے وقت اپنا دایاں ہاتھ آنکھوں پر رکھ کر اپنی آنکھوں کی حفاظت کرے۔“

یہی طریقہ بدلتے بدلتے موجودہ سلام یا سلیوٹ کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ دنیا کی تمام دوسری فوجوں نے یہ سلام انگریزی فوجوں سے مستعار لیا ہے۔

(ایس نو بہار شمع..... اسکر دو بلتستان)

سلطان نور الدین زنگی

سلطان نور الدین زنگی بیت المال سے معاوضہ لیتے تھے لیکن اس قلیل رقم سے گھریلو اخراجات بڑی سہولت سے پورے ہوتے تھے۔ البتہ نے اضافے کی درخواست کی تو سلطان نے فرمایا۔

”اگر تم بھتی ہو کہ بیت المال میرا ذاتی خزانہ

ہے تو یہ غلط ہے۔ میں تو صرف خزانچی کے طور پر اس کا محافظ ہوں۔ دوزخ کا ایندھن بننے کے لیے میں اس میں خیانت نہیں کر سکتا۔ اسی قلیل مشاہیرے پر قناعت کرو اور ساوکی اختیار کرتے ہوئے گزراوقات کرو۔“ (فرحانہ سلیم..... میاں چنوں)

اخلاق کی قوت

جن دنوں سلطان صلاح الدین ایوبی صلیبیوں کے خلاف لڑ رہا تھا۔ ایک چور رات کو ایک صلیبی خیمے میں جا گھسا اور ایک ماں سے اس کا شیر خوار بچہ چھین کر غائب ہو گیا۔ ماں روتی بیٹھی رچڑھ کے پاس گئی۔ اس نے کہا۔

”میں بے بس ہوں۔ تم صلاح الدین کے پاس جاؤ۔“

چنانچہ وہ اسلامی خیموں سے گزر کر صلاح الدین کے ہاں پہنچی۔ ایوبی نے اسے عزت سے بٹھایا۔ توجہ سے بات سنی اور تیز رفتار سواروں سے کہا کہ جاؤ اور چور کو تلاش کرو۔ وہ سوار سب سے پہلے بازار میں گئے، انہیں معلوم ہوا کہ فلاں آدمی نے کسی نادانف سے ایک بچہ خریدا ہے۔ یہ اس بچے کو لے کر واپس ایوبی کے پاس پہنچے۔

ماں دیکھتے ہی بچے کی طرف لپکی اور چمٹ گئی۔ صلاح الدین ایوبی نے خریدار کو دنگی رقم دے کر بچہ خرید لیا اور اس خاتون کو کھڑے پر سوار کرا کے بحفاظت اس کے خیمے میں پہنچا دیا۔

جب یہ کہانی رچڑھ تک پہنچی تو اس نے کہا۔ ”جن لوگوں کے پاس اخلاق کی یہ قوت موجود ہو، ان سے لڑنا خود کشی کے مترادف ہے۔“

(حمیرا خان چٹانی..... ملتان)

بے ہنگام

ایک بار مغل فرماں روا اورنگ زیب مہج جلدی اٹھنا چاہتا تھا۔ اس نے اپنی بیٹی شہزادی زیب النساء کی ایک خواص کو حکم دیا کہ ہمیں فجر سے پہلے جگادیا جائے۔ خواص رات بھر جاگتی رہی۔ مبادا اس کی آنکھ لگ جائے اور وہ بادشاہ کو بروقت نہ جگا سکے۔ اتفاقاً اس رات ایک مرغ نے قبل از وقت بانگ دے دی خواص نے گھبرا کر بادشاہ کو جگادیا۔ رات ابھی کافی باقی تھی۔ اورنگ زیب کو خواص کی یہ غفلت بہت ناگوار گزری۔ اس نے غصے میں کہا۔

”سربریدن لازم است۔“ (سرکاشا لازم ہے)۔ خواص تحریر کا پتہ لگی اور سیدھی شہزادی کی خواب گاہ میں پہنچی۔ اس نے آہستہ سے پاؤں دبا کر شہزادی کو بے دار کیا اور یہ واقعہ سنایا۔ شہزادی کو کینیز پر بہت رحم آیا۔ اس نے کسی دلی اور مہج کے انتظار کا حکم دیا۔ صبح ہوئی تو شہزادی کینیز کو اپنے ہمراہ لے کر بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ اس نے بادشاہ سے دریافت کیا کہ کینیز کے حق میں کیا حکم ہے، جواب ملا۔

”سربریدن لازم است۔“ شہزادی نے برجستہ کہا۔ سربریدن لازم است، آن مرغ بے ہنگام را این پری چہرہ چہ داند وقت صبح و شام را (سرکاشا لازم ہے، اس مرغ کا جس نے بے موقع اذان دی۔ اس میں اس خوب صورت لڑکی کا کیا قصور ہے کہ بے وقت صبح شام ہوگی)۔ بادشاہ نے یہ جواب سن کر کینیز کا قصور معاف کر دیا۔

بہ نفس

ایک ایرانی قبیلے کے سردار نصیر الدین سے ملک کا بادشاہ سلطان تمش ناراض ہو گیا اور اس نے حکم جاری کیا کہ سردار کا سر کاٹ کر حاضر کیا جائے۔ بادشاہ

کے سپاہی حکم کی تعمیل کے لیے سردار کے پاس پہنچے سردار نے سپاہیوں کو کسی نہ کسی طرح اس امر پر راضی کر لیا کہ وہ اسے بادشاہ کی خدمت میں زندہ لے جائیں۔ چنانچہ اسے بادشاہ کے سامنے زندہ لے جایا گیا۔ بادشاہ بھڑک اٹھا۔ اس نے حکم عدولی کے جرم میں سپاہیوں کو قتل کرنے کا فیصلہ کیا۔ سردار نصیر الدین تمش نے موقع کی نزاکت بھانپ کر ایک برجستہ شعر پڑھا۔

سرخواستہ بدست کس نتوان داد
سے ایم ویر گردن خود سے آرم
آپ نے سر طلب کیا تھا، میں کسی کے ہاتھ کیوں بھیجتا خود اپنی گردن پر لیے حاضر ہوں۔
بادشاہ بھڑک گیا۔ اس نے سردار کی نصیحت معاف کر دی اور اسے انعام سے نوازا۔

قدرت کے کھیل

عباسی خلیفہ مقتدر اپنے وزیر حسین بن قاسم سے کسی قصص کے باعث ناراض ہو گیا اور اسے معزول کرنے کے بعد ابن مقلہ کو وزیر بنادیا۔ ابن مقلہ کو خوف ہوا کہ بادشاہ حسین بن قاسم سے دوبارہ راضی ہو کر کہیں اسے پھر سے وزیر نہ بنادے، یوں ابن مقلہ کی حیثیت ثانوی ہو سکتی ہے۔ اس لیے اس نے حسین بن قاسم کو قتل کر کے اس کا سر عجائب گھر میں دکھوایا۔ مقتدر کے بعد جب ”راضی“ خلیفہ ہوا تو اس نے کسی بات پر ناراض ہو کر ابن مقلہ کو قید کر ڈالا اور اس کے ہاتھ چمی کنوا دیے۔ اس کے بعد عباسیوں کے عجائب گھر میں حسین بن قاسم کے سر کے ساتھ ابن مقلہ کے کٹے ہوئے ہاتھ بھی نظر آنے لگے۔ جن کے ساتھ لکھا ہوا تھا۔

”یہ وہ ہاتھ ہیں جنہوں نے اس سر کو قلم کیا۔“ (ثمینہ انجم ہاشمی)

نشان عظمت

دو نوکر، ایک کس لڑکا۔ عمر بیک کوئی میاں بارہ

ہیں، ایک باغ میں دوڑ رہے تھے۔ ان کے آگے آگے ایک شیر کا بچہ تھا۔ لڑکا نوکروں سے چھو قدم پیچھے تھا۔ آگے جا کر نوکر نے شیر کے بچے کو گھیر لیا۔ جوں ہی ایک نوکر اس کے گلے کی زنجیر پکڑنے کے لیے جھکا، اس نے غرا کر اپنے دونوں اگلے پنجے اٹھادیے۔ نوکر گھبرا کر پیچھے ہٹ گیا۔ اس کا ساتھی ڈر کے مارے پہلے ہی ایک طرف ہو گیا تھا۔ کم سن لڑکا ہنستا ہوا آگے بڑھا اور اس نے اطمینان سے شیر کے بچے کے جسم پر ہاتھ پھرنے کے بعد اس کی زنجیر پکڑ لی اور اسے نوکر کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

”لو۔ اب اسے لے جاؤ۔“
نوکر جواب تک ڈر ہوا تھا، بولا۔ ”حضور! یہ کاشا ہے۔“

”تم خواہ تھوڑے تھوڑے ہو، یہ دیکھو۔“ لڑکے نے یہ کہتے ہوئے اپنا ہاتھ شیر کے بچے کے منہ کے سامنے کر دیا۔ شیر کا بچہ لڑکے کے ہاتھ چاٹنے کے بعد اس کے پاؤں پر لیٹ گیا۔

بچپن سے ہی شجاعت کے ایسے کھیل کھیلنے والا یہ بہادر بچہ کون تھا۔ یہ بچہ فتح علی شاہ سلطان تھا۔ جس نے بڑے ہو کر بھی بڑی بہادری کے ساتھ انگریزوں کے خلاف آزادی کی جنگ لڑی اور میدان جنگ میں داد شجاعت دیتے ہوئے جام شہادت نوش کیا۔ وہ اکثر کہا کرتا تھا۔

”شیر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کی سو سالہ زندگی سے بہتر ہے۔“

محمد علی جناح

قائد اعظم محمد علی جناح کا مقام پیدائش عام طور پر تو کراچی بتایا جاتا ہے لیکن حیدر آباد یونیورسٹی کے ساتھ ملحق اسٹیٹ یوٹ آف سائنسز کے محققین کا فیصلہ ہے کہ آپ کی پیدائش ٹھٹھہ کے قریب جھڑک کے مقام پر ہوئی۔ عام طور پر مشہور ہے کہ آپ اسماعیلی خوجے

تھے لیکن مجھے اس بارے میں ایک عجیب اقتباس ملا ہے 1964ء میں ماہنامہ نقوش نے بارہ صفحات پر مشتمل شخصیات نمبر شائع کیا تھا۔ جس میں مشاہیر کی زندگی کے حالات، ان کی اپنی تحریریں سے یا اپنے اقوال کے حوالے سے بڑی خوب صورتی سے جمع کیے گئے تھے۔

محمد علی جناح کے بقول آپ اصل میں ٹٹھری کے علاقے کے ایک راجپوت خاندان کی نسل سے ہیں۔

قائد اعظم سے جب نواب صاحب باغ پت نے کہا کہ آپ کا خاندان تو تجارت پیشہ ہے پھر آپ میں یہ گھن گرج کیسے آئی تو آپ نے کہا۔

”میں اصل میں پنجابی راجپوت ہوں۔ کئی پشتیں گزریں کہ میرے اجداد میں سے ایک صاحب جو ٹٹھری (موجودہ ساہیوال کے رہنے والے تھے) کا ٹھہرا واڑ چلے گئے تھے۔ وہاں انہوں نے ایک خوجہ لڑکی سے شادی کر لی تھی اور ان ہی کے خاندان میں مل گئے تھے۔ اس وقت سے ہم لوگ خوجوں میں شمار ہونے لگے لہذا میں اسماعیلی خوجہ نہیں ہوں بلکہ میری رگوں میں جو خون ہے وہ راجپوت کا ہے۔“
اس قول کے راوی صغیر احمد عباسی پرائیویٹ سیکریٹری آف نواب صاحب چغتاری ہیں۔

(ڈاکٹر اسرار احمد)
(علامہ اقبال، قائد اعظم اور نظریہ پاکستان)

شہنشاہ محمد سلیم نور الدین جہانگیر

سلطنت مغلہ کا چوتھا فرماں روا شہزادہ سلیم تھا۔ وہ شہنشاہ جلال الدین محمد اکبر کا سب سے بڑا بیٹا تھا۔ جو 1559ء میں پیدا ہوا تھا۔ شیخ سلیم چشتی سے عقیدت کے باعث اکبر بادشاہ نے اس کا نام محمد سلیم رکھا تھا اور اسے پیار سے شیخو بابا کہتا تھا۔ چنانچہ شیخوپورہ اس کے نام سے موسوم ہے۔

میرے شوہر تو جب بھی پاکستان گئے عوام نے ہماری بہت پذیرائی کی اور ہمیں عزت و احترام سے دیکھا (ہمارے عوام ہیں ہی اتنے امن و محبت والے۔ لیکن اپنے ملک کے لیے کیا بہتر ہے کیا نہیں یہ ہم اور ہمارے ادارے بہتر جانتے ہیں۔)

تجربہ

شمن انصاری نے صرف چار سال کے عرصے میں ٹی وی انڈسٹری میں اپنا نام بنالیا ہے وہ ٹی وی ڈراموں میں مختلف کردار بہت خوبی سے نبھاتی نظر آتی ہیں۔ جب شمن انصاری سے پوچھا گیا کہ کیا انہوں نے اداکاری کی باقاعدہ تربیت حاصل کی ہے تو انہوں نے کہا کہ ہرگز نہیں وہ حادثاتی طور پر اداکارہ بنی ہیں۔ (حادثاتی طور پر.....؟) ان کا کہنا ہے کہ اس پر کام کرنا ان کے لیے بہت ہی زبردست اور بالکل مختلف تجربہ ہے۔ آڈیشن کے سامنے کام کرتے



بد نصیبی

پریم کورٹ آف پاکستان نے بھارتی پروگراموں پر پابندی لگا دی ہے کہ ان پروگراموں سے ملتی ثقافت کو نقصان پہنچ رہا ہے جس کی کسی کو اجازت نہیں دی جائے گی۔ معروف شاعر جاوید اختر اور ان کی بیگم اداکارہ شبنم اظہار کی اس پابندی کے متعلق کہتا ہے کہ فن کی راہ میں رکاوٹیں نہیں گھسی کرنا چاہئیں۔ (شبنم! کیا بھارت میں پاکستانی پروگرام دیکھنے کی اجازت ہے؟) پابندی کا فیصلہ بد نصیبی ہے۔ یہ فیصلہ بیوروکریٹس اور سیاست دانوں کا تو ہو سکتا ہے عام پاکستانی کا نہیں (شبنم! آپ پاکستان کے بارے میں کیسے یہ فیصلہ صادر کر سکتی ہیں؟)

فن کار تو لوگوں کو آپس میں جوڑتے ہیں۔ ہمارے ملک کے بھی کچھ سیاست دانوں کی خواہش ہے کہ فن اور فنکاروں پر پابندی لگے۔ (آپ کے تو عوام بھی.....؟) انہوں نے مزید کہا کہ میں اور

بادشاہ کے قریب لا رہا تھا اور بادشاہ اس کی پھرتی پر اس اش کر رہا تھا۔

وہ ایک تیز رفتار ہرنی کے پیچھے لگا ہوا تھا کہ ہرنی پہاڑ پر چڑھتی۔ نو جوان ہنکارا بھی چٹانوں کو عبور کرتا ہوا اس کے پیچھے جا رہا تھا کہ اچانک ایک چٹان سے اس کا پاؤں پھسلا، اس نے ایک جھاڑی کا سہارا لینے کی کوشش کی، لیکن جھاڑی جڑ سے اکڑ گئی اور وہ نو جوان لڑکا پتھریلی چٹانوں سے ٹکراتا، قلابازیاں کھاتا زمین پر بادشاہ کے قریب آ رہا۔ اس کی ہڈیاں بالکل پچڑ پچڑ ہو چکی تھیں۔ وہ بادشاہ کے سامنے خوب خوب کر مر گیا۔ بادشاہ نے فوراً شکار موقوف کیا اور اپنی قیام گاہ میں آ گیا۔

جہانگیر پہلے ہی دسے کا مریض تھا۔ ایک نو جوان و فادار ہنکارے کی اچانک موت نے اس کی صحت پر منفی اثرات ڈالے۔ اس کی خواہش کے مطابق لاہور کی طرف سفر تیزی سے شروع کیا گیا۔ لیکن ابھی رجواری ہی میں مقیم تھے کہ 28 صفر 1037ھ بمطابق 1627ء بروز جمعہ المبارک بوقت چاشت بادشاہ جہانگیر اس عالم فانی سے رخصت ہو گیا۔ مرتے مرتے یہ وصیت کر گیا تھا کہ اسے نور جہاں کے بتوائے ہوئے باغ و گلشاں واقع شاہدرہ لاہور میں دفن کیا جائے، چنانچہ ملکہ نور جہاں اپنے محبوب شوہر کی میت کو لے کر لاہور کی طرف عازم سفر ہوئی۔ جب وہ گجرات شہر کے قریب پہنچے تو موسم گرما کی شدت کے باعث بادشاہ کا جسم چلنے سڑنے لگا تو باہم مشورے سے بادشاہ کی آستین اور

معدہ نکال کر گجرات شہر کے نواح میں دفن کی گئیں۔ آج بھی وہاں جلال پور جٹاں روڈ پر ایک بوسیدہ سا مزار اس قبر کی نشاندہی کرتا ہے، جہاں اہل علاقہ ہر سال ”شاہ جہانگیر“ کا میلہ مناتے ہیں۔



وقت گزرنے کے ساتھ شہزادہ سلیم جسانی طور پر مضبوط ہوا۔ بلکہ ایک عالم فاضل آدمی بن گیا تھا۔ وہ شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ علم تاریخ، علم سوانح نگاری، علم جغرافیہ اور علم حیاتیات میں بہت دسترس رکھتا تھا۔

سلیم 1605ء میں تخت نشین ہوا اور اس نے نور الدین جہانگیر کا لقب اختیار کیا۔ اس کے پُر امن اور ترقی یافتہ دور کی وجہ شہزادہ خرم کی شاندار روزِ محنت تھی۔ جہانگیر نے جو بڑے بڑے کارنامے بطور حکمران سرانجام دیے۔ ان کے علاوہ ترک جہانگیری بھی اس کی تصنیف ہے، جن کی وجہ سے وہ مشعل بادشاہوں میں ممتاز مقام رکھتا ہے۔

شہنشاہ جہانگیر تقریباً بائیس برس تک برسرِ اقتدار رہا۔ اس کے اقتدار کے آخری سال میں سپہ سالار مہابت خان (زمان بیگ) نے بادشاہ جہانگیر اور ملکہ نور جہاں کو یہ خیال بنالیا اور اپنے وطن کا مل کی طرف چلا گیا۔ آخر کار سلیطہ مند ملکہ نور جہاں کی تدبیر کام آئی اور جہانگیر اس جنگل سے آزاد ہوا۔ کچھ عرصے نوشی سے جہانگیر کی صحت روز بروز گری ہوئی۔ مہابت کی حراست میں رہ کر اس کی صحت پر مزید بڑے اثرات پڑے۔ چنانچہ 1627ء میں رہائی کے بعد شہنشاہ جہانگیر بحالی صحت کی خاطر کشمیر چلا گیا۔ وہاں اس دفعہ طبیعت سبھل نہ کی۔ اسی دوران پتا چلا کہ شہزادہ شہر یار (ملکہ نور جہاں کا داماد و جولاہور میں مقیم تھا) بال جھڑنے کی بیماری میں مبتلا ہو گیا ہے۔

لہذا بادشاہ سلامت نے لاہور کا قصد کیا۔ بادشاہ جہانگیر، عالم شہزادگی سے شکار کا شوقین تھا۔ کشمیر سے واپسی پر دل بہلانے کے لیے اس نے ایک دن شکار کا ارادہ ظاہر کیا۔ چنانچہ رجواری کے قریب بیرم کلہ میں شکار کا بندوبست کیا گیا۔ حسب معمول بہت سے ہنکارے جنگلی ہرنوں کو گھیرنے میں مصروف تھے۔ ان میں ایک نو جوان خور و لڑکا بھی شامل تھا۔ وہ بڑی پھرتی سے ہرنوں کو گھیر گھیر کر



میں نے کی ہے اس کی وجہ سے فلم کو کامیاب تو ہونا ہی تھا۔
(اسے غلط بھی کہتے ہیں یا خوش بھی.....؟)
اپنی نئی فلم کے متعلق مایا علی کا کہنا ہے کہ انہیں فلم
سائن کر تے وقت بتایا گیا تھا کہ اس فلم کی ہیر وکن ماہرہ
خان جیسے مگر اپنی مصروفیات کے باعث اب وہ ہیر وکن
نہیں ہیں۔ میں نے اس حوالے سے زیادہ سوالات
بھی نہیں کیے۔ (کیا کر سکتی تھیں.....؟) بس اپنا
اسکرپٹ بڑھا اور اپنے کام پر توجہ دینا شروع کر دی
ہے۔ مجھے فلموں میں کامیابی اور انکسشن کا تجربہ ہے۔
(تجربہ!) اب میں کچھ نیا کرنے جا رہی ہوں۔
(نیا.....؟)

لیکن مایا! ماہرہ خان نے فلم چھوڑی نہیں ہے فلم
کی ہیر وکن ماہرہ خان ہی ہیں اور جلد ہی ان کا کام بھی
عکس بند کیا جائے گا۔

مایا فلموں پر ہونے والی تنقید کو زیادہ اہمیت نہیں
دیتیں وہ جانتی ہیں کہ ان کا ردوں کو کسی بھی تنقید سے گھبراتا
اور دلبرہ داشتہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ فن کار فلم یا
ٹی وی کا نہیں ہوتا بلکہ فن کار صرف فن کار ہوتا ہے۔
اس کی صلاحیتوں سے کہیں بھی کام لیا جاسکتا ہے۔

کچھ ادھر ادھر سے

☆ مفروضوں اور حکمت عملیوں سے ضروری
نہیں آپ کی مرضی کے نتائج حاصل ہوں، سیاست
اور جنگ دونوں میں کسی ایک فریق کی حکمت عملی فیصلہ
نہیں کرتی دوسرے فریق کا رد عمل جنگ اور سیاست کا
فیصلہ کرتا ہے، اسی لیے ہمارے کرم فرماؤں کو اب
مفروضوں سے نکل کر حقائق کی دنیا میں آنا ہوگا۔ منی
کے مادھو بنانے سے سیاست نہیں چلتی، اس کے لیے
اصلی نام اور اصلی کام والوں کو سامنے لانا ہوگا جنگ اور
سیاست میں جہلی بہر وہیں چلتے بلکہ ان کی اصلیت کھل
جاتی ہے۔ سیاست کی ڈوریاں کھینچیں، اسے آزاد
چلنے دیں۔ پاکستان خود بخود ٹھیک ہو جائے گا۔
(سنبھل وڑائچ۔ فیض عام)

کبھی مداخلت نہیں کرنا چاہیے۔ لکھنے اور بنانے پر کوئی
حد بندی نہیں ہونی چاہیے (حد بندی نہ ہوتو ہمارے
یہاں فلم ٹی وی، انڈسٹری کے لوگ بالی وڈ اور بالی وڈ کو
بھی پیچھے چھوڑ دیں عریانیات میں ہمارے ابواب ڈشو
اس کی جتنی جاگتی تصویر ہیں۔) انہوں نے مزید کہا
کہ آج کل کیا فنکار ننگے نظر آرہے ہیں ٹی وی پر،
ڈرامے میں بھی لوگ وہی لباس پہنتے ہیں جو عام
زندگی میں پہنے جاتے ہیں (جی ہاں سٹیو لیس کے بعد
وہ پہن بھی لیس ہی ہو گیا ہے ٹی وی پر؟)

فخر

چارویٹ لفظ بہنوں نے حکومت پاکستان سے
درخواست کی کہ وہ پاکستان میں خواتین کے
پاور لفٹنگ کے کھیل کو زیادہ سے زیادہ اہمیت دے۔
لاہور کے ایک ہی گھر سے تعلق رکھنے والی یہ چارویٹ
لڑکیاں ویٹ لفٹنگ میں پاکستان کا فخر بن گئیں۔ ویٹ
لفٹنگ جیسے مشکل کھیل میں اپنی پہچان بنانا آسان نہیں تھا
تاہم انہوں نے ہمت نہ ہاری اور یہ کر دکھایا۔

ٹوئنکل، ویرڈیکا، مریم اور سنبھل ایشین چیمپین
سمیت بین الاقوامی سطح پر کی مقابلے جیت چکی ہیں
اور اب ایشین اور کاسن ویٹلجہ گیمز میں شرکت کی
تیا ریاں بھی جاری ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ہمارے دادا
اور چچا ہمارے والد سے کہتے تھے کہ یہ تم نے لڑکیوں کو
کس کام پر لگا دیا۔ اب ہم جب اس مقام پر پہنچ گئے تو
اب سب ہم پر فخر کرتے ہیں۔

ان کا مزید کہنا تھا کہ اگر ہمیں باہر کوئی ایونٹ ویٹ
لفٹنگ کا کھیلنا ہے تو اس کے لیے تمنا سے چار سال
پاکستان میں کھیل کر ایونٹس جیت کر پیسے جمع کرنا پڑیں
گے۔ اس لیے ہم چاہتے ہیں کہ حکومت ہمیں سپورٹ
کرے۔ (کاش آپ کی آواز حکومت وقت سن سکے۔)

تنقید
مایا علی اپنی فلم کی کامیابی کی وجہ سے اپنی عمر اور تجربے
سے زیادہ بڑی باتیں کرنے لگی ہیں۔ اپنی فلم کے متعلق کہتی
ہیں کہ مجھے اس کی تیاری کے دوران ہی پتا تھا کہ جتنی محنت

ہوئے فنکار کو فوری رد عمل مل جاتا ہے۔ شمن انصاری
جیسی مرتبہ اسٹیج پر کام کر کے اتنی پرجوش تھیں کہ ان کا
بس چلے تو وہ صرف اسٹیج پر ہی کام کریں۔ (خیال
رہے شمن! اسٹیج ڈرامے یہاں بہت کم ہوتے ہیں۔
کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ کم ہو جائیں۔) ٹی وی سے
متعلق شمن انصاری کا خیال ہے کہ نئے پروڈیوسر اور
ڈائریکٹر مرکزی کردار زیادہ تر خوب صورت اور
اداؤں سے بھرپور لڑکیوں کو دے دیتے ہیں وہ یہ نہیں
دیکھتے کہ وہ لڑکی اس کردار کی پارکینوں کو سمجھ بھی پائے
گی یا نہیں..... کردار کو نبھانے کی یا نہیں۔

نوٹس

میر نے حال ہی میں انٹرنیٹ چینل کو نوٹس
جاری کیا ہے کہ وہ اپنے ڈراموں میں متنازع اور غیر
اخلاقی موضوعات اور عورت کو نفی انداز میں دکھانا بند
کردیں پنمر نے کہا کہ ایسے ڈرامے بنائے جائیں
جو پاکستانی معاشرے کی عکاسی کریں اور اسلامی اور
معاشرتی اصولوں سے ہم آہنگ ہوں۔
پنمر کے اس نوٹس کے متعلق بات کرتے
ہوئے فطیل الرحمن قر نے کہا کہ ”فلم کار کے کام میں



موس کے پکوان

خالہ جیلانی

بہاری چکن تکہ

ضروری اشیاء:-

چکن	آدھا کلو
تیل	حسب ضرورت
دہی	آدھا کپ
ہری مرچیں پسلی ہوئی	ایک کھانے کا چمچ
لال مرچ پسلی ہوئی	ایک کھانے کا چمچ
نمک	حسب ذائقہ
لہسن اور کپ	ایک کھانے کا چمچ
پیاز پسلی ہوئی	ایک کھانے کا چمچ
گرم مسالا پیسا ہوا	آدھا کھانے کا چمچ
زیرہ پیسا ہوا	آدھا چائے کا چمچ
چکن کو دھو کر کچن پیچر سے خشک کر لیں۔ دہی	
میں ہری مرچوں کا پیسٹ، لال مرچ، نمک، لہسن،	
اورک، پیاز، گرم مسالا اور زیرہ ڈال کر کس کر کے	
میرینیشن تیار کر لیں۔	
چکن میں تیار کی ہوئی میرینیشن لگا کر اسے دو تین	
گھنٹے تک فریج میں میرینٹ ہونے کے لیے رکھ دیں۔	
میرینٹ کی ہوئی چکن کو تیل میں لگا کر سینک لیں یا	
اودن میں بیک کر کے تازہ ملاو کے ساتھ پیش کریں۔	

انڈوں کا قورمہ

ضروری اشیاء:-

انڈے	آٹھ عدد
(اگلے ہوئے درمیان سے کٹے ہوئے)	
ہلدی	ایک چائے کا چمچ
دہی	ایک کپ
نمک	حسب ذائقہ

لیموں کا رس
لال مرچ پسلی ہوئی
کڑی پتہ
تیل
خشخاش

دو کھانے کے چمچ
ایک چائے کا چمچ
تین سے چار عدد
ایک چائے کا چمچ
دو چائے کے چمچ
دو کھانے کے چمچ

بادام
(تیل، خشخاش، بادام کو باریک ٹپس لیں)
تیل
کڑا ہی میں تیل کو گرم کریں اور اس میں دہی،
لال مرچ، تیل، خشخاش، بادام، نمک، کڑی پتہ ڈال کر
اس کو ہلکی آگ پر پکائیں یہاں تک کہ سالن گاڑھا
ہو جائے اس میں اگلے ہوئے انڈے ڈال دیں۔ کچھ
دیر دم پر رکھیں پھر اس کے اوپر لیموں کا رس ڈال کر
اتار لیں۔ یہ ڈش چادروں کے ساتھ مزادے کی۔

برنس روڈ چکن کڑا ہی

ضروری اشیاء:-

مرغی کا گوشت	ایک کلو
ٹماٹو پیسٹ	ایک کپ
سفید زیرہ	ایک چائے کا چمچ
لال مرچ پسلی ہوئی	دو کھانے کے چمچ
ہلدی	چوتھائی چائے کا چمچ
لہسن اور کپ	ایک کھانے کا چمچ
ہری مرچیں	(چوب کیا ہوا)
ہرا دھنیا (چوب کر لیں)	آٹھ سے دس عدد
دہی	(چوب کر لیں)
نمک	ایک کپ
تیل	حسب ذائقہ

سائس بین میں تیل گرم کر کے ٹماٹو پیسٹ اور دہی
ڈال دیں۔ تھوڑا بیچون کر گوشت شامل کر دیں۔ تین چار
منٹ تک پکائیں۔ لال مرچ، ہلدی، لہسن، اورک، ہری
مرچیں، سفید زیرہ اور نمک ڈال کر بھون لیں۔ پانی شامل

کر کے گوشت کو گھالیں۔ حسب پسند گرم کر رکھ کر ہرا دھنیا
شامل کر دیں۔ سرد نگ پیسٹ میں نکال کر پیش کریں۔

چائینیز چرغہ پلاؤ

ضروری اشیاء:-

ثابت مرغی
(خوب اچھی طرح صاف کر کے گہرے کٹ لگو لیں)
ایک عدد
چاول
ایک کلو
(نمک ڈال کر بال لیں)

چائینیز نمک
لہسن اور کپ
لوگ (پسلی لیں)
دار چینی (پسلی لیں)
سونف (پسلی لیں)
اجوائن (پسلی لیں)
نمک
شملہ مرچیں
(چنگ نکال کر لمبے سلاکس کاٹ لیں)
گاجر
(لمبے سلاکس کاٹ لیں)
ہری پیاز

دو چائے کے چمچ
دو کھانے کے چمچ
چار عدد
دو چھوٹے ٹکڑے
ایک کھانے کا چمچ
آدھا چائے کا چمچ
حسب ذائقہ
دو عدد
دو عدد
گاجر
ہری پیاز

دوسرے شازسوس
سفید سرکہ
چلی سوس
سیاہ مرچ پسلی ہوئی
سفید مرچ پسلی ہوئی
تیل
دعفران یا زرد رنگ
مرغی میں، دوسرے شازسوس، سفید مرچ، لہسن
اورک، نمک اور چلی سوس، ہویا سوس، چائینیز نمک،
سیاہ مرچ اور سرکہ کی آدھی مقدار ڈال کر میرینٹ
ہونے کے لیے رکھ دیں۔
کڑا ہی میں تیل گرم کریں، اس میں میرینٹ کی

ہوئی مرغی ڈال کر درمیانی آگ پر فرانی کر کے نکال لیں۔
پتلی میں تیل ڈال کر گرم کر کے اس میں شملہ
مرچیں، گاجر اور ہری پیاز ڈال کر سائے فرانی کریں اور
بقیہ سویا سوس، چائینیز نمک، سیاہ مرچ، سفید مرچ ڈال
دیں، نمک ڈالیں اور چاول ڈال کر اتنا پانی ڈالیں کہ
چاول کھڑے کھڑے رہیں۔ اوپر فرانی کی ہوئی ثابت
مرغی رکھ دیں، جب چاول تھوڑے کھلے باقی رہیں،
تب دعفرانی رنگ ڈال دیں اور سیاہ مرچ چھڑک کر
دم دے دیں، مزے دار چائینیز چرغہ پلاؤ تیار ہے۔

سیخ کباب برگ

ضروری اشیاء:-

ایک ماؤ
سیخ کباب مسالا
ہری مرچیں
ہرا دھنیا
ماپونیز
گاجر (کدو کش کی ہوئی)
نمک
سیاہ مرچ
برگرین
تیل
لہسن اور کپ
چوپر میں قیہ، سیخ کباب مسالا، نمک، لہسن
اورک، ہری مرچیں اور ہرا دھنیا ڈال کر اچھی طرح
باریک ٹپس لیں۔
قے کو فریج میں میرینٹ ہونے کے لیے رکھ دیں۔
اس کے بعد اس قے کو سیخ کباب کی شکل دے کر فرانی بین
میں تیل گرم کر کے فرانی کر لیں اور ٹھوپیہ پر نکال لیں۔
ایک باؤل میں ماپونیز، نمک، چنگی بھر سیاہ مرچ
اور کدو کش گاجر ڈال کر اچھی مکس کر لیں۔ اس کے بعد
برگر پر ماپونیز لگا لیں اور سیخ کباب رکھ دیں اور دوسرا
حصہ اس پر رکھ کر چلی گارلک سوس یا سن پسند چٹنی کے
ساتھ گرم گرم پیش کریں۔

FaceFresh

GIVE YOU SKIN Cleansing TREATMENT

داغ دھبے اور چھائیوں کا
مکمل خاتمہ

REAL
BEAUTY
REAL
SHINE

FaceFresh
CLEANSER CREAM

FaceFresh
CLEANSER CREAM
5
REMOVES FRY CALS &
ACNE MARKS, DARK SPOTS
WITH A & B CARE COMPLEX
FreeKie's Treatment
Night Cream

facefresh1

face.fresh

www.facefresh.com



سائیکل چلانے کے انداز میں لائیں۔ بائیں ٹانگ کو
موڑیں اور بائیں گھٹنے کو دائیں کہنی، پھر دائیں
کے گھٹنے کو بائیں کہنی سے ملائیں۔ ہاتھ اس طرح
گردن کی پشت پر رکھیں اور رولنگ دھبے فرش سے
اوپر رکھیں یہ بھی آٹھ مرتبہ دہرائیں۔

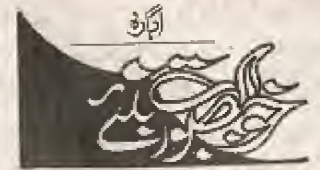
(3) فرش پر آرام دہ حالت میں بیٹھ جائیں۔
اپنے سینے کو دونوں پر جھکائیں ٹانگوں کو سیدھا رکھیں۔
پیروں کو سامنے کی طرف سیدھا کریں۔ دونوں
ہاتھوں سے پیروں کو پکڑیں اور آٹھ تک گنیں پھر
ٹانگوں کو چھوڑ دیں اور آٹھ تک گنیں، یہ ورزش تین
مرتبہ دہرائیں۔ آہستہ آہستہ اپنے سر کو پیر کے پٹیوں
کے پاس لانے کی کوشش کریں۔

(4) زمین پر بیٹھ کر اپنی ٹانگوں کو دونوں اطراف
میں پھیلائیں۔ اپنے دونوں ہاتھوں کو چہرے کے
بالکل سامنے فرش پر ایک دوسرے کے اوپر رکھیں اور
سینے کو ممکنہ حد تک آگے جھکانے کی کوشش کریں اور
سولہ تک گنیں۔

(5) بیٹھی رہیں دونوں ٹانگوں کو ملا کر اپنے
سامنے رکھیں اور دونوں ہاتھوں کو پیچھے پشت کی طرف
ٹکائیں۔ دونوں گھٹنوں کو سینے کی طرف لائیں۔ اس
طرح پیر فرش سے اوپر اٹھ جائیں گے پھر سینے تک
گھٹنے لا کر آٹھ تک گنیں۔

(6) فرش پر لیٹ جائیں اور دونوں ہاتھوں کو
فرش پر بالکل سیدھا رکھیں۔ اپنی دونوں ٹانگوں کو اوپر
اٹھائیں اور سر کی سمت لاتے ہوئے سر کے اوپر سے
گزارتے ہوئے فرش پر لگانے کی کوشش کریں پھر
واپس ٹانگوں کو اپنی سابقہ پوزیشن پر لائیں۔ اسے
آٹھ مرتبہ دہرائیں۔

ان ورزشوں کو باقاعدگی سے کرنے کے بعد آپ
خود اپنی جسمانی ہیپ میں خوبصورت تبدیلی محسوس
کریں گے۔ لیکن ان تمام ورزشوں کو ایک
ساتھ شروع نہ کریں جب عادی ہو جائیں
تو ایک ایک اسٹیپ بڑھاتی جائیں
حاملہ خواتین یہ ورزشیں نہ کریں۔



پچھے ہونٹوں کا علاج

سرسوں کے تیل کے استعمال سے بال صحت مند
اور چمک دار ہو جاتے ہیں خشکی سے بچنے کے لیے
سرسوں کے تیل کا سر میں مساج معمول بنائیں۔ یہ سر کی
خارش اور بال گرنے کی شکایت بھی دور کر دے گا۔

سرسوں کا تیل پچھے ہونٹوں کا بھی موثر علاج
ہے۔ پچھے ہونٹ پوری شخصیت کو متاثر کرتے ہیں
ایسے میں ہونٹوں پر ذرا سا سرسوں کا تیل مل لینے سے
ہونٹ نرم ہو جائیں گے۔

رات سونے سے قبل 1 چمچ دی میں سرسوں کے
تیل کا ایک قطرہ کس کر کے ہونٹوں پر لگانے سے صبح
ہونٹ نرم ملیں گے۔

پیٹ اندر کریں

بعض خواتین مونہ پائے کا شکار تو نہیں ہوتیں البتہ
ان کا پیٹ ضرور باہر نکلا ہوا ہوتا ہے۔ جس کے باعث
ان کی جسمانی خوبصورتی، بد صورتی میں بدل جاتی
ہے۔ پیٹ کو اندر رکھنے کے لیے پیٹ کی ورزشیں
کریں۔ ذیل میں چند ورزشیں بتائی جا رہی ہیں۔

(1) فرش پر لیٹ جائیں، اپنے اوپر کی جسم کو
زمین سے اوپر اٹھائیں۔ ہاتھوں کو پیچھے کی جانب
لے جا کر انگلیاں زمین پر ٹکائیں۔ جسم کے اوپر کی
حصے کو زمین سے اوپر کی طرف اٹھائیں۔ اپنی ٹانگوں کو
بھی زمین سے تھوڑا اوپر اٹھائیں اور سانس اندر
کھینچیں۔ اپنے گھٹنوں کو سینے سے قریب کرنے کی
کوشش کریں پھر سانس باہر نکالیں۔ اب ٹانگیں
سیدھی کر لیں اس طرح آٹھ مرتبہ کریں۔

(2) آرام سے لیٹی رہیں۔ ٹانگوں کی پوزیشن کو